تبرکاتِ آزاد

جس میں

مولانا ابوالکلام آزاد کے ۹۷ مکاتیب اور ۸ مقالات شامل ہیں جن کو اپنی اہمیت و نوعیت کے اعتبار سے تبرکات کی حیثیت حاصل ہے۔

غلام رسول مہر

قیمت چھ روپے پچاس نئے پیسے ۶-۵۰

تعداد پانچ سو ۵۰۰

عثمانیہ بکڈپو۔ حیدرآباد۔

تبرکاتِ آزاد

غلام رسول مہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ہوائے منزلِ یار آبِ زندگانی ماست!
صبا! بیار نسیمے زخاکِ شیرازم!

یہ کتاب جو "تبرکاتِ آزاد" کے نام سے خوانندگانِ کرام کی خدمت میں پیش ہو رہی ہے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے ان رشحاتِ قلم پر مشتمل ہے، جنھیں "تبرکات" تسلیم کرنے میں شاید کسی کو بھی تامل نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مباحث کی اہمیت اور مطالب کی گراں مایگی کے باوجود علم و ادب اور دین و سیاست کے یہ نادر جواہر ریزے مختلف گوشوں میں بکھرے پڑے تھے اور ان پر گردِ فراموشی کی اتنی تہیں جم چکی تھیں کہ غالباً کسی کو ان کے وجود کا احساس تک نہ رہا تھا۔

مکاتیب تو بہر حال انہی افراد کی ملکیت ہوتے ہیں، جن کے نام وہ آتے ہیں اور ان کا علم اس وقت تک کسی کو نہیں ہو سکتا جب تک ان کی فراہمی کے لئے سرگرم کوششیں نہ کی جائیں، لیکن یہ مضامین و مقالات کم از کم ایک مرتبہ ضرور چھپ چکے تھے۔ پھر یہ معاملہ کس قدر عجیب ہے کہ شاید ہی کسی کو یاد ہو یہ کب چھپے؟ کہاں چھپے؟ اور ان کی ترتیب و تہذیب کے آرزومند کو کن کن ذخیروں کے دروازوں پر دستک دینی چاہیے؟ "الہلال" و "البلاغ" کے مجلدات تو سیکڑوں اصحاب کے پاس محفوظ ہوں گے اور ان میں جو کچھ شائع ہوتا رہا، اسے یقیناً محفوظ سمجھنا چاہیے، اگرچہ وہ عام اربابِ ذوق کی دسترس سے باہر ہے اور مختلف اصحاب نے چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں جو کچھ شائع کیا وہ ان نوادر کی اشاعت کا کوئی مناسب و شایان طریقہ نہ تھا۔ پیشِ نظر مضامین کا تو اکثر اصحاب کو خیال تک نہ ہو سکتا تھا۔ تاہم اللہ

تعالیٰ کی رحمت سے یہی محفوظ رہے اور آج پہلی مرتبہ تشریح و تحشیہ کے ساتھ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں مکاتیب کے چار مجموعے ہیں جن کی کل تعداد ستانوے ہے۔ ان میں سے متعدد اتنے طویل اور مفصل ہیں کہ انھیں مستقل رسالے سمجھنا چاہیے جو نہایت نفیس، دقیق اور مفید مباحث کے حامل ہیں۔ ایسی چیزیں دوسری جگہ شاید ہی مل سکیں۔ ان میں دینی اور علمی مسائل بھی بیان ہوئے ہیں تعلیمی اور اصلاحی مسائل کے متعلق بھی خاصے اہم نکتے ارشاد فرمائے گئے ہیں، جن کی کوئی مثال نہ محض ہمارے عہد میں بلکہ بیشتر کے اکثر عہدوں میں بھی نہیں ملتی۔ پھر جو کچھ قلم سے نکلا ہے، سراسر جذبات اور بصیرت و موعظت کا ایک نادیدہ مرقع ہے۔ بعض مکاتیب اگرچہ مختصر ہیں مگر ان میں سے بھی کوئی کسی اہم علمی یا اخلاقی نکتے سے خالی نہ ہوگا سب سے آخر میں یہ کہ اسلوبِ نگارش کی ندرت کاری اور شخصیت کی خاص چھاپ کا حسن تو سب میں جلوہ گر ہے۔

ان میں سے بہ لحاظ مطالب صدرِ حد بیش قیمت مجموعہ وہ ہے، جو مولوی محی الدین احمد قصوری نے مرحمت فرمایا۔ ان مکاتیب میں سے زیادہ تر خود مولوی صاحب کے نام اور چند اُن کے والد ماجد کے نام آئے تھے افسوس کہ موصوف کے پاس تمام مکاتیب محفوظ نہ رہ سکے وجہ یہ نہیں کہ ان کی اہمیت کا پورا اندازہ نہ تھا یا حفاظت کا اتنا اہتمام نہ ہوا جتنا ہونا چاہیے تھا نہ کیا جا سکا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مولوی محی الدین احمد کا خاندان انگریزی حکومت کے نزدیک عتاب کا مورد بن گیا تھا، اول اس لئے کہ پورے خاندان کو مولانا کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ دوم اس لئے کہ خاندان کے مختلف افراد خصوصاً مولانا عبدالقادر مرحوم، مولوی محمد علی مرحوم اور مولوی محی الدین احمد آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے، اس لئے بار بار خانہ تلاشی کی نوبت آئی اور ایسے اوقات میں مولانا کی تحریرات کو پولیس کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

مولوی محی الدین احمد سناتے تھے کہ ایک مرتبہ میں نے سورۂ ملک کے متعلق چند سوالات

کیے تھے۔ اس زمانے میں مولانا بمقام رانچی نظربند تھے۔ انھیں نے قلم اٹھایا تو سوالات کے جواب میں سورۂ ملک کی تفسیر مرتب فرمادی جو کم از کم تیس صفحات پر پھیلی ہوئی تھی اور اس میں اس سورہ کے ضروری معارف کا کوئی پہلو بھی تشنہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اس اثنا میں پولیس تلاشی کے لئے آگئی تو اس مکتوب کو اٹھا کر چھت پر پھینک دیا گیا۔ تلاشی کے بعد چھت پر پہنچ کر دیکھا تو ہوا کے جھونکے اوراق کو خدا جانے کس طرف اڑا کر لے جا چکے تھے۔ مولوی محی الدین احمد اس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔

غرض اس طرح متعدد مکاتیب تلف ہوگئے جو شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے بھی ایک ناقص ہے۔ مولوی محی الدین احمد بتاتے ہیں کہ کسی صاحب کو بغرض اشاعت دیا گیا تھا، چھپ نہ سکا اور ان سے واپس لے آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مکتوب کا آخری حصہ غائب ہے۔ ہر چند تلاش کیا، نہ مل سکا۔ میں نے ترتیب میں اس مجموعے کے تمام مکاتیب الگ رکھے ہیں دوسرا مجموعہ ان مکاتیب کا ہے۔ جو مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام تھے اور محترم مولانا صاحب نے انھیں "نیا دور" کی ایک اشاعت خصوصی میں شائع کرا دیا تھا۔ تیسرا مجموعہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور کے نام مکاتیب کا ہے جو سب سے پہلے "معارف" میں شائع ہوئے تھے، لیکن ان میں ترتیب کوئی نہ تھی۔ میں نے ان دونوں مجموعوں کے مکاتیب پر بھی اپنے علم کے مطابق تشریحی حواشی لکھ دیے۔ چوتھا مجموعہ متفرق مکاتیب کا ہے۔ ان میں سے بعض دہلی کے ایک مرقع "میرا عقیدہ" میں شائع ہوئے تھے بعض مختلف رسائل میں چھپے، بعض مجھے ایک دوست کی مہربانی سے میسر آئے۔ ان سب کے متعلق ضروری تفصیلات تمہیدی عبارتوں یا حواشی میں درج ہو چکی ہیں۔ ان مکاتیب کی اشاعت سے مقصود یہ تھا کہ مولانا کی زیادہ سے زیادہ تحریرات یک جا ہو جائیں۔

مضامین و مقالات میں سے صرف ایک یعنی "چترنجن داس" جولائی سنہ ۱۹۲۷ء کے "البلاغ" میں اس موقع پر شائع ہوا تھا جب داس کی دوسری برسی منائی جارہی تھی۔ باقی

مضامین یا تو "زمیندار" میں شائع ہوے یا اس سے دوسرے اخباروں میں نقل ہوتے رہے اگر انھیں محفوظ نہ کر لیا جاتا تو یقیناً تلف ہو جاتے۔ ان میں سے بیشتر کے مسودات بھی میرے پاس محفوظ تھے، جو خود مولانا کے اپنے قلم سے تھے۔ جہاں شائع شدہ عبارت میں کسی مقام پر شبہ پیدا ہوا، مسودہ سامنے رکھکر اسے درست کر لیا گیا۔

میں نے ہر مضمون کے آغاز میں تمہیدی عبارتیں لکھ دیں تاکہ ان کی اشاعت کے وقت کا ماحول خوانندگان کرام کے سامنے آجائے اور مکاتیب و مضامین میں جہاں جہاں توضیحات کی ضرورت محسوس ہوئی حواشی تحریر کر دیے۔ اس طرح میرے اندازے کے مطابق ان تبرکات کی اشاعت سے بہتر طریق پر استفادہ کیا جا سکے گا۔

ایک مضمون "مقابر و آثار پر عمارات" کے زیر عنوان کتاب میں شامل ہے۔ یہ ۱۹۲۵ء میں مرتب ہوا تھا، جب حجاز پر سلطان عبدالعزیز مرحوم فرمانروائے نجد کے حملے سے قبور کی بحث چھڑ گئی تھی۔ اس کے متعلق یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ مولانا کے نام سے نہیں چھپا تھا تاہم مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ یہ مولانا ہی کا ہے۔ نیز اسلوب نگارش کی بہار آفرینی اور مسائل و امور کے سلسلے میں نکات و مباحث کی سیر حاصلی و شادابی اس حقیقت کی روشن شہادتیں ہیں کہ مولانا کے سوا یہ کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک اپنے نام سے شائع نہ کرنے کا سبب بعض وقتی مصلحتوں کی نگہداشت کے سوا کچھ نہ تھا اور اصل مقصود زیر بحث مسئلے کے مختلف پہلوؤں کی توضیح تھی، جس کی امید اس پیمانے پر کسی دوسرے صاحب سے نہ ہو سکتی تھی اور یہ مقصد اظہار نام و انتساب کے بغیر بھی پورا ہو سکتا تھا۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ ۱۹۲۵ء میں مقابر و آثار پر عمارتوں کی بحث نے ایک زبردست ہنگامے کی صورت اختیار کر لی تھی اور فریقین ایک دوسرے کے جواب میں جو کچھ لکھتے تھے اس میں تیز جوش اور بڑی تیزی نمایاں تھی۔ پھر بعض اصحاب نے بہت عامیانہ باتیں پیش کر کے نوشت و خواند کے ایک طبقے کو مشتعل کر دیا تھا غالباً ان اسباب سے مولانا کبھی غیرت فرمانہ رہ

ہے۔ چنانچہ ان کی بعض عبارتوں میں بھی ایک حد تک تلخی آگئی اور انتقاد نے شوخی کا رنگ پیدا کر لیا، حالانکہ علمی مباحث میں مرحوم و مغفور کی عام روش یہ تھی، میں صرف اصل مضمون کے دلائل و مطالب کو ملحوظ کر دینا چاہتا تھا، لہٰذا ان فقروں، اور الفاظ کو حذف کر دیا جو بدیہی طور پر ناخوشگوار تھے اور ان کے حذف سے اصل مطالب پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ اگر مولانا زندہ ہوتے اور اپنی نگرانی میں اس مضمون کو اشاعت کی غرض سے مرتب کراتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ان حصوں کو بے تامل حذف کرا دیتے۔ حذف شدہ فقروں اور عبارتوں کی جگہ نقطے لگا دیے ہیں۔ البتہ وہ حصے باقی رکھنے کے سوا چارہ نہ تھا، جنھیں اصل مطالب کی توضیح کے سلسلے میں ایک ناگزیر کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ آخر میں ایک مضمون "پیغام" سے بھی لیا گیا ہے۔ یہ ہفتہ وار اخبار تحریک ترک موالات کے عہد شباب میں بغرض دعوت و ارشاد مولاناؒ کے زیر نگرانی جاری ہوا تھا۔ مولاناؒ گرفتار ہو گئے تو یہ بھی بند ہو گیا۔ اسے "تبرکات" میں شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ارباب ذوق کو مولاناؒ کے داعیانہ اسلوب تحریر کا ایک حد تک اندازہ ہو جائے۔ "الہلال" کے پہلے دور میں بھی ایسے بے شمار مضامین و مقالات شائع ہوئے تھے، جنھیں بعض حقیقت ناشناس اصحاب نے صرف الفاظ کی طلسم آرائی قرار دیا۔ انھیں یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ قوموں اور جماعتوں میں زندگی کا ولولہ اور داعیہ تازہ کرنے کے لئے داعیانہ اسلوب خطاب سے کام لینا ناگزیر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اصل مقاصد کے لئے جد و جہد کی روح پیدا نہیں ہوتی، بلکہ دلوں کے دروازے صدائے حق کی پذیرائی کیلئے کھلتے ہی نہیں اور ظاہر ہے کہ داعی وہی انداز خطاب اختیار کرے گا، جو متعلقہ قوم و جماعت میں بیداری پیدا کرنے کے لئے ضروری ہو۔ اس سلسلے میں خاص قواعد و ضوابط وضع نہیں کئے جا سکتے۔

"الہلال" کے داعیانہ مضامین کے مقابلے میں "پیغام" کے مضامین زیادہ سلیس و عام فہم تھے۔ ان میں سے صرف ایک مضمون نمونے کی غرض سے "تبرکات" میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس نوع کے باقی مضامین کی اشاعت کا معاملہ جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور "الہلال" و "البلاغ"

کے مضامین و مقالات کو جس صورت میں منظر عام پر آنا تھا، وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔
میرے علم میں مولانا کے بعض اور مضامین بھی ہیں جو مختلف اخباروں میں شائع ہوتے رہے۔ افسوس کہ ان کی فراہمی کے لیے اب تک جتنی کوششیں کی گئیں، وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ حالات اور صحت نے مساعدت کی تو ان سب کو بھی مرتب کرنا ہے۔ نیز اس اثنا میں جو مکاتیب مل جائیں گے، وہ بھی اس نئے مجموعے میں شامل کر دیے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

آخر میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں:

دیدۂ بخت بہ افسانۂ او شد در خواب
کو نسیمے ز عنایت کہ کند بیدارم

مسلم ٹاؤن لاہور
۷ جولائی ۱۹۵۹ء

مہر

فہرست

۷

مولانا ابوالکلام آزاد کے یگانہ فضائل کا کونسا پہلو محتاج تعارف ہے؟ ایسی جلیل القدر ہستیاں صدیوں کے بعد عالم وجود کے لئے افزائش زینت کا باعث ہوتی ہیں۔ مولانا کی ایک ایک تحریر اپنے نادر مطالب اور غیر معمولی اسلوب تحریر کے باعث اہل علم ونظر کے لئے "واقعی تبرک" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو زبان میں جس بزرگ کے خامہ سحرطراز کی گل افشانیوں اور ندرت کاریوں نے نظم سے بڑھ کر دل آویزی پیدا کردی، وہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ یہاں تک کہ مولانا حسرت موہانی بھی بے اختیار اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے فرما گئے

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

(۱)

اس مکتوب گرامی پر تاریخ درج نہیں، لیکن یقینی طور پر رانچی میں
نظر بندی کے آخری دور کا خط ہے۔ اغلب ہے ۱۹۱۹ء کا ہو۔

حبیبی سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کی جس تحریر میں قرآن حکیم کی نسبت سوالات تھے اس کا مفصل جواب بھیجا گیا تھا جس کے بعد بالکل خاموشی رہی۔ مولوی سلطان صاحب[1] نے دریافت حال کے لئے خط لکھا مگر جواب نہیں آیا۔ تعجب ہے کہ آپ اس بارے میں میرے بیان پر مطمئن نہیں[2]۔

آپ نے میرے تغافل کی شکایت کی ہے۔ تغافل کا تو اقرار نہیں کر سکتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ جب کبھی میں نے آپ کے اور اپنے معاملے پر غور کیا ہے، یقین کیجئے کہ ہمیشہ خود میرے قلب نے مجھے ملامت کی ہے۔ آپ کی محبتوں کا میری جانب سے عشر عشیر بھی حق ادا نہ ہوا۔ میں خود اس کا معترف ہوں اور متمنی ہوں کہ کاش بقیہ زندگی میں کچھ تلافی کر سکوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ محبت کی کوتاہیاں حد تلافی و مکافات سے مافوق ہیں۔ ہر کوتاہی کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن محبت کی کوتاہی کی تلافی ممکن نہیں۔ مجھ سے علاقہ رکھنے والوں میں صرف ایک شخص ہے جس نے غالباً آپ سے بھی زیادہ مصائب برداشت کئے[3]۔ باقی اور سبھوں سے زیادہ آپ کے لئے اپنے اندر اندوہ و غم پاتا ہوں اور دائمی اضطراب رکھتا ہوں۔

الی اللہ اشکو، ان فی النفس حاجۃ
تمر بہا الایام وھی کما ھیا

---

[1] یعنی مولوی سلطان محمود مرحوم جو مشہور تحریک کے رکن تھے اور نوٹ بنانے کے سلسلے میں انہیں سزا بھی ہوئی تھی حالانکہ خود نوٹ نہیں بناتے تھے۔ [2] مطلب یہ ہے کہ مولوی محی الدین احمد نے لکھا تھا مولوی سلطان محمود صاحب نے ایک مسئلہ دریافت کیا تھا مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ مکتوب الیہ کے نزدیک قابل اطمینان نہ تھا۔ دوبارہ پوچھا گیا تو مولانا نے خیال کیا کہ پہلا جواب درست ہے اس پر غیر مطمئن ہونا موجب حیرت ہے۔ [3] معلوم نہ ہو سکا یہ کون صاحب تھے۔

خط کی پشت پر تحریر جواب کو بھی آپ نے من جملہ شواہد تناقض کے قرار دیا حالانکہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس وقت سوء اتفاق سے کاغذ موجود نہ تھا[1] آئندہ اس سے احتراز کروں گا۔

نصاب تعلیم | تعلیم کے متعلق چند امور ہیں:

ایک نقشہ نصاب بھیجتا ہوں۔ دو سال ہوئے ڈائرکٹر بنگال نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نظام تعلیم میں تبدیلی کی از سر نو تحریک کی اور مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی کو ایک مسودہ طیار کرنے کے لئے کہا چنانچہ ایک سب کمیٹی بنائی گئی اور میرے پاس بھی کاغذات پہنچے۔ نظربندی کی وجہ سے کمیٹی کے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے تحریری مراسلت پر اکتفا کیا اور ایک جدید نقشہ نصاب مرتب کرکے بھیج دیا۔ یہ اسی نصاب کے درجہ ثانیہ کی نقل ہے۔ اس کے ساتھ تشریحات کے نوٹس تھے، جو دو سو صفحے تک پہنچ گئے، لیکن ان کی نقل میرے پاس نہیں۔ ان سے کتب مجوزہ کے وجوہ ترجیح اور وجوہ انتخاب و تقسیم علوم و طبقات کتب وغیرہ واضح ہوتے۔[2]

۲ ۔ اس نصاب تعلیم کی کل مدت سولہ سال ہے، جس میں مکتب کلاس کے تین سال بھی شامل ہیں ان کو خارج کردیا جائے تو تیرہ سال باقی رہ جاتے ہیں جو یونیورسٹی کی مدت تعلیم و تکمیل کے مقابلے میں کسی طرح گراں نہیں۔ تعلیم دو حلقوں میں منقسم ہے: جونیر کلاس اور سینیر کلاس، جونیر کی مدت آٹھ سال ہے، جس میں مکتب کی ابتدائی تعلیم بھی داخل ہے۔ عام طور پر یونیورسٹیوں نے مکتب کی تعلیم کے لئے تین سال رکھے ہیں۔ ہم نے صرف دو سال رکھے اور مدرسہ رانچی[3]

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ مولوی محی الدین احمد نے کوئی استفسار کیا تھا اس وقت مولانا کے پاس کاغذ نہ تھا لہٰذا مولوی صاحب موصوف کے خط کی پشت ہی پر جواب لکھ دیا۔ مولوی صاحب نے اسے شواہد تناقض میں شامل کر لیا۔

[2] مولانا نے آگے چل کر لکھا ہے کہ دو سو صفحے کے یہ نوٹس ڈائرکٹر تعلیمات بنگال کے پاس بھیج دئے گئے تھے کوشش کی گئی کہ صاحب اس دفتر کے پرانے ریکارڈ سے یہ مسودہ یا تحریر نکال لیں۔ یہ ۱۹۲۰ء کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔

[3] مولانا کلکتہ سے جلاوطن ہو کر ۱۹۱۶ء میں رانچی پہنچے تھے۔ وہاں انہیں نظربند کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے رانچی میں ایک درسگاہ بھی قائم کی تھی۔ یہاں اسی کا ذکر ہے۔

کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ پوری طرح کافی ہیں۔ یونیورسٹی کے جدید قواعد کے رو سے سولہ سال کی عمر سے پہلے میٹرکولیشن کا امتحان دیا نہیں جا سکتا۔ اگر بچے نے پانچ سال کی عمر میں تعلیم شروع کی تو اس درجہ کی تعلیم سے تیرہ سال کی عمر میں فارغ ہو سکتا ہے۔ دو سال درمیان میں ناکامی وغیرہ کے لئے رکھ لئے جائیں اور پانچ کی جگہ آغاز تعلیم کو چھ میں سات لیجئے جب بھی سولہ سال کی عمر میں اس سے فارغ ہو جائے گا۔

۳۔ جونیئر کلاس کے آٹھ سال میں پانچویں سال سے انگریزی زبان دانی شروع ہو جاتی ہے اور حساب، جغرافیہ عام، جغرافیہ ہند تاریخ ہند تاریخ اسلام، مبادیات سائنس اس کے برابر اور بعض حالتوں میں اس سے زیادہ ہے جس قدر سرکاری مڈل انگلش کورس میں ہوتا ہے گویا انگریزی، حساب، تاریخ وغیرہ کی جس قدر استعداد مڈل پاس کو ہوتی ہے اس سے زیادہ اس جونیئر کلاس کے تعلیم یافتہ کو ہوگی۔ مزید برآں عربی صرف و نحو بالکل ختم۔ مبادیات ادب شروع، کامل ترجمۃ القرآن، بقدر ضرورت تجوید و قراءۃ، عقائد کا ایک متن حفظ، تاریخ اسلام مجمل، سیرۃ نبوی فارسی کامل، منطق کی پہلی کتاب، اور شرح تہذیب سے زیادہ تک کی۔ فقہ میں ایک مختصر، اسرار الدین میں منتخب احیاء و ماثبت بالسنۃ وغیرہ۔

ایک بنیادی پہلو ۴۔ موجودہ حالت میں کوئی سلسلہ تعلیم کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں سرکاری یونیورسٹیوں کے پیوند کی بھی گنجائش نہ رکھی جائے ایک بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ جونیئر کلاس کے بعد اگر کوئی چاہے تو بلا ایک سال بھی ضائع کیے ہائی اسکول کی پانچویں کلاس میں مڈل پاس کی طرح داخل ہو سکتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو قصداً پہلے مڈل انگلش کی تعلیم دلا کر ہائی اسکول میں داخل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی اردو اور حساب دانی زیادہ پختہ [illegible] میں معین ہوتی ہے۔ ہم نے بھی اتنی ہی مدت رکھی ہے۔ پس اس کے بعد بھی یہ ممکن ہے اور مزید برآں یہ کہ اس کی تربیت و اسلامیت اور فارسیت اس کا تمام عمر ساتھ دے گی۔ اگر جونیئر کلاس کے بعد [illegible] سینئر درجہ کی تعلیم حاصل نہیں کی گئی،

اور صرف انگریزی ہی کو اختیار کر لیا گیا، جب بھی اس سے ایک عربی دان اور دین سے باخبر گریجویٹ پیدا ہو سکتا ہے۔

۵۔ سینیئر کلاس یعنی جماعت ثانیہ صرف علوم کی جماعت ہے۔ مبادیات اور علوم آلیہ سب جماعت اولی میں ختم کر دیے گئے ہیں۔ اس کے چھ سال ہیں اور چار ابتدائی سالوں میں انگریزی کا سلسلہ جاری رہے گا، بقیہ دو سالوں میں انگریزی نہیں۔ انگریزی کے متعلق یہ اصل ملحوظ رہے کہ ایک انٹرنس پاس کی زبان دانی تک کی استعداد لازمی طور پر حاصل ہو جائے جس کو مزید انگریزی کا شوق ہو وہ جماعت ثانیہ کے چھ سال ختم کر کے درجۂ تکمیل (ایم۔ اے) میں انگریزی علم ادب کا مضمون لے سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کر لے سکتا ہے۔

نئی کتابوں کی ضرورت

۶۔ کوئی جدید نصاب تعلیم صرف موجودہ کتب کے ردو بدل واقتباس و انتخاب سے مکمل نہیں ہو سکتا، جب تک بعض کتابیں از سر نو نہ لکھی جائیں۔ علی الخصوص ابتدائی تعلیم میں سلسلہ دینیات، ترجمۃ القرآن، مبادیات طبعیات، منتخبات ادب فارسی، سیرت نبویؐ، منطق کی تصنیف ناگزیر ہے منطق کی پہلی کتاب قطعاً اردو میں یا فارسی میں ہونی چاہیے اور بہ اسلوب جدید نہ کہ بہ طرز متون و شروح قدیمہ۔ اس لئے متعدد چیزیں زیر تالیف ہیں۔ نیز منطق استقرائی۔

۷۔ معہذا چونکہ مقصود مدرسہ عالیہ کلکتہ اور اس کے بعد عامۂ مدارس تھے اور بہ مزاحمات وقت اصلاح کامل کو متحمل نہیں اور رعایت مصالح ناگزیر، اس لئے بعض چیزوں میں تنزلات گوارا کر لئے گئے۔ اور بعض چیزوں کو بحالہ چھوڑ دینا پڑا۔ مثلاً متون فقہ متداول اور عقائد و اصول میں مصنفات تفتازانی۔ درسیات اسلامیہ کے تنزل کا ایک بڑا سبب علامہ تفتازانی کے نصاب کا رواج و قبول ہے مگر یکایک انقلاب کامل کی کامیابی مشکل ہے یہ ساری باتیں نوٹس کو معلوم ہو گئیں، افسوس کہ مشاہد گورنمنٹ بنگال کے پاس ہیں۔

مجتہدانہ نظر کا فقدان | ایک بڑی دقت جس کی وجہ سے بعض بہترین کتب قدماء کو چھوڑ دینا پڑا،

یہ پیش آئی کہ ہمارے علما صدیوں سے اس کے عادی چلے آتے ہیں کہ وہ درسیات کو ان کے شروح وحواشی وتعلیقات وغیرہ کی مدد سے طلبہ کو پڑھائیں۔ مجتہدانہ نظر و درس مفقود۔ اب اگر یکایک تمام کتابیں ایسی رکھ دی جائیں جن کے شروح وحل غرائب ولغات وغیرہ موجود نہیں اور ان کا حل وفہم صرف معلّم کے مجتہدانہ نظر و مطالعہ کا محتاج، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کو پڑھانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ سب سے زیادہ یہ دقت ادب اور فقہ میں ہوئی۔ ناچار حتی الوسع ایسی ہی کتابیں رکھی گئیں، جن کے شروح کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ بلاغت ومعانی وبیان میں سینٹ جوزف کالج بیروت کی کتابیں اسی لئے اختیار کیں کہ ان کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں اور چھپی ہوئی ملتی ہیں، ورنہ بعض اور بہتر کتابیں قدماء کی نکل آئی ہیں۔ انشا وکتابت میں ابن مقفع وغیرہ کو اسی سہولت کی بنا پر اختیار کیا، ورنہ جاحظ، ابن درید وغیرہ ائمہ عربیت کے مقالات موجود ہیں اور وہ مستحق ترجیح تھے۔ بایں ہمہ ادب کا نصاب اس درجہ مکمل وجامع ہوگیا ہے کہ اس کے محاسن کا اندازہ تمام زیر درس کتب کے مطالعے اور ذوق سلیم وفکر مستقیم کی معاونت ہی سے ہوسکتا ہے۔ مختصر ومطول اور حریری ومتنبی کی پرستش کرنے والے اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔

۹ - لیکن آپ کو سردست جو صورت درپیش ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ آپ کو ایک کامل درسگاہ نہیں قائم کرنی ہے اور نہ اس کی ضرورت۔ مبادیات وآلات سے قطع نظر کرکے اعلیٰ علوم کی چند ضروری کلاسیں جاری کرنی ہیں اور بس۔ سرکاری یونیورسٹیوں کے قرار داد نظام تقسیم اوقات وغیرہ غیر ضروری پابندیوں کی رعایت بھی ضروری نہیں، جس کی وجہ سے مجوزہ نصاب میں بڑی دقتیں پیش آتی تھیں۔ پس یہ نقشۂ نصاب اس لئے نہیں بھیجا کہ بجنسہٖ اس کو اختیار کیا جائے[1]۔ مقصود یہ ہے کہ ضروری علوم ومضامین اور کتب منتخبۂ درسیہ کے

---

[1] یہ نقشہ مولوی محی الدین صاحب کے پاس نہ رہا۔ مختلف اوقات میں تلاشیوں کے خوف کے باعث کاغذات [illegible] اس خونریزی میں بہت سی قیمتی چیزیں گم ہوگئیں۔ انھیں میں یہ نقشہ ضائع ہوگیا اور بعض نہایت قیمتی خط [illegible]

مدد اس سے مل جائے گی اور کتابوں کے تقرر میں اس کا پیش نظر رہنا باعث سہولت ہوگا۔

دینیات اور عربیت ۱۰۔ آپ کے لئے دو نصاب تعلیم مطلوب ہیں، گریجویٹس کی تعلیم دینیات کے لئے، اور متوسطین عربیت کی مزید تعلیم کے لئے۔ دونوں کے حالات و مقتضیات مختلف اور اس کی رعایت ضروری۔ آپ کے پیش نظر تکمیل نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ اس کے لئے زیادہ زمانہ مطلوب اور بالفعل ہمتیں عموماً مقتصر۔ مجوزہ نصاب مقصد تکمیل و رسوخ علوم اسلامیہ کو پیش نظر رکھ کر تجویز کیا گیا ہے یعنی علمائے کاملین اور راسخین پیدا کئے جائیں۔

مگر آپ کا مقصد بالفعل بجائے تکمیل محض تعلیم ہونا چاہئے، یعنی موجودہ حالت جہل بالدین کے مقابلے میں جس قدر بھی زیادہ اور بہتر تعلیم قرآن و سنت دی جا سکے، وہ دے دی جائے، گو درجہ کمال تک نہ ہو مگر موجودہ طبقہ کے گریجویٹ اور مولوی سے بہتر و صالح مسلمان گریجویٹ اور مولوی پیدا کئے جائیں۔ یاد رکھئے کہ یہ بات سب سے زیادہ مقدم اور اولین بحث و فکر کی ہے۔ ہر سفر کی کامیابی کے لئے تقرر بدایت و نہایت لابد منہ و لازم و الزام ہے جب تک سب سے پہلے اپنی منزل مقصود متعین نہ کیجئے گا، نصاب و نظام کی تجویز و بحث بے کار ہوگی۔ بہت سی مجوزہ تجویزیں بلکہ عملی اقدام اس نکتے کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ضائع گئے۔ آپ سب سے پہلے اس کو صاف کر لیجئے کہ کیسی تعلیم مقصود ہے؟ یعنی موجودہ مراتب معلومہ تعلیم کے مقابلے میں کونسا مزید مرتبہ و درجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ اور مصالح و اسباب کے لحاظ سے کہاں تک بلندی و اسبقیت ممکن ہے؟

کاملین و متوسطین آیا مقصود علمائے کاملین کا پیدا کرنا ہے یا اصحاب علم متوسطین کا؟ کامل و پختہ منتہی علم پیدا کرنا چاہتے ہیں یا کامل و راسخ معلم؟ قرآن حکیم نے اصحاب درایت علم کی یہی دو قسمیں کی ہیں۔ متعلم و معلم اور یہی تسلسل تعلیم ہے۔ حفاظ علم ان دو جماعتوں سے باہر نہیں اور ان کے آداب و وظائف مختلف۔ تکوین امت صالحہ کے لئے یہ دونوں گروہ صحت و کمال کے ساتھ پیدا ہونے چاہئیں۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ دونوں کا فقدان ہے یعنی ہم ہوگئے

نہ کامل و صالح متعلم ہیں نہ کامل و صالح معلم۔ صنف متعلمین سے مقصود محض طلبۂ علم نہیں بلکہ اہلِ علم کا ایسا گروہ ہے جو باعتبار معلومات ایک اچھے سے اچھا درجہ علم و فکر کا رکھتا ہو اور تاہم تمیین و غافلین اور اپنے سے تمام نچلے درجوں اور عامۂ امت کے لئے بہ نسبت اضافی معلم ہونے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو تاہم اس کا اصل منصب علم کے "جاننے والے" کا ہو، "بتلانے والے" اور "سکھلانے والے" اور راہ کھولنے والے" کا نہ ہو۔ معلمین سے مقصود وہ سب سے اونچی اور آخری جماعت شہداء و مقومین حق و اصحاب عزیمت علم و سابقون بالخیرات فی العلم کی ہے جو صرف علم و صحیح کافی طور پر جان لینے اور سمجھ لینے ہی پر قانع نہ رہ گئی بلکہ چند قدم آگے بڑھے اور وہ منصب و مقام نفوذ و رسوخ و سریان امر و سلطان کا اسکا حاصل کیا، جس کے بعد وہ بتلانے والی، سکھلانے والی، طیار کرنے والی اور بنا دینے والی جماعت بن گئی۔ وذلک من عمل النبوۃ۔ قرآن حکیم نے انسانوں کو تین گروہوں میں منقسم کیا ہے: "فمنہم ظالم لنفسہ ومنہم مقتصد، ومنہم سابق بالخیرات باذن اللہ" اور بحکم "ثم اورثنا الکتاب" یہی تین گروہ ورثاء کتاب اللہ ہوئے۔ یہ تقسیم عام ہے نہ کہ محدود و خاص ہر وادی اندر میدان ہیں۔ پس علم کے میدان میں بھی "ظالم لنفسہ" ہیں اور درمیانی درجہ والے "مقتصد" اور آخری درجہ والے "سابقون بالخیرات"۔ آپ پہلے طے کر لیجئے کہ کن لوگوں کو پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ ایسے لوگوں کو جو میدان علم میں درجۂ اقتصاد رکھتے ہیں یا ایسے لوگوں کو جو درجہ سبقیت بالخیرات پر فائز ہوں؟

مصلحین کی ناکامی کے اسباب

آج تک مصلحین نظام تعلیم نے جس قدر بھی کوششیں کیں، ناکام رہیں۔ اسکے اسباب متعدد ہیں لیکن ایک

ملہ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا، فمنہم ظالم لنفسہ ومنہم مقتصد ومنہم سابق بالخیرات باذن اللہ۔ ذالک ہو الفضل الکبیر سورہ۔ فاطر۔ (پھر ہم نے وارث کیے کتاب کے وہ لوگ جن کو چن لیا ہم نے اپنے بندوں میں سے پھر کوئی ان میں سے برا کرتا ہے اپنی جان کا اور کوئی ان میں سے ہے بیچ کی چال پر اور کوئی ان میں سے آگے بڑھ گیا ہے لے کر خوبیاں اللہ کے حکم سے۔ یہی ہے بڑی بزرگی۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ مراتب و مدارج علم و تعلیم کے متعلق یہ اصول ان کے پیش نظر نہ تھے اور کوئی صحیح
واضح تقسیم اپنے سامنے نہیں رکھتے تھے، حالانکہ تعلیم امت بغیر اس کے ممکن نہیں۔ تمام طالبین علم نہ
اسبقیت حاصل کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں، اور نہ کرانے کی کوشش کرنی چاہیے اور نہ یہ کافی ہو
سکتا ہے کہ مجرد درجۂ اقتصاد پر قناعت کرلی جائے۔ پھر کتاب و سنت اور منہاج صحابہؓ کو
پیش نظر رکھ کر وہ اصول و مسلمات کار معلوم کرنے چاہئیں، جن کے بعد ہم معلوم کرلیں کہ اصحاب
اقتصاد کو اور کتنا ہونا چاہیے؟ اور اصحاب سبقت بالخیرات میں کن کن چیزوں کا ہونا
ضروری ہے؟ اس کے متعلق بھی کوئی اسلامی و قرآنی روشنی لوگوں کے سامنے نہ تھی۔ محض قیاس
و رائے کی ظلمت میں سرگردانی اور حیرانیاں تھیں۔ کسی نے مفاسد نصاب تعلیم کی ایک فرع
کو محسوس کیا، کسی نے دوسری کو، کسی نے تیسری کو۔ پھر صرف اُسی فرع کے استغراق میں گم
ہوگئے اور اصلاح و تغیر کے لیے اٹھے تو صرف اُسی فرع کو بطور اصل کے کام میں لائے۔ نتیجہ یہ
نکلا کہ ظلمات بعضہا فوق بعض سے دوچار ہوئے اور چونکہ اصل مفاسد ہاتھ نہ آئے اس سے اصل
اصلاح کی راہ بھی نہ کھل سکی۔

یہ ساری بحثیں نوٹس میں لکھ چکا ہوں، مشرح اور اب چاہتا ہوں کہ صرف مسئلۂ تعلیم اسلامیہ
کی تاریخ و تنزل و طرق اصلاح و نصاب ہائے تعلیم جماعات مختلفہ پر ایک مستقل کتاب لکھوں۔
شاید آج کل میں شروع کردی جائے۔ یہ چیز سب سے پہلے لکھی تھی، افسوس کہ اب لکھتا ہوں۔

<u>اسبقیت و اقتصاد</u>: بہرحال میری رائے [illegible] بر حالات معلومہ یہ ہے کہ آپ کے پیش نظر
درجۂ اقتصاد فی العلم ہو نہ کہ اسبقیت فی العلم۔ آپ متعلمین کاملین پیدا کیجیے، اُسی کی ضرورت
ہے، نہ کہ معلمین کاملین۔ اس کو دوسرے وقتوں کے لیے انتظار کیجیے۔ معلمین جبھی تیار ہوں گے
جب متعلمین کاملین بکثرت پیدا ہو جائیں، بعض آپ کے پیش نظر اسباب و حالات سے پوری
طرح واقف نہیں۔ اگر معلمین کاملین کے لیے گنجائش ہو تو مانع ہونے کی کوئی وجہ نہیں،
دیگر وجہ [illegible] سبقت بالخیرات [illegible] کا معاملہ ہے۔ والناس فیما یعشقون

[illegible]

مذاہب۔

اصحابِ اقتصاد و گریجویٹس، دو عربی خواں دونوں میں سے بآسانی دو بزمانۂ اوّل پیدا کیے جا سکتے ہیں، لیکن دونوں کا نصاب الگ الگ ہوگا، ایک نہیں ہو سکتا۔

ضروری سوالات | آپ یوں کیجئے کہ حسبِ ذیل سوالات کا بہ تفصیل جواب دیجئے۔ اس کے بعد میں اس بارے مفصل تحریر کا اور کل نقشہ بابت نصاب و مباحث متعلق نظامِ تعلیم لکھ کر بھیج دوں گا:

۱۔ آپ نے لکھا ہے کہ وظائف دیے جائیں گے۔ اصولاً میں اس کا مخالف ہوں صرف قیام و اکل و شرب کا انتظام ہونا چاہیے۔ وظائف لے کر جو پڑھیں گے ان سے کچھ امید نہیں باایں ہمہ اس میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ آپ بتلائیے کہ سرِ دست کتنے وظائف کا انتظام کریں گے؟

۲۔ آپ کا وعدہ عطیہ وظائف کتنے عرصہ تک کے لئے ہوگا؟ دو سال یا تین یا چار؟

۳۔ انگریزی خوانوں کے لیے یہ شرط ہوگی کہ گریجویٹ ہوں؟

۴۔ عربی خوانوں میں کون اور زیادہ تر کہاں کے تعلیم یافتہ ہوں گے؟ مدارس شمال وغیرہ کے یا اورینٹل لاہور کے؟

(نوٹ صفحہ سابقہ)

[۱] سورۂ بقرہ، یہ تحویلِ قبلہ کے سلسلے کی ایک آیت ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر امت کے لئے قبلہ مقرر ہوا۔ مقصد حقیقی نیکیوں میں سبقت و پیش قدمی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح تعلیم کے سلسلے میں بھی جو کچھ ممکن ہے اس میں مسابقت کیا جائے۔

[۲] سورۂ حدید کی آیت کا ٹکڑا ہے۔ آیت کا مضمون یہ ہے کہ جن بندگانِ حق نے فتح مکہ سے پیشتر خدا کی راہ میں مال خرچ کیا نیز جہاد میں شریک رہے، ان کا درجہ بعد کے مجاہدوں اور مال خرچ کرنے والوں سے بڑا ہے۔ ویسے اللہ کی راہ میں جہاد اور انفاقِ مال بہر حال اچھے ہیں۔ ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے یا پیچھے خدا کی راہ میں جن لوگوں نے بھی انفاق و جہاد کی خدمت انجام دی، ان سب کے ساتھ وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا۔

مستحسن بلکہ منجملہ مامورات و مطلوبات کے ہے اور قرآن ناطق ہے کہ ہمیشہ تین گروہ انسانوں کے مبلغین
و داعیان ہدایت کو ملیں گے۔ ایک گروہ کے لئے حکمت کا طریق اختیار کرنا چاہیئے، ایک کے لئے
موعظہ حسنہ کا اور ایک کے لئے جدل بطریق احسن کا اور داعی صادق وہ ہے جس کے پاس
ہر جماعت کی غذا موجود ہو۔ مخاطبین حکمت کے لئے غذائے حکمت، مخاطبین موعظت کے لئے
موعظت اور مستحقین جدل کے لئے جدل، لیکن بالتی ہی احسن۔ اگر حکمت کے مستحقوں کے لئے
صرف موعظت پر قناعت کرلی جائے گی یا مستحقین جدل کو حکمت و موعظت کی غذا دی جائے
گی تو یا تو ہضم نہ ہوگی یا نقصان پہنچائے گی اور معہذا داعی کو ہادی ہونا چاہیئے نہ کہ مناظر۔ دیکھو
اور نمونہ اس کا حجۃ ابراہیمی اور مکالمۂ خلیل و مدعی الوہیت سے واضح ہے۔[1] پس اگر فن مناظرہ سے
مقصود یہ ہو تو بلاشبہ یہ ضروری ہے لیکن اوّل تو قرآن و سنت کی مصالح و کامل تعلیم خود اس راہ کو
کھول دیتی ہے۔ صرف فروعات و محدثات زمان کا معاملہ باقی رہ جاتا ہے اور اگر اس کو ایک
مستقل مضمون تعلیم بنانا بھی ہے تو اس کا طریقہ دوسرا ہونا چاہیئے اور یہ کام جس طریق پر ہورہا
ہے، میں اس کو قرآن و سنت کے خلاف سمجھتا ہوں اور اس کا زیادہ حصہ طریق بدعت پر مشتمل
پاتا ہوں۔ لفظ بدعت وسیع ہے۔ مخالفین اسلام سے مناظرہ کرنے میں ہم کو کامیابی نہیں ہو سکتی
جب تک اس کے اصول و آداب و طرق و اساسات محض قرآن و سنت سے ماخوذ نہ ہوں۔
مصیبت یہ ہے کہ ہر کام اور ہر وادی میں اصل کار یعنی منہاج نبوت سے بعد ہو گیا ہے۔

---

[1] مثلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بادشاہ وقت کے اس مکالمے کی طرح جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۸ میں آیا
ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا خدا وہ ہے جو مخلوقات کو جلاتا اور مارتا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ میں بھی جلانے اور مارنے کی قدرت رکھتا ہوں۔
حضرت ابراہیم نے فرمایا اچھا خدا تو سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو پچھم سے نکال دے۔ اس پر بادشاہ دہشت زدہ ہو گیا۔ مطلب یہ
کہ دعوت کی وہ تلقین ہدایت کی ہے نہ کہ جدل و خصومت کی۔ داعی حق مخاطب کو دلیلوں کے انبار میں گھیر کر پھانسنا نہیں چاہتا بلکہ
اس کے طلب حق کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی داعی حق ہادی ہوتا ہے نہ کہ مناظر۔ داعی کی زبان سے تیر الشر نہیں ہوتا ہے۔

بہر حال اس بارے میں اپنا مطمحِ نظر صاف کیجئے۔

۹. سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ علوم کی تعلیم کے لئے عملی اور مکمل طریقہ املا کا تھا اور اب سارا دارومدار کتب پر ہے اس کیلئے کچھ لوگ بیٹھ کر تعلیم دیں مگر میں آج کہاں کروں۔

اپنے والد بزرگوار اور مسٹر محمد علی[۱] کو میرا سلام شوق پہنچا دیجئے۔

رولٹ بل اور گاندھی جی

مسٹر گاندھی کی تحریک رولٹ بل کے متعلق صحیح ہے[۲] اور اس میں حصہ لینا چاہیے مگر تقسیم عمل کے بغیر چارہ نہیں۔ پس خود آپ کو اور آپ کے عزیزوں کو اپنا تمام وقت اسی کام میں یعنی تعلیم میں بلا التفات یمین و یسار خرچ کرنا چاہیے اور اسی کا ہو رہنا چاہیے۔ ایک وقت زندگی میں تمام خیرات پر احاطہ نہیں ہو سکتا۔ بعض بعض کے لئے اور ہر جماعت اپنے اپنے دائرہ عمل کے لئے۔ آپ صرف اپنے کام میں لگے رہیے اور جو سفر شروع کیا ہے، پہلے اس کا سامان کر لیجئے۔ اب آپ کا مطمحِ نظر احیائے تعلیم ہونا چاہیے۔ البتہ یہ دوسری جماعتوں کا فرض ہے کہ اپنا فرض ادا کریں۔ مسٹر گاندھی کی نسبت تو نہیں مگر دستخط کرنے والوں کی طرف سے اپنا مطلق نہیں ہوں کہ عمل کو قول کے مطابق کر دکھائیں گے۔ آخر مسٹر شرما نے استعفیٰ واپس لے لیا اور یہی حال اوروں کا بھی ہوگا۔ مسٹر مدن موہن مالویہ بھی دستخط کرنے والوں میں ہیں، لیکن اب تک کونسل میں نظر آ رہے ہیں۔ کم از کم اگر بیس ممبر بھی مستعفی ہو جاتے مقاومت

---

۱ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم و مغفور کے مولانا محمد علی مرحوم جو محی الدین احمد صاحب کے بھائی تھے۔

۲ حکومت نے رولٹ بل بظاہر انقلابی تحریکوں کو دبانے کے لئے بنایا تھا مگر مقصود یہ تھا کہ قومی تحریکات کو دبایا جائے۔ اس پر گاندھی جی نے مخالفت کی تحریک جاری کی تھی۔ مرکزی قانون ساز مجلس کے ممبروں نے بھی مخالفت میں حصہ لینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ان میں عمل و استقامت کی ہمت نظر نہ آتی تھی۔ پھر یہ تحریک پھیلی تو ایک وسیع ملکی تحریک بنی جسے صحیح معنوں میں عوامی کہا جا سکتا ہے۔ وہیں سے انگریزی حکومت کے خلاف منظم عوامی سیاسی تحریکات کا آغاز ہوا۔

تحویل ہوجانے تک دو تین گھنٹے کے اندر اندر یا اُفق بدل جاتا اور تقاضا مداخلت کرتا۔ بہر حال دیکھیے
کیا ہوتا ہے۔ والعاقبة للمتقین۔

خدارا اب میرے خطوں کو ضائع نہ کیجیے گا[1]

---

[1] مولانا نے اپنے خطوں کو محفوظ رکھنے کا کبھی خیال نہیں فرمایا۔ میں نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ کیا محسوس ہوتا ہے آپ کی زندگی کے حالات اس کی سمجھ میں ہوتا ہی تو فرمایا کہ معلوم نہیں میرے خطوں کو محفوظ رکھتے ہو یا نہیں۔ اسے ضرور محفوظ رکھنا، اس سلسلہ کو مدت بہت جلد شائع ہو جانے لگے۔ یہاں مولانا محی الدین احمد صاحب کو تاکید کی ضرورت اس لئے بھی ہوئی کہ ایک دفعہ مولانا صاحب موصوف نے سورۂ ملک کے متعلق استفسارات کیے تھے۔ ان کے جواب میں تین صفحے لکھ دیے۔ سورۂ ملک کی تفسیر پر مشتمل تھے۔ بیچارے تماشائی کی زحمت تمام تر خط اٹھا کر چھت پر پھینک دیا گیا، اسے سنبھال لیے ہوگیا۔ اس سلسلے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مولانا نے اسے واپس منگوایا تو اطلاع دی گئی کہ محفوظ نہیں ہے کیونکہ خط بھی اہم مطالب پر مشتمل تھا۔ اس لئے فرمایا کہ خطوط ضائع نہ ہونے پائیں۔

باسمہ تعالےٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، وفقنا اللہ و ایاکم لما یحبہ و یرضاہ فی القول والعمل والا

۱۔ مصلحت وقت کے متعلق آپ کا خیال صحیح ہے، مگر آپ کا یہ جملہ صحیح نہیں کہ اسلام میں مصلحت وقت کوئی چیز نہیں، حالانکہ سنت اللہ مصلحت و رعایت وقت کی مقتضی ہے۔ اسلام کبھی بھی اصلاً اس سے تخلف کر سکتا ہے؛ میں آپ کو ایک اصول بتلائے دیتا ہوں کہ ہر بات کی بنیاد کسی اصل و اساس پر ہونی چاہیے۔ عام غلطی یہ ہے کہ اصول سامنے نہیں؛ صرف متفرق جزئیات پیش نظر ہیں جس رنگ و حال کا کوئی جزئیہ نظر آگیا، اسی کو اصل سمجھ کر حکم لگایا۔ دنیا کے ہر فکر، ہر عمل اور ہر سعی کو دیکھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہمیشہ ایک چیز وہ ہوتی ہے جس کو "مقصد" کہتے ہیں اور ایک چیز وہ جو اس مقصد کو عمل میں لائے اور اس کے وسائل و ذرائع سے عبارت ہے مثلاً مقصد یہ ہے کہ ایک ملک فتح کیا جائے۔ اب آپ فوج جمع کریں گے، اس ملک کی حالت کو دیکھیں گے، پھر کوچ ہوگا، قدم قدم پر طرح طرح کے حالات سے سابقہ پڑے گا نکلنے سے پہلے قصد کیا تھا کہ برسات سے پہلے دھاوا کر دیں گے۔ مگر برسات کا موسم راہ ہی میں آگیا، ندی نالے چڑھ گئے۔ اب چلنے ہوئی کہ آئندہ سال وغیرہ وغیرہ، تو یہ تمام چیزیں "مقصد" نہیں ہیں بلکہ وسائل و ذرائع حصول مقصد۔ مقصد نہیں بدل سکتا، وہ اس کو وقت بدل سکتا ہے اور نہ اور کوئی شے۔ البتہ ذرائع میں حسب حالت تبدیلی ضرور کرنی پڑتی ہے کہ سنت اللہ اس کی مقتضی ہے اور بغیر اس کے حصول فتح متعذر۔ آپ نے اگر اس ملک کی ایک راہ کو بند دیکھ کر دوسری راہ اختیار کی یا موسم مخالف دیکھ کر میدان کے بجائے قلعہ کا انتظار کیا تو اس تبدیلی کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مقصد میں تبدیلی ہوگئی اور مقتضائے وقت اس وقت اس کو بنا لے گیا، کیونکہ مقصد تو برابر سامنے ہے اور غیر متغیر، البتہ وسائل میں

ضروری تبدیلی ہو رہی ہے۔

احکام شریعت کی تقسیم | پھر ایسی ہی تقسیم شریعت الٰہیہ کے احکام میں بھی ہے۔ جس چیز کو یہاں مقصد کہا وہاں وہ اصل و اساس یا عقیدہ یا ارکان اسلامیہ و ایمانیہ ہیں۔ ان میں کبھی کسی طرح کی نہ تو تبدیلی ہو سکتی ہے نہ التوا، نہ اخفا، نہ تقیہ۔ امرت ان اقاتل الناس حتی الخ[1] الحدیث اور حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ الخ[2] مصلحت وقت، مقتضائے وقت، ہجوم موانع، کثرت اعدا، وغیرہ وغیرہ یہاں صرف مہمل ہیں اور ابداً مسموع نہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس سرزمین میں ان وساوس کا قدم آیا تو شیطانی نفاق ہے یجری مجری الدم اور کسی طرح روح اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، لیکن جس طرح وہاں مقصد کے بعد وسائل و ذرائع حصول مقصد کا ایک دائرہ ہے اسی طرح یہاں بھی فروعات عمل و تبلیغ و مقدار تیزی و سستی و بلندی و پستی وغیرہ وغیرہ امور ہیں اور بلاشبہ مصلحت وقت کا قانون ان پر مؤثر ہے اور اس کی رعایت واجب ہے اور عین اسوۂ حسنہ انبیائے کرامؑ و سنن ثابتہ و عادت حضرت ختمی مآب [illegible] ملتی۔ اس سے کسی طرح اعراض نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی مقصد کا اظہار ایک خاص اسلوب پر

---

۱ پوری روایت ہے: امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ و یؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءہم واموالہم الا بحق الاسلام وحسابہم علی اللہ۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں [illegible] اسلام کے حق کے [illegible] حساب اللہ پر ہے۔ ۲ وقاتلوہم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ [illegible] یہاں تک کہ ظلم و فساد باقی نہ رہے اور دین کا سارا معاملہ اللہ ہی کے لئے [illegible] سے [illegible] جب تک [illegible] سورۃ الانفال کی آیت میں [illegible] باقی نہ رہے۔ [illegible] سارا [illegible] ہو جائے۔

آواز اتنی بلند ہونی چاہیے کہ در و دیوار گونج اٹھیں۔ کبھی اتنا ہی کافی ہے کہ پڑوسیوں نے سن لیا۔
کبھی بعض فروعات کو اصل مقصد کی راہ میں ملتوی کر دینا چاہیے۔ کبھی بمقتضائے وقت انہی پر
زور دینا چاہیے۔ کبھی رفتار اس قدر تیز ہو کہ نہ ٹھوکروں کی پروا ہے، نہ ندی نالوں کی۔ کبھی اس
قدر محتاط کہ ایک ایک پتھر کو دیکھ کر اور ایک ایک کانٹے سے بچ کر قدم اٹھایا جائے۔ کبھی
ایسا کرنا چاہیے کہ دو جماعتیں ہیں، ایک سے عارضی صلح کر لی تاکہ دوسری اشد جماعت کے
مقابلے میں مدد لے کر اس کا انسداد حفظ مقصد کے لئے مقدم ہے اور کبھی ایسا ہونا چاہیے
کہ سوائے جماعت حقہ کے کسی سے صلح نہیں اور ایک کے لئے سب سے دشمنی۔ ان امور کے
لئے قرآن حکیم نے انبیائے کرام کے اعمال حقہ اجتماعیہ کے نمونے پیش کیے ہیں اور خود ظہور اسلام
و نزول قرآن کی ۲۳ سالہ زندگی ایک مکمل دستور العمل ہے جس سے اس بارے میں بھی ہم کو
کلیات و اصول ملتے ہیں۔ فرعون صرف اسی وقت گمراہ نہ تھا جب حضرت موسیٰ بنو اسرائیل
کو لیکر فاتحانہ مصر سے نکلے ہیں، بلکہ اول دن سے تھا، مگر حضرت موسیٰؑ نے اول روز ہی یہ
مطالبہ نہیں کر دیا کہ ان اَدُّوا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ، اِنِّی لَکُم رَسُولٌ اَمِینٌ![1] ایک وقت وہ تھا کہ قبطی کو مارا۔
پھر وہ وقت آیا کہ مدین میں تکمیل استعداد ظہور کا انتظار کیا۔ پھر جب سینا کے دامن میں شعلۂ
حق نے چمک کر تکمیل وقت و اعلان ظہور کی خوشخبری دی تو آخری وقت آیا اور جو کچھ سنت
اللہ کے مطابق ہونا تھا، ظہور میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل مکہ میں کیا تھا؟
پھر ہجرت کے بعد کیا ہوا؟ پھر صلح حدیبیہ کیوں ہوئی؟ اور بالآخر فتح مکہ کے دن کیا ہوا؟

بصیرت راسخہ کی ضرورت

نزول احکام کی تدریج بلکہ خود نزول قرآن مجید کی تدریج میں بھی منجملہ دیگر اغراض کے مصلحت مصالح وقت کو دخل
ہے۔ پہلے نماز کی تعداد اور اوقات اور تھے، پھر تدریجاً یہاں تک پہنچے۔ روزہ اور
زکوٰۃ کا حکم پہلے ہی روز نہیں ہوا، وغیر ذلک من الاشباہ والنظائر۔

---

[1] سورۂ دخان: حوالے کردو میرے بندے خدا کے، میں تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ مقام نازک ہے اور افراط و تفریط کے کناروں سے ملا ہوا ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں کہ مصلحتِ حقیقی و شرعی کو سمجھے اور جزئیات سوانحِ نبوت سے کلیات اخذ کرے بڑی ہی احتیاطِ نظر اور بصیرۃ راسخہ کی ضرورت ہے۔ یہاں اکثر کج نظری اور ضلالتِ استدلال سے ٹھوکر لگی ہے۔

رہا یہ امر کہ اس دائرے میں بھی مصلحتِ وقت کے حدود کیا ہیں؟ اور کہاں تک ہمارے عمل کو اس کے قانون سے متاثر ہونا چاہیئے؟ تو اس کے لئے بھی قرآن و سنت نے نمونے پیش کر دیئے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ مصلحتِ وقت کا قانون اپنی انتہائی حالتوں میں بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا کہ حفظ و اعلانِ مقاصد کے ساتھ تعداد و طرزِ عمل کی سرعت و آہستگی، یا تقدیم و تاخیر یا زیادہ سے زیادہ بعض حالتوں میں سکوت والتباس۔ اس کے بعد کوئی درجہ نہیں۔ اس سے قدم ایک انچ بھی بڑھاؤ پھر حدودِ نفاق و کفر شروع ہو گئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مصلحت کی بنا پر کسی حقیقت سے انکار کر دیا جائے یا مصلحۃً حق کی جگہ باطل کی دعوت دی جائے۔ یہ میں نے جتنی باتیں لکھی ہیں یہ سب قرآن حکیم سے ماخوذ ہیں۔ آپ کو خلاصہ لکھ دیا۔

یہود و نصاریٰ کی گمراہیاں

۲۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی الخ اس آیہ کریمہ کا جو مطلب آپ نے لکھا ہے اور شبہ ظاہر کیا ہے، فی الحقیقت یہ مطلب نہیں ہے اور آپ کا شبہ آپ کی صحتِ ذوق کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے آیت کا سیاق و سباق دیکھنا چاہیے سورہ بقرہ میں خدا تعالیٰ یہودیوں کی حالت بیان کر رہا ہے۔ ایک ایک کر کے ان کی گمراہیاں گنوائی

لہ پوری آیت یوں ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ بے شک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، وہ ہوں یا وہ لوگ جو یہودی ہیں یا نصاریٰ ہیں یا صابی ہیں، لیکن کوئی بھی ہو جو کوئی بھی خدا پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس کے اعمال بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان و عمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہوگا، نہ کسی طرح کی غمگینی۔

موحد عیسائی[1] عیسائیوں کا ایک بہت بڑا موحد فرقہ تھا، جو مسیح کو ابن اللہ نہیں مانتا تھا اور نہ کفارہ کا قائل تھا۔ روم کی کونسل نے اس کے داعی کو سزا دی۔ وہ بھاگ کر اسکندریہ گیا۔ در اصل آج کل یونی ٹیرین عیسائی انہی کے بقایا ہیں۔ مشہور بشپ یوحنا جو حضرت عمرو بن العاص کے ہاتھ پر بعد فتح مصر اسلام لایا اور سب سے پہلا حکیم اسلام تھا، اسی فرقہ کا ہادی تھا۔ یہ لوگ سچے عیسائی یعنی مسلمان تھے۔ مسیح کو نبی مانتے تھے۔ کفارہ کے قائل نہ تھے نجات کا دارومدار اعمال صالحہ کو سمجھتے تھے، راتوں کو عبادتیں کرتے اور دن کو بیماروں کی خدمتیں۔ ان میں اکثر ارباب بصیرت ایسے تھے کہ سچے دل سے فارقلیط کے موعود ظہور کے منتظر تھے اور ان میں سے جن لوگوں نے اس پاک عہد کو پایا، سچے دل سے ایمان لائے۔ یہی لوگ تھے جن کی نسبت فرمایا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ[2] ۔ لا یستکبرون یعنی دعوت اسلامی کو سن کر جھک جاتے ہیں اور انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ اس کے بعد فرمایا: وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ[3] جب قرآن کو سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے جوش اشک بہنے لگتی ہے اس لئے کہ اس کی سچائی کو انھوں نے پالیا ہے۔ یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشاہدین[4]۔ پس وہ پکار اٹھتے ہیں کہ خدایا ہم اس کلام پر ایمان لائے۔ پس ہم کو شہدائے حق میں سے شمار کر!

---

[1] یعنی مسیحیوں میں قائلین توحید اور منکرین تثلیث کی جماعت۔ [2] سورہ مائدہ (اور ایمان والوں کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں۔ اس لئے کہ ان میں پادری اور رہبان ہیں اور اس لئے کہ ان میں گھمنڈ اور خود پرستی نہیں) [3] سورہ مائدہ۔ (اور جب یہ (عیسائی) وہ کلام سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں جوش گریہ سے بہنے لگتی ہیں، کیونکہ انھوں نے کلام کی سچائی پہچان لی ہے) [4] سورۂ مائدہ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں۔ خدایا ہم ایمان لائے، پس ہمیں بھی انہی میں سے لکھ لے جو تیری سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔

وہ دین نوفل ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے طلب حق میں
بڑا سفر کیا اور ایسے پادریوں سے ملے جو نفس حقیقت سے واقف تھے۔ انھوں نے وصیت
کی کہ فارقلیط کا ظہور قریب ہے۔ملنا تو ایمان لانا اور پہلا اسلام کہنا۔ سلمانؓ نے جب
یہ تذکرہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متامل ہوئے کہ ایسے لوگوں کی نسبت کیا کہیں
اس پر آیت اتری اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی الخ یعنی وہ سچے نصاریٰ تھے
سچے عیسائی تھے۔

اہل کتاب سے قرآنی مطالبہ

ابن ابی حاتم نے بسند متصل مجاہد سے یہ روایت
بیان کی ہے اور متعدد طرق سے منقول ہے
اور سعید بن جبیر نے بھی روایت کیا ہے۔ قرآن ہر جگہ اہل کتاب سے یہ مطالبہ کرتا
ہے کہ کتاب اللہ کو قائم کرو، جس کو تم نے نَبَذُوْا وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ کر دیا ہے لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ
حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ ، سورہ مائدہ میں کہا وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ الخ پس اصل دین
اللہ ایک ہے۔ جو یہودی و عیسائی تورات و انجیل پر قائم رہے، کیوں نہ ان کے
لئے مغفرت و بشارت ہو؟ بات بالکل صاف ہے اور خواہ مخواہ دوسری طرف لے
جانا غلط ہے۔ یہی تفسیر خود آنحضرتؐ نے کی اور یہی تفسیر اجلۂ صحابہ و تابعین سے مروی۔
حضرت ابن عباس کے بطرق متعدد مروی ہے کہ مقصود امم سابقہ قبل از ظہور اسلام
ہیں۔ نیز ربط آیات کا بھی مقتضی یہی ہے۔ رہی یہ بات کہ امم سابقہ کے ساتھ آمنوا
کیوں کہا؟ یعنی مومنین کا کیوں ذکر کیا؟ تو اس کا جواب خود ابن عباسؓ دے چکے ہیں
چونکہ دین الٰہی ایک اور نتائج ایک، اس لئے فرمایا کہ اصل کار ایمان باللہ و عمل صالح ہے۔
پس جو ایمان لائے اور جو سچے یہودی و نصرانی تھے سب اللہ کے نزدیک ایک جیسے
ہیں اور مغفرت کا دروازہ وا ہے۔ باقی رہے ان اقوام کے وہ لوگ جنھوں نے آنحضرت
کا زمانہ پایا اور تبلیغ دعوت کی گئی لیکن انکار کرتا یا اس سے جھگڑتے رہے تو ان کی نسبت

یہی قرآن سورہ حج میں فرماتا ہے: ان الذین آمنوا والذین ہادوا والصابئین والنصاریٰ والمجوس والذین اشرکوا ان اللہ یفصل بینہم یوم القیامۃ ان اللہ علیٰ کل شیٔ شہید[1]

تفسیر قرآن بالقرآن

اگر سورۂ بقرہ کی آیت کا وہ مطلب ہے جو آپ نے لکھا ہے اور آپ کے لئے موجب شبہ ہوا ہے، تو کہئے اس آیت کا مطلب کیا ہوگا؟ اس سے بھی بڑھ کر چیز یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر سب سے پہلے خود قرآن ہی سے کرنی چاہیے اور اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے کہ ایک ہی مطلب کے متعلق کہاں کہاں ارشادات موجود ہیں۔ جس طرح سورہ بقرہ میں ان اقوام و مذاہب کی نسبت فرمایا، ٹھیک ٹھیک اسی طرح سورہ مائدہ میں کہا ہے: قل یا اہل الکتاب لستم علیٰ شیٔ حتیٰ تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم، ولیزیدن کثیرا منہم ما انزل الیک من ربک طغیانا وکفرا، فلا تاس علی القوم الکافرین۔ ان الذین آمنوا والذین ہادوا والصابئون والنصاریٰ من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔ لقد اخذنا میثاق بنی اسرائیل وارسلنا الیہم رسلا، کلما جاءہم رسول بما لا تہوی انفسہم، فریقا کذبوا وفریقا یقتلون[2]

---

[1] جو لوگ ایمان لائے، جو یہودی ہوئے، جو صابی ہوئے، جو نصاریٰ ہیں، جو مجوسی ہیں، جو مشرک ہیں، قیامت کے دن ان سب کے درمیان اللہ فیصلہ کر دیگا۔ اللہ سے کوئی بات چھپی نہیں، وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

[2] (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اے اہل کتاب تمہارے پاس ٹکنے کیلئے کچھ بھی نہیں، جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، اسے قائم نہ کرو، اور (اے پیغمبر) جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے (یقیناً وہ ان میں سے بہتوں کے لئے تنبیہ و نصیحت کا موجب ہوا اور نہ) یا وہ ان کی سرکشی اور انکار بڑھا دیگا، تو تم اس گروہ کی حالت پر افسوس نہ کرو جو حق کا منکر ہو گیا۔ جو لوگ قرآن پر ایمان لائے ہیں، وہ ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی ہیں، اور صابی اور نصاریٰ ہیں کوئی ہو، لیکن اصل دین یہ ہے کہ جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھیگا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا [illegible] طرح کی غمگینی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (ہدایت و عمل کا عہد) بنی اسرائیل سے لیا اور رسول بھیجے مگر جب [illegible] کے پاس ایسا حکم لیکر جو ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف تھا تو انہوں نے ان میں سے بعض کو [illegible] اور بعض کو قتل

آپ دیکھیے کہ یہاں سب سے پہلے اہل کتاب سے فرمایا کہ تم کچھ نہیں ہو جب تک کتاب اللہ
کو قائم نہ کرو یعنی تورات مانیں۔ پھر آنحضرت کو مخاطب کر کے کہا کہ تم پر جو کلام حق نازل ہوا ہے
تو اس سے یہ انکار کرتے ہیں اور یہ انکار ان کے لئے موجب مزید کفر و طغیانی ہو رہا ہے۔ پس ان
کے لئے غم نہ کرو، یہ کافر ہیں۔ قوم کافرین کی شقاوت پر افسوس لاحاصل ہے۔ اس کے بعد وہی
سورۂ بقرہ والی آیت بلا تقدیم و تاخیر الفاظ آتی ہے کہ ان کافروں میں سے جو لوگ ایسے ہیں جنہوں نے
کہ کتاب اللہ کو قائم کیا یعنی ایمان باللہ و عمل صالح اختیار کیا تو وہ اس طغیان و کفر سے
پاک رہے۔ وہ مثل مومنین اسلام کے ہیں۔ ان کے لئے کوئی خوف نہیں۔ پھر کہا
لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔ اس سے مزید وضاحت ہو گئی کہ یہاں یہودیوں
سے وہی یہودی مراد ہیں جنہوں نے میثاق الٰہی کو نہیں توڑا اور تکذیب رسل سے بری رہے۔

سرسید مرحوم اور سید جمال الدین کا اس آیت کی بنا پر خیال تھا کہ ایمان بالرسل
شرط نجات نہیں۔ نہیں معلوم کیوں، مگر میں نے مولانا عبید اللہ کو بھی اس طرف مائل پایا
البتہ وہ زور زیادہ مسئلہ تبلیغ کی بنا پر دیتے تھے اور بنیاد شاہ صاحب کی ایک عبارت پر
رکھتے تھے۔ بہرحال غالباً مولوی احمد علی صاحب نے بھی اسی بات کو کہا ہوگا۔ مگر وہ دوسرا قصہ
ہے۔ آیت کا مطلب یہی ہے جو لکھا۔ یہ خط آپ مولوی صاحب کو بھی دکھلا دیں۔ ممکن ہے اس
بارے میں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ انشاء اللہ مولوی احمد علی بات صاف کر دیں گے۔

نزول قرآن کا ۳۔ اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ الخ بعض مفسرین کو یہ خیال ہوا کہ قرآن
حکیم تو تئیس سال میں اترا ہے پھر انزلناہ فی لیلۃ القدر کیسے کہا؟ اس لئے طرح طرح کی تاویلیں
کی گئیں۔ کسی نے کہا کہ لیلۃ القدر میں پورا قرآن لوح محفوظ سے آخری آسمان پر کہ اس کو سماء
دنیا کہتے تھے اتر آیا۔ جہاں سے کہ تھوڑا تھوڑا زمین پر نازل ہوا۔[1]

---

[1] صد افسوس ہے کہ اس مکتوب گرامی کے باقی اوراق مولوی محمد احمد کے پاس مختلف رسائل کو اشاعت کے لئے دیا گیا تھا شائع بھی نہ ہوا اور واپس آیا تو اس کا حصہ غائب تھا۔

(۳)

۴۲ - رپن اسٹریٹ کلکتہ
۱۱ر نومبر ۱۹۶۳ء

عدیقی العزیز! السلام علیکم

آئندہ سے آپ کے مکاتیب کے جواب کے لئے جو مذہب تعجیل اختیار کر رہا ہوں، اس کا اندازہ اسی جواب سے کر لیجیے۔ اسی لمحہ میں نے آپ کا خط ختم کیا ہے اور باوجود درد پا کے جواب لکھنا شروع کر دیا۔

دہلی میں آپ کے والد بزرگوار سے آخری باتیں ہو گئیں۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے آپ کو لکھا ہوگا، لیکن شاید اب تک موقع ہی نہیں ملا۔ ایک لمحہ کے لئے یہ خیال نہ کیجیے کہ میری خاموشی محض تساہل و اعراض کا نتیجہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ مجھ میں ہر طرح کی کوتاہیاں اور درماندگیاں ہیں، لیکن ساتھ اتنا ارادہ اب بھی ہے کہ فیصلے کے بعد عمل سے نہیں رک سکتا۔ مشکل یہ رہی کہ میں فیصلہ نہ کر سکا۔ میرے اضطراب کیلئے قوی وجوہ تھے۔ اگرچہ ممکن ہے وہ دوسری طبائع کیلئے اس درجہ موثر نہ ہوں۔ یہ ہر حال بحالت موجودہ میں جو کچھ فیصلہ کر سکا ہوں، اس سے آپ کو مطلع کرتا ہوں۔ ضرور نہیں کہ یہ آخری ہو۔ ہماری تو کوئی بات آخری نہیں ہوتی اور یہ تو محض وقتی حالات اور ہنگامی رائے کا نتیجہ ہے۔

۱ - جو مسودہ دستور العمل کا تیار شدہ موجود ہے وہ ٹھیک ہے۔ توکلاً علی اللہ شائع کر دیا جائے۔ میں نے اس میں صرف اس قدر تبدیلی کر دی ہے کہ اصل مقاصد خدمت قرآن، اشاعت علوم، نشر تراجم، وغیرہ ذالک قرار دیا ہے۔ مشن کا کام تبعاً اس میں آ جائے گا۔ اول دن سے جو بات سامنے رہی ہے وہ یہی تھی۔ مسودہ مولوی عبدالقادر صاحب کو دے دیا ہے۔

۲۔ بالفعل میں جمعیت[1] کی صدارت سے مجبور ہوں، حاجی عبدالغفار[2] صاحب فاروقی، کو تین سال یا ایک سال کے لئے صدر منتخب کر لیجئے۔ یہ اس لئے کہ طبقہ علما و مشائخ میں کوئی شخص آپ کے سودمند نہیں ہو سکتا۔

جمعیتہ دعوت و تبلیغ سے علاقہ ۳۔ رہا میرا علاقہ، تو وہ پوری باقاعدگی اور التزام کے ساتھ حسب ذیل صورتوں میں رہے گا۔

(الف) ہر طرح کے تحریری و لسانی مشورے۔

(ب) جمعیت کی ضروری تحریرات کی تیاری

(ج) بالالتزام ہر تیسرے ماہ ایک مستقل کتاب جمعیت کیلئے تیار کر دینا اور طبع و اشاعت کے لیے دے کر دینا۔ یہ ایک مرتب سلسلہ ہوگا جو اسلام اور علوم قرآن کی نسبت ایک خاص سیریز کی تدوین کرے گا، اس طرح کہ اس کا مطالعہ کرنے والا ترتیب الف سے ی تک معلومات حاصل کرتا جائے سب سے پہلی کتاب "اسلام کا انٹروڈکشن" ہوگا پھر "اسلام اور ارتقاء انسانیت" پھر "عقائد اسلام" پھر "قرآن" یہ انتظام یوں کیا جائے گا کہ ہر ایک کتاب آپ کو ملے اس کے انگریزی اور ہندی و دیگر زبانوں میں ترجمہ کا بھی انتظام ہو جائے۔ اس کا انتظام کرنا آپ کا کام ہو میرا کام اب صرف دینا ہی رہ گیا ہے کہ اس وقت تک کے اپنے تمام افکار جلد سے جلد مدون کر دوں۔ یہ بھی ممکن ہو کہ چھوٹے رسالے ماہوار حوالے کر دیے جائیں۔

۴۔ اس کے علاوہ میرا طرز عمل وہ دستور رہے گا کہ جہاں تک میرا حلقہ اثر ہے، لوگوں کو اس کام کی طرف توجہ دلاتا رہوں۔

بالفعل اس پر قناعت کیجئے۔ آپ کے دل میں تنظیم ملت کا جو عشق ہے اس سے بے خبر

[1] اس سے مقصود جمعیۃ دعوت و تبلیغ ہے اور دستور العمل بھی اسی جماعت کا تھا

[2] یہ سلسلہ لکھا گیا یا نہ لکھا گیا تاہم معلوم ہے کہ نہ کبھی چھپا، نہ اس کا کوئی مسودہ اب تک ملا

نہیں ہوں لیکن انصاف کیجئے جب میں اپنے پندرہ سال کے طلب و عشق کے بعد
وقت کے عدم مساعدت و استعداد کا اعتراف کرتا ہوں تو آپ کو بھی میرا ساتھ دینا چاہیے۔

تنظیم اہل حدیث | آپ نے جماعت اہل حدیث کی تنظیم کا ذکر کیا ہے، کاش یہی ہو جائے
لیکن حالات پر جب نظر ڈالتا ہوں تو مجھے مختصر بھی اس مطول سے کم مشکل نہیں۔ بڑی مصیبت
یہ ہے کہ جماعت اہل حدیث بھی اپنے اصلی ذوق اور ذہنیت سے ہٹ گئی ہے، علی الخصوص
موجودہ علماء اہل حدیث کی ذہنیت اس درجہ عمل و عزم سے مستبعد ہو گئی ہے کہ کسی طرح انہیں راہ
عمل پر لایا نہیں جا سکتا۔ ایک لاعلاج مرض حد درجہ پستی فکر و معیار نظر کا پیدا ہو گیا ہے۔ بتدریج عد
مقلدین کی نصرانیت کے مقابلے میں یہاں ظاہر پرستی و تقشف کی یہودیت سرایت کر گئی ہے۔
کس کس کو آپ راہ پر لائیں گے اور کتنا وقت آپ سنگ تراشی میں صرف کریں گے؟ صورت
بننے کی نوبت ہی پیش نہ آئے گی۔

طبقہ علماء سے مایوسی | میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ موجودہ طبقہ علماء سے خواہ مقلدین
ہوں یا اہل حدیث، میں قطعاً مایوس اور اس کو نوامیس اجتماع کے بالکل خلاف سمجھتا ہوں کہ ان کے
جمود میں کسی طرح کا انقلاب و تحول پیدا ہو۔ راہ عمل صرف ایک ہی ہے یعنی موجودہ پختہ عمروں
سے صرف نظر کر کے ایک نئی مخلوقات دماغ و فکر کی پیدا کرنا۔ اس کے لئے مادہ اولی صحیح
اسلامی ذہنیت کی تولید ہے اور اس کے لئے سب سے پہلے ایک خاص نیا لٹریچر مطلوب اور اس
کے بعد تعلیم و تربیت۔

مولوی برکت اللہ[۱] کا کوئی مضمون مجھے نہیں ملا، حیرت ہے۔ حصہ غزوۃ الجامعہ میں
درج ہوتا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن ندوہ میں ہیں، میں ان سے گفتگو کرتا ہوں۔

ابوالکلام

۱؎ اشارہ یقیناً مولوی برکت اللہ بھوپالی کی طرف ہے، جو بہت بڑے انقلابی تھے۔ انہوں نے عمر کا بیشتر
حصہ ملک سے باہر ہی گزارا ہے۔ باہر ہی وفات پائی۔

(۳)

۴۴ - دیپن اسٹریٹ، کلکتہ

۲۲ر فروری ۱۹۲۵ء

اخ العزیز   السلام علیکم

خط پہنچا، جواب میں اسلئے تاخیر ہوئی کہ کلکتہ کے حالات کی مزید تحقیق کرکے لکھنا چاہتا تھا جیسا کہ خیال تھا قطعاً خلاف ثابت ہوئے، اس لئے کہ عرصہ سے تجارتی حالت منقلب ہو چکی ہے کلکتہ میں مسلمانوں کی دو تاجر جماعتیں تھیں۔ کولوٹولہ کے دہلوی تاجر اور میمن تاجر۔ ان دونوں کی جو حالت ہو رہی ہے وہ حقیقت میں اچھی نہیں۔ یہاں چند سالوں سے میرا زیادہ تر اعتماد حاجی غنی احمد تاجر شکر پر تھا، جو چار پانچ سال پہلے جاوی شکر کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے اور جب تک وہ بازار میں آتے نہ تھے بازار شروع نہیں ہوتا تھا۔ ان کا اب یہ حال ہے کہ صرف آٹھ سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کا ایک مکان باقی رہ گیا ہے۔ اسی پر گزران ہے اس کا بھی ایک حصہ کئی ماہ سے خالی ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ میں نے باوجود ان حالات کے علم کے ایک کوشش کی اور ان میں بعض لوگوں کو بلایا اور ہر طرح ٹٹولا معلوم ہوا کچھ ... نہیں ... ہوسکتا ہے اس سال بجز اس کے چارہ نہیں کہ ریاستوں سے مدد لی جائے۔ ریاستوں میں بھی بھوپال سے بہت امید ہے زمین اچھی طرح طیار ہے، صرف ایک آخری ضرب کی ضرورت ہے ....

... اگر حکیم صاحب[۲] [illegible] ۔ آپ کے جانے کے بعد دہلی میں حکیم صاحب سے میری دوبارہ گفتگو ہوئی اور انھوں نے پہلے کی طرح سعی و کوشش کا وعدہ کیا، مگر مشکل یہ ہے کہ ان کی

۱؎ اس مکتوب کے بعض الفاظ قریباً مٹ گئے۔ بڑی کاوش سے چند الفاظ کا اندازہ کیا جاسکا اور وہ درج کر دیئے گئے۔ بعض کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا۔ ان کی جگہ مجبوراً نقطے لگا دیئے ہیں۔

۲؎ - حکیم صاحب سے اشارہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی طرف ہے۔

ہوگئیاں اس قدر وسیع ہیں کہ کسی ایک کام کے لئے صرف قوت دشوار ہے۔ بھوپال کے حلقہ میں ایک شخص کا خیال آیا ہے اور اسے آج دوسرا خط بھیج رہا ہوں۔ معلوم نہیں بیگم صاحبہ[1] دہلی میں ہیں یا چلی گئیں۔ ۵ مارچ تک میں بھی دہلی جاؤں گا۔ وہاں آپ کے والد سے بھی ملاقات ہوگی مشورہ کر کے کوئی نہ کوئی ایسی سبیل نکالی جائے گی کہ بھوپال کا معاملہ کامیابی کے ساتھ طے ہو جائے۔

اول دن سے یہ کام آپ ہمت و عزم اور محض اعتماد علی اللہ پر کر رہے ہیں اب ہمت نہ ہاریئے۔ بلاشبہ مشکل سخت پیش آگئی ہے لیکن صرف استقامت ہی کام دے سکتی ہے میں نے جس روپیہ کا انتظام کیا تھا وہ دلیتھو مشینوں کے لئے دے چکا ہوں ورنہ آٹھ ہزار روپیہ بھیج سکتا تھا۔ عجب نہیں اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسے حالات پیدا کر دے کہ کچھ نہ کچھ آپ کا بار ہلکا کر سکوں۔[2]

ابوالکلام

---

۱ نواب سلطان جہاں بیگم مرحوم و مغفور والیہ بھوپال

۲ مکتوب کے اصل مضمون کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ برادرم مولوی محی الدین احمد نے جمعیۃ دعوت و تبلیغ کے نام سے جو انجمن قائم کر رکھی تھی، اس کا مرکز پونا تھا۔ اس انجمن نے دکن کے مختلف حصوں خصوصاً ملیبار میں نہایت عظیم الشان کام انجام دیا تھا۔ پہلے سے سیٹھ میر بخش اور مولوی محمد علی صاحب برادر محی الدین احمد کی طرف سے مستقل امداد ملتی تھی اور ضروری مصارف کے لئے کسی دوسری طرف توجہ کی ضرورت نہ تھی۔ اچانک مذکورہ بالا دونوں امدادیں بند ہو گئیں اور جمعیت کا کام بار رجاری رکھنے کے لئے باہر سے امداد کی درخواست پیش آگئی۔ مولانا نے پہلے کلکتہ کے تاجروں میں کوشش کی، پھر بھوپال کا خیال آیا۔

(۵)

محبی فی اللہ۔ السلام علیکم

خط پہنچا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کو میرے بعض عقائد و اعمال کی نسبت
شکوک پیدا ہوئے مگر آپ ان پر قانع نہیں ہوئے۔ مجھے ان سے مطلع کرنا ضروری تصور کیا
ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہونا چاہیئے۔ آپ نے رسالہ خلافت کا حوالہ
دیتے ہوئے حکم التزام جماعت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اصلاً بالکل صحیح ہے۔ لیکن ضروری
ہے کہ اس کا صحیح محل متعین کر لیا جائے۔ آپ میرے عمل کو اس کے خلاف قرار دیتے ہیں
لیکن اس کی تشریح نہیں کرتے کہ ان کا کون سا عمل؟ بہرحال قیاس کہتا ہے کہ التزام جماعت
اور علیکم بالسواد الاعظم[۱] وغیرہا احادیث کے سمجھنے میں آپ کو بھی غلط فہمی ہوئی ہے جو بعض دوسرے
گوشوں میں دوسرے لوگوں کو ہو چکی ہے۔ جب تک کسی قدر تفصیل سے کام نہ لیا جائے
معاملہ صاف نہ ہوگا۔

عقائد و اعمال کا معیار آپ غالباً سمجھتے ہیں کہ اس حکم کا تعلق مسلمانوں کے عام عقائد
و اعمال اور افکار و آراء سے ہے یعنی جب کبھی مسلمانوں کی کوئی بھیڑ کوئی راہ عمل
اختیار کرے تو شرعاً ہر مسلمان پر واجب ہو جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرے نہیں کریگا تو
"من شذ شذ فی النار" کی وعید کا مستوجب ہوگا اور اس کی موت "میتۃ جاہلیۃ" کی موت
ہوگی۔ حالانکہ شارع کے حکم التزام جماعت اور اتباع سواد اعظم کا یہ مطلب نہیں۔ اگر ایک
لمحے کے لیے یہ مطلب تسلیم کر لیا جائے تو حق و باطل اور سیاہ و سپید کا سارا کارخانہ درہم
برہم ہو جائے گا اور اسلامی زندگی کے معنی صرف یہ رہ جائیں گے کہ جس جہل و ضلالت پر بھیڑ
زیادہ متفق ہو جائیں بس اسی کے [illegible]

۱؎ یعنی التزام جماعت اور علیکم بالسواد الاعظم۔

معیار حقیقت نہیں بلکہ تعدد کا محض منافی حقیقی اکثریت ہے۔ کوئی راہ کتنی ہی جہل و ضلالت کی راہ ہو لیکن اگر دس نے قدم اٹھایا تو گیارھویں کے لئے بحکم التزام جماعت و اتبعوا سواد الاعظم اس کی پیروی لازم ہوگی۔ نہیں کرے گا تو من شذ شذ فی النار!

وجوب تقلید کیلئے استدلال | اس تاخیر میں وہ مدعیان علم مبتلا ہوگئے تھے جو اس حدیث سے تقلید شخصی کے وجوب و التزام پر استدلال کرتے تھے اور اب بھی اگر میدان مناظرہ گرم ہو جائے تو مزید کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسلمانوں کا سواد اعظم ائمہ اربعہ کی تقلید شخصی پر جم گیا ہے اور ان کو انہیں مذاہب متعددہ اربعہ میں تسلیم کرتا ہے اس لیے اب کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ تقلید شخصی کے التزام سے براہ راست کتاب و سنت پر تدبر کر کے عمل بالحدیث کرے کیونکہ اگر ایسا کرے گا تو سواد اعظم سے تخلف کرے گا اور التزام جماعت سے باہر ہو جائے گا۔ ومن شذ شذ فی النار!

سنہ ۱۲۴۰ھ کا مباحثہ | انیسویں صدی کے اوائل میں جب مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے اتباع دین خالص کی دعوت بلند کی تھی، تو ان کے مقابلہ میں بھی پرستاران بدع و محدثات نے آپ کا یہی مزعومہ مطلب بنا، استدلال ٹھہرایا تھا اور اتبعوا سواد الاعظم کی بنا پر "من شذ شذ" کا فتویٰ دیا تھا چنانچہ جامع مسجد دہلی کے مباحثہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں سب سے بڑی دلیل یہی پیش کی گئی تھی کہ جن عقائد و اعمال کو آج بدعت و ضلالت ٹھہرایا جا رہا ہے یہ تمام تر وہی اعمال و عقائد ہیں جن پر مسلمانوں کے سواد اعظم کا اتفاق ہو گیا اور مسلمانوں کا کوئی شہر و قریہ نہیں جہاں یہ امور عمل میں نہ لائے جاتے ہوں۔ پس ان کے استحسان میں شک کرنا اور انہیں بدع و محدثات قرار دینا سبیل المؤمنین سے تخلف کرنا اور سبیل شذوذ اختیار کرنا اور مفارق جماعت ہونا ہے!

آپ کا خط پڑھتے ہوئے ایک دلچسپ لطیفہ ذہن میں آیا کہ جو سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں بجنسہ یہی سوال مولوی شاہ اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی داماد شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ سے کیا گیا تھا اور منصفانہ ایک تحریر "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ" کے نام سے دہلی میں شائع

گئی تھی۔ اسی میں مولوی صاحب موصوف نے سائل پوچھا ہے کہ:

این ہمہ اعمال و امور کہ کافہ اہل اسلام مستحسن و مقبول و انستہ می کردند
می کنند، الآن وہ عقیدہ شما شرک و بدعت گردید۔ کیا این طریق عین افساد
فی الدین و شق عصائے مسلمین و شذوذ از جماعت و اتباع سبیل غیر مؤمنین
نیست۔ بگو کہ حکم التزام جماعت و حدیث مشہورۃ اتبعوا السواد الاعظم از خاطر
شریف بکلی محو و متلاشی گشتہ۔ (حافظہ سے لکھ رہا ہوں، ممکن ہے الفاظ میں
کچھ تعدد بدل ہو گیا ہو)

حکم التزام جماعت کا محل اس غلط فہمی کا منشا یہ ہے کہ حکم التزام جماعت کا محل و مورد ان لوگوں نے معلوم نہیں کیا اور کوتاہ نظری نے تحقیق و مطالعہ کی مہلت نہ دی۔ اگر ان لوگوں نے کم از کم صحائف سنت کے تراجم ابواب ہی پر غور کر لیا ہوتا یا اس ایک حدیث کے ساتھ اس کی دوسری ہم معنی احادیث بھی دیکھ لی ہوتیں تو کبھی اس نافہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ دراصل ان تمام احکام کا تعلق امامتِ کبریٰ کے معاملے سے ہے، یعنی خلافت اسلامیہ کے معاملہ سے۔ منکہ عقائد و افکار اور اعمال دکا ما سے۔ عرب کے جنوب و شمال میں اگرچہ حکومتوں کے بعض سلسلے قائم ہو چکے تھے، لیکن وسطی عرب ہمیشہ خود رو اور مطلق العنان قبائل کا جولان گاہ رہا۔ ان کی بے قید طبائع پر اس سے زیادہ کوئی بات شاق نہ گزرتی تھی کہ کسی نظام حکومت سے وابستہ ہو کر رہیں یا کسی امیر کے آگے سر اطاعت جھکا دیں۔ اسلام کا ظہور ہوا تو اس کی روح جمہوریت کے ساتھ نظم و اطاعت کا بھی توام چاہتی تھی۔ وہ اگر ایک طرف انفرادی آزادی کا محافظ تھا تو دوسری طرف نظم و امارت کا بھی مقوم تھا۔ پس ضروری ہوا کہ مسئلے کے اس پہلو پر زور دیا جاتا اور عرب کی بے قید طبائع میں یہ بات اتار دی جاتی کہ جب ایک امیر منتخب کر لیا گیا اور جماعت اس پر متفق ہو گئی تو پھر کسی مسلمان کو محض اپنی انفرادی رائے کی بنا پر تخلف نہیں کرنا چاہیے۔ بہرحال اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ اگر تخلف کرے گا تو جماعت میں تفرقہ ہوگا۔

فتنوں کی تولید ہوگی منظاہرت نظامِ ملت منتشر و برہم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فارقِ جماعت کی نسبت فرمایا۔ اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی یعنی جاہلیت میں جماعت کا قیام نہ تھا ایک طرح کی فوضویت (یعنی انارکی) کی حالت طاری تھی۔ اسلام آیا تو اس نے تمام قوم کو ایک رشتۂ اطاعت میں منسلک کر دیا۔ اب اگر اس اطاعت کا ربقہ گردن سے نکالا جاتا ہے تو یہ پھر جاہلیت کی طرف عود کرتا ہے۔

<u>اطاعتِ امیر</u> | چنانچہ جن احادیث میں التزامِ جماعت کا حکم دیا گیا ہے، ان کا منطوق اس بارے میں بالکل واضح اور غیر مشتبہ ہے۔ تمام احادیث بالاتفاق اطاعتِ امیر کا حکم دیتی ہیں اور اسی سے تخلف کو "تفرق عن الجماعت" اور "دعوت بدعوی جاہلیت" قرار دیتی ہیں مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ، مَاتَ مِیْتَةً جَاہِلِیَّةً اور بروایت ابن عباسؓ فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْرًا فَمَاتَ عَلَيْهِ إِلَّا مِیْتَةً جَاہِلِیَّةً نیز بروایت مسند مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ إِلَّا أَنْ يُرَاجِعَ وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَى جَاہِلِیَّةٍ الخ۔"

آپ نے رسالہ "خلافت" کا حوالہ دیا ہے اگر رسالہ مذکورہ آپ کے پاس موجود ہے تو براہِ عنایت اسے مکرر دیکھئے۔ میں نے نہایت تفصیل کے ساتھ یہ حقیقت واضح کر دی ہے خصوصاً اس کی وہ فصل جس میں "اقتدار" اور "اطاعت" کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ تعجب ہے آپ نے اس میں جماعت و التزامِ جماعت کے الفاظ تو دیکھ لئے لیکن ان کا مطلب نظر انداز کر دیا۔

<u>معاملہ داعیانِ حق</u> | اگر حکم التزامِ جماعت کا مطلب یہی قرار دیا جائے کہ تمام عقائد و افکار اور اعمال و کردار میں مسلمانوں کو چاہیے کہ سوادِ اعظم کی پیروی کریں۔ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ کے مستوجب ہوں گے، تو ظاہر ہے حق و باطل، سنت و بدعت اور اسلام و کفر کے تمام احکام و قواعد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ایک لمحے کیلئے کوئی ذی عقل اس کا یہ مطلب قرار دے سکتا ہے؟

پھر کیا حکم ہوگا ان سیکڑوں فقیہوں و محدثوں کا جنھوں نے خلاف شریعت بدعتوں کے انسداد و
کثرت شیوع فتن و استیلاء جمیع ضلالات و غلبۂ بطلان و فساد و غربت اصحاب حق و قلت
مخلصین و صادقین سوادِ اعظم کی گمراہیوں کا ساتھ نہیں دیا اور سوادِ حق و سدادِ دین پر قائم رہے؟
کیا یہ سب التزامِ جماعت سے باہر ہو گئے تھے؟ اور ان سب کی موت جاہلیت کی موت ہوئی!

پھر اگر التزام جماعت اور اتباع سوادِ اعظم کا یہی مطلب ہے، تو ان تمام اختلافات کا
کیا حکم ہوگا جن میں تنہا ایک فرد کی رائے ایک طرف اور جماعت کی رائے دوسری طرف
تھی اور حق و صواب فرد کے ساتھ تھا، نہ کہ جماعت کے ساتھ؟ خود عہد صحابہؓ کے بے شمار
واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں؟ جب مانعین زکوٰۃ کے قتال کا سوال اٹھا تو تمام مجمع صحابہ کی
رائے ایک طرف تھی اور حضرت ابو بکرؓ کی تنہا ایک طرف۔ یعنی سوادِ اعظم قتال کا مخالف تھا۔ حضرت ابو بکرؓ
مجبور تھے۔ پھر کیا حکم لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے اتبعوا السواد الاعظم کی مخالفت کی؟ حاشا و کلا!

کیا حکم ہوگا ان بزرگ و شواذ کا جنھوں نے مامون و واثق کے زمانے میں سوادِ اعظم کے
مقابلے میں امام احمد بن حنبل نے کیا جواب دیا تھا؟ "ائتونی بشیء من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ
حتی اقول" یعنی اس میدان میں معیار ردّ و قبول سوادِ اعظم نہیں ہے بلکہ علم و بصیرت ہے

حدیث غربت | پھر اگر التزام جماعت کے حکم کا یہی مطلب ہے تو ان حدیثوں کا مطلب
کیا ٹھہرایا جائے گا جن میں صاف صاف ایسے زمانوں کی خبر دی گئی ہے جب مسلمانوں کے
سوادِ اعظم کی راہ گمراہی کی راہ ہوگی اور اصحاب حق قلیل و اقل ہو جائیں گے؟ غربت ثانیہ والی حدیث
تو کبھی آپ کے کانوں میں پہنچی ہوگی؟ "بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریبا کما بدأ فطوبیٰ للغرباء" اسی میں ہے
"قلنا و ما الغرباء؟ قال: قوم صالحون، قلیل فی ناس سوء کثیر، من یعصیہم اکثر ممن یطیعہم"

یعنی صحابہؓ نے سوال کیا غرباء سے مقصود کون لوگ ہیں جن کے لئے "فطوبیٰ للغرباء"
کی بشارت ہوئی۔ فرمایا صالح مسلمانوں کا ایک گروہ، برے لوگوں کی کثرت میں تھوڑے سے
ہوں گے۔

کی عبارت سے پہلے کہی گئی ہے سواد اعظم جدھر جائے گا جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے تو سوچو کیا کہ اختلاف پیدا ہونے
کے بعد جب حق سواد اعظم کے ساتھ نہ ہوگا بلکہ قوم صالحین قلیل فی الناس یعنی کثیر کے ساتھ ہوگا۔
اسی طرح مسلم کی مشہور حدیث لا تزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لا یضرہم من خالفہم الخ
میں اصحاب حق و صداقت کو طائفہ سے تعبیر فرمایا یعنی سواد اعظم کے مقابلے ایک جماعت کی ٹکڑی
اور اسی طرح شیخین کی مشہور حدیث میں جو وارد ہے کہ جب مسلمانوں کا کوئی امام نہ رہے اور کئی طرح
طرح کی ٹولیوں میں بٹ جائیں تو فاعتزل تلک الفرق کلہا ولو ان تعض باصل شجرۃ۔ مگر
درخت کے پتے چبا کر جینا پڑے جب بھی ان ٹولیوں کا ساتھ نہ دو۔ ان سب سے الگ رہو۔

اب کہیے سواد اعظم یہاں کہاں رہا!

موجودہ حالت اور سواد اعظم آج اگر مسلمانوں کی مردم شماری کی جائے تو شاید سو میں
دو آدمی بھی ایسے نہیں نکلیں گے جو اپنے عقائد و اعمال میں دین خالص پر عمل پیرا ہوں۔ پس
سواد اعظم کی راہ انحراف و بدعت کی ہوئی اور اتبعوا السواد الاعظم کا حکم موجود ہے۔ الیس
مطلب اس کا آپ کے نزدیک یہ کہ جس طرف بھیڑ چلے وہی راہ چلو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی مسلمان کے
لئے دین خالص کا اتباع جائز نہیں۔ لیجئے قصہ تمام ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دین کا ذکر ہی کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

سیاسی صورت حالات پھر جہاں تک سیاسی صورت حالات کا تعلق ہے کیا اس
مطلب کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ قوم پر سیاسی محرومی کی حالت جبھی
طاری ہوتی ہے جب سواد اعظم عزم و عمل سے محروم ہو جاتا ہے اور محکومیت کی روٹی پر
قناعت کر لیتا ہے۔ اب اگر کوئی مرد کار عزم کی دعوت دے گا تو یقیناً اس کی راہ سواد اعظم کی
راہ نہ ہوگی۔ فرد واحد کی راہ ہوگی یا ایک قلیل ترین طائفہ کی۔ پھر کیا اس کے خلاف شرعاً
یہ فتویٰ صادر کرنا پڑے گا کہ سواد اعظم سے باہر ہو گیا اور التزام جماعت کے حکم کی
پیروی سے منکر ہو گیا؟ من شذ شذ فی النار!

کیوں اٹھایا جا رہا ہے؟ اِن ہٰذا الا اختلاق[1]

جماعت مصطلح حدیث پھر یہ بھی نہیں معلوم آپ نے "جماعت" مصطلح حدیث کا مطلب کیا سمجھا ہے، غالباً آپ آج کل کی انجمن بازیوں اور کانفرنس آرائیوں کو "جماعت" سمجھتے ہیں۔ مثلاً انجمن حمایت اسلام، علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس، جمعیۃ العلماء، احرار کانفرنس، مسلم لیگ، مسلم کانفرنس، گویا اس طرح کی جب کبھی کوئی انجمن بن جائے اور اس کا سالانہ جلسہ بھی نہ کسی طرح منعقد کر لیا جائے تو یہ جماعت مصطلح احادیث باب ہو گئی اور اب تمام مسلمانوں پر فرض ہو گیا کہ آنکھ بند کر کے اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ نہیں کریں گے تو داہِ شذ شذ اختیار کریں گے اور مَن شذ شذ فی النار کی تعزیر کے مستوجب۔ اگر آپ نے جماعت اور التزام جماعت کا مطلب یہی سمجھا ہے تو اس پر اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واے گر از پس امروز بود فردا ے

ابوالکلام

---

[1] مولانا موصوف نے یہ [illegible] ترجمان القرآن میں سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۹ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: "سنہ ۱۹۱۴ کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا، ہندوستان کے تمام مشائخ کو عزائم دعوت اصلاح و تجدید پر [illegible] متوجہ کروں [illegible]۔ چنانچہ پہلے اس کی کوشش کی لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ وقت ایک فتنہ ہے۔ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن کی تھی [illegible]" (ترجمان جلد دوم ص ۱۱۹) [illegible]

(۶۷)

کلکتہ

۱۰ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء

جبتی فی اللہ السلام علیکم

آپ کا خط پہنچا۔ آپ نے الہلال کے مضامین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اگرچہ اسے پڑھ کر نہایت مایوسی ہوئی۔ آپ کے ذہن و فکر کے لئے ایسی مایوس رائے میں نہیں رکھنی چاہتا تھا تاہم اس کی یہ توجیہ میں نے کرلی کہ جب آدمی کو کسی ایک ہی چیز سے ذوق و شغف ہو تو وہ دنیا کی ہر چیز میں وہی ڈھونڈھتا ہے اور وہ نہیں ملتی تو کہہ دیتا ہے کہ کچھ نہیں۔ آپ کو لکھنے پڑھنے کی چیزوں سے صرف ایک خاص نوعیت کے مذہبی مباحث کا شوق ہے اور علم و ادب کی ساری دنیا آپ کے لئے بے معنی ہے۔

"الہلال" کے مکاتیب خصوصی

لیکن اسی سلسلہ میں آپ نے ایک بات ایسی لکھ دی ہے، جس میں کسی طرح کی توجیہ کی گنجائش نہیں۔ یہ چیز اس درجہ مستبعد تھی کہ پہلی مرتبہ میں پڑھ گیا مگر کوئی مطلب اخذ نہ کرسکا۔ دوسری مرتبہ پھر پڑھا اور معلوم ہوا واقعی آپ کا مطلب وہی ہے، جسے میں اپنے نزدیک مستبعد سمجھ رہا تھا۔ آپ لکھتے ہیں "سٹیٹسمین" "ٹائمز" وغیرہ میں جو چٹھیاں شائع ہوچکی ہوں ان کا دو دو اور چار چار ہفتہ کے بعد زیر عنوان "نامہ نگار خصوصی" شائع ہونا کسی طرح بھی "الہلال" کے شایان شان نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ "سٹیٹسمین" اور "ٹائمز" میں جو چٹھیاں شائع ہوتی ہیں، انہیں چار چار ہفتہ کے بعد ترجمہ کرکے الہلال میں نامہ نگار خصوصی کے نام سے شائع کردیا جاتا ہے یعنی ایک کذب و تزویر کے ساتھ دوسرے شخص کی طرف منسوب کردی جاتی ہے[۱]۔ اگر "الہلال" میں

۱۔ معلوم نہیں ملک کے عالیجناب احمد صاحب نے کس خیال سے یہ سب لکھ دیا؟ مفصل جواب خود مولانا نے دے دیا ہے۔ مگر یہ بھی ٹھیک نہیں کہ صرف سنہ ۱۳ء کا الہلال ہی ان کے ذہن میں تھا۔ سنہ ۲۷ء کا الہلال اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے بارے میں کسی کو شکایت پیدا ہوئی۔ حالانکہ ۱۹۲۷ء کا الہلال بھی خالص علمی نقطۂ نگاہ سے پہلے سے بہتر مرتب ہوتا تھا۔

کذب و تزویر کا یہ شیوہ اختیار کیا گیا ہے تو یقیناً یہ انتہا درجہ کی سفاہت اور کمینہ پن بلکہ اس سے
بھی زیادہ کوئی چیز ہے، لیکن چونکہ میرے لئے یہ محال عقلی ہے کہ "الہلال" کی ایک سطر بھی اس
طریقے سے استعمال کی گئی ہو اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے طریق نقد و انکشاف سے
تفصیلی واقفیت حاصل کر لوں۔ براہ عنایت مطلع کیجئے کہ "الہلال" کا کون کون سا
مضمون "سٹیٹسمین" یا "ٹائمز" سے اس طرح لیا گیا ہے؟ یہ عذر نہ کیجئے گا کہ آپ نے پرچہ دیکھا نہیں
اور تاریخ حافظہ میں محفوظ نہیں رہی۔ اگر "سٹیٹسمین" اور "ٹائمز" آپ کے پاس موجود نہیں
یا ان کا نمبر یا تاریخ نہ بتلا سکیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ بہرحال وہ انہی ایام کے ہوں گے جو
"الہلال" کی اشاعت کے ہیں۔ آپ صرف الہلال کے وہ مضامین مع نمبر لکھ دیں اور
اتنی تصریح کر دیں کہ تقریباً دو ہفتے یا چار ہفتے گزرے کہ یہ مضمون "سٹیٹسمین" یا "ٹائمز" میں نکلا
تھا۔ آپ نے "سٹیٹسمین" اور "ٹائمز" کے ساتھ احتیاطاً وغیرہ کا لفظ بھی لکھ دیا ہے۔ پس اگر
ان دونوں اخباروں کا آپ حوالہ نہ دے سکیں تو کسی دوسرے اخبار کا ہی جو دنیا میں شائع
ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ تاخیر نہ کریں گے اور فوراً مطلع کریں گے آپ نے ایک ایسا کمینہ
پن میری طرف منسوب کیا ہے جس کا مجھے کبھی وہم و گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ آپ کا اخلاقی و
شرعی فرض ہے کہ اس کا اثبات بہم پہنچائیں۔[1]

حقیقت حال شاید آپ کو معلوم نہیں کہ "الہلال" میں کوئی چیز چھپ نہیں سکتی جب
تک میں دیکھ نہ لوں۔ مصر اور ترکی وغیرہ سے جو خطوط آتے ہیں ان کا ترجمہ بھی جب تک میں دیکھ
نہیں لیتا، صحیح نہیں ہوتا۔ اکثر ان میں غیر ضروری تمہیدیں ہوتی ہیں یا غیر دلچسپ اطناب۔

---

[1] مجھے معلوم نہیں مولانا محی الدین احمد صاحب نے یہ کیوں لکھا مگر میرا خیال ہے کہ ان کی طبیعت کو جس
"الہلال" سے خاص مناسبت تھی وہ نہ ملا اس میں دلیل یہ کہ بیرونی مکتوب شائع ہوتے دیکھے جو
پہلے ہیرے جرائد میں بھی چھپتے تھے تو عام تاثر کی بنا پر بے تکلف لکھ دیا کہ یہ "سٹیٹسمین" یا "ٹائمز" وغیرہ کا
چربہ ہوتا ہے۔

اس لئے وہ صنعت کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ان حیثیتوں میں اس طرح کا پایا نہ معاملہ کیا جارہا ہو
تو وہ کوئی دوسرا نہیں کر رہا، خود میں کر رہا ہوں یا میر ساحلی بے اتنا کر کہ جنرل انگریزہ اور
عارف حکمت ایڈیٹر سبیل الرشاد جیسے اشخاص کر رہے ہیں کہ وہ سٹیٹسمین اور ٹائمز
اور دغیرہ سے پرانے مضامین لے کر بھیج دیتے ہوں۔ انگریزی مشکل ہے یہ کہنا بادہ ان اخبارات کو
پڑھ بھی نہیں سکتے۔

"ٹائمز" تو یہاں آتا نہیں، لیکن "سٹیٹسمین" میں روز پڑھتا ہوں۔ میں نے آج تک
سٹیٹسمین میں کوئی چیز باہر کی نہیں دیکھی۔ صرف گاہ گاہ وہ پہلے صفحہ میں نشان کی کوئی
مراسلت دیا کرتا ہے

بہرحال اس معاملے میں یا تو آپ نے کذب و تزویر کی انتہا کر دی ہے یا میں نے
اور دونوں کے لئے بہتر نہیں کہ ایسا کریں۔ پس براہ عنایت سٹیٹسمین "ٹائمز" اور
"وغیرہ" میں جتنے مضامین دیکھے ہوں ان سے مطلع کیجئے۔

دوسرے مقالات و مضامین آپ نے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے ایک
بات ایسی لکھی ہے جس پر مجھے ہنس دینا پڑا۔ آپ لکھتے ہیں "اعادہ شباب" جیسے مضامین
مس شینا پوپ کا مرقع حیات اور اس کے بعد کچھ نہیں لکھتے۔ گویا دونوں چیزیں اس درجہ
لغو اور مبتذل ہیں اور ان کی لغویت اس درجہ معروف و مسلم ہے کہ اصول بلاغت کے
مطابق صرف ان کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے لیکن آپ کو یاد نہیں رہا کہ ہر شخص نے علم و ادب
میں اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ وہ اتنا بلند پایہ اشارہ پالے۔ کم از کم میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
آخر اس سے مطلب کیا ہے؟ یعنی کیا یہ بھی "سٹیٹسمین" "ٹائمز" اور دغیرہ سے لیا گیا ہے

سلہ گویا یہ اصحاب اور ان کے علاوہ دوسرے اشخاص سنہ ۱۹۱۳ء میں الہلال کے نامہ نگار
خصوصی تھے۔ یہ الہلال کے دفتر کی طرف اشارہ ہے

یا ان کے مطالب میں کوئی سخت غلطی ہوئی ہے یا علمی اور تاریخی مضامین شائع کرنا بہت ہی بری بات ہے؟ اعادہ شباب والا مضمون نہایت ضروری اور وقیع تھا۔ اس عملیہ کا ذکر کثرت کے ساتھ انگریزی اخباروں میں ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت اردو میں کوئی مضمون ایسا شائع نہیں ہوا تھا جس سے اس کی طبی و علمی حیثیت واضح ہوتی۔ "الہلال" میں مذاکرہ علمیہ کا باب اسی غرض سے رکھا گیا ہے کہ وقت کے علمی مباحث و انکشافات اس میں شائع کیے جائیں۔ لیڈی سٹین ہوپ والا مضمون بالکل ایک نئی تاریخی معلومات ہے جو آج تک عام نظروں سے پوشیدہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں ایک شخص کا شام میں مقیم ہو جانا اور مشرقی زندگی اختیار کر لینا، غرابت کی دلچسپی کے ساتھ علم کا فائدہ بھی رکھتا ہے۔ یہ دراصل ایک کتاب سے ماخوذ ہے جس میں اس طرح کے بیالیس اشخاص کے حالات ہیں۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ ان میں سے نصف کے قریب الہلال میں شائع کر دیے جائیں۔

عزیز من، آپ کے دینی اخلاص اور عملی ذوق سے ہمیشہ میرے دل میں توقعات رہی ہیں لیکن میرا خیال تھا کہ علمی و ادبی ذوق سے بھی ان لوگوں کو کورا نہیں ہونا چاہیے، جنہوں نے میرے لکھنے پڑھنے کی زندگی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کم از کم ان معاملات میں رائے سلیم و صائب رکھنی چاہیے لیکن آپ نے یہ خط لکھ کر مجھے بہت مایوس کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک آدمی ان کوچوں سے بالکل ناآشنا ہو۔ معلوم نہیں آپ کو کیا ہو گیا ہے اور کیوں اس طرح کی خیرہ مذاقی کی نمائش کر کے مجھے مایوس کر رہے ہیں۔ آپ کہیں گے مجھے صرف قرآن حکیم کے مباحث کا شوق ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ ہر مضمون اسی موضوع پر ہو اور جو اس پر نہ ہو وہ لغو ہو۔ جن گوشوں کا ہم کو ذوق نہیں یقیناً وہ ہمارے میدان نہیں ہیں۔ لیکن دماغ میں اتنی صلاحیت ضرور ہونی چاہیے کہ ان کی نسبت رائے قائم کرتے ہوئے جہل یا ناواقفیت ظاہر نہ ہو۔ ایک درمیانی درجہ کی رائے دی جا سکے۔

پنجاب ہائی کورٹ کا فیصلہ: آخر میں آپ نے اس مضمون کا ذکر کیا ہے جو ذیل

کے فیصلہ[1] کے متعلق ہے۔ میں حیران ہوں، حضور آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نہیں سمجھتا تھا آپ کے عقل و فہم کا یہ حال ہو گا۔ مصیبت یہ ہے کہ آپ[2] نے تمام سطروں کی سطریں لکھ ڈالی ہیں اور ان کے ہر لفظ میں ایک غلط مقدمہ پوشیدہ ہے۔ کہاں تک میں صفحے سیاہ کروں؟ آپ لکھتے ہیں کیا آپ کی خدمت میں کوئی جواب دعویٰ یا اپیل کی گئی تھی کہ آپ نے یہ مضمون لکھا؟ اس میں بھی وہی بلیغانہ اجمال ہے کہ کچھ معلوم نہیں ہوتا، مطلب کیا ہے؟ غالباً مطلب یہ ہے کہ قانون کی بنا پر کیوں لکھا، در مختار اور ہدایہ کے حوالے کیوں نہیں دیئے؟ اگر یہی مطلب ہے تو بجز انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ دینے کے اور کیا لکھوں؟ اگر یہ معاملہ قانونی نہیں ہے تو کیا ہے؟ ہندوستان میں غیر قوموں کے ساتھ مسلمان بستے ہیں۔ ایک غیر حکومت قائم ہے۔ اسکا قانون ہے اس کے اصول ہیں اور اب اس سے خطاب و مطالبہ کی ضرورت پیش آئی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ صرف اس کے مسلم قانون کی بنا ہی پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اُسے اس سے کیا غرض کہ در مختار اور ہدایہ میں کیا ہے؟ اس سے بڑھ کر کوئی لغویت نہیں ہو سکتی کہ اس طرح کے مطالبہ کے وقت میں اپنے مذہبی احکام رٹنے جائیں۔ اگر میں قانونی حیثیت سے اس پر بحث نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟ یہ مذہبی احکام نہ بھی ایک لفظ ہے جو لوگوں نے سیکھ لیا ہے۔ نہ ان کی خبر ہے نہ ان کا

---

[1] جسٹس دلیپ سنگھ جو ہائی کورٹ پنجاب کا جج تھا اور اشارہ راج پال کی کتاب کے فیصلے کی طرف ہے

[2] آپ سے مراد مولانا مہر ہیں۔ اس سے غالباً وہ مضمون مراد ہے جو یکم اور دو جولائی ۱۹۲۷ء کے مشترکہ نمبر "البلال" میں زیر عنوان "پنجاب ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ" شائع ہوا تھا اس کا مفاد یہ تھا کہ جسٹس دلیپ سنگھ نے اصل کتاب کو قابل اعتراض قرار دیا، مگر ساتھ ہی لکھا کہ یہ کتاب دفعہ ۱۵۳۔ الف کی زد میں نہیں آتی جو حال ہی میں نئی بنائی گئی ہے۔ مولانا نے مضمون میں اول ثابت کیا تھا کہ یہ کتاب دفعہ ۱۵۳۔ الف کی زد میں آتی ہے پھر یہ تجویز پیش کی کہ اگر ایک عدالت عالیہ نے ایسا فیصلہ کر دیا ہے تو اب ایک صاف اور غیر مشتبہ قانونی دفعہ کی دل آزاریوں کے انسداد کے لئے بن جانا چاہئے۔

محل معلوم ہے نہ استنباط و انطباق کا سلیقہ ہو اس بارے میں شرعی حکم کوئی ایسا نہیں جو سود مند
وقت ہو۔ شرعی حکم کا یہ حال ہو کہ اگر اسلامی حکومت ہو اور ذمی، ذمہ کا غلط استعمال کرکے سبّ
شتم کریں، تو نظر بہ مصالح شرع و امت، قضا کے احکام مرتب ہوں گے اور قاضی کے لئے
ضروری ہوگا کہ تعزیر کرے۔ تعزیر کے مختلف مراتب ہیں اور حبس سے لے کر قتل تک کیا جاسکتا ہے؟
امام ابو حنیفہ کو قتل میں اختلاف ہو لیکن چونکہ تعزیر سے نہیں، اس لئے فی الحقیقت کوئی اختلاف
نہیں۔ لیکن بہ حالت موجودہ یہ باتیں کیا سود مند ہو سکتی ہیں؟ نہ اسلامی حکومت ہے نہ
ذمی ہیں، نہ ذمہ ہو۔ اس قسم کے تمام امور میں جب کبھی شرع کا نام لیا جائے گا تو صرف
ایک ہی چیز سامنے آئے گی یعنی قیام حکومت۔ اگر لوگ اس سے غافل ہیں اور موجودہ حالت پر
قانع، تو یہ اقتناع شرعاً ناجائز ہے۔ لیکن اس حالت اقتناع میں اگر ایک غیر مسلم کوئی ایسی
بات کہے یا لکھے جس پر بہ حالت حکومت ہم تعزیر کرسکتے تھے تو ظاہر ہے کہ ہم شرعاً کچھ نہیں
کرسکتے۔ صرف اس سے تنبہ و اعتبار حاصل کرکے قیام امر کے لئے سعی کرنی چاہیئے۔

بعض تقریریں | آپ لکھتے ہیں "سب النبی" ملک کا سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہو جو خالص
نسبی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے نہایت ہی عزیز بھائی ہمج و رعاع کی تقلید میں وارفتہ ہو کر عقل و
فہم سے الگ نہیں ہونا چاہیئے۔ میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ مجھے پیغمبر اسلام نے جو ذہنیت
بخشی ہے، اس کا فیصلہ یہی ہے۔ مجھے قطعاً اس سے انکار ہو کہ چونکہ تاریخ نوع بشر کے
سنہ ۱۹۲۳ء یا اس سے پہلے کسی برس میں ہندوستان کے ایک مجہول اور مجنون جیل کیڑے کوڑے
نے یا دو نے یا تین نے ایک یا چند رسالے لکھ کر تاریخ انسانیت کی سب سے بڑی شخصیت
کے خلاف بدزبانی کی ہے اس لئے اس کی ناموس کا خاتمہ ہوگیا اس کی عزت و حرمت کا سوال
پیدا ہو گیا ۔۔۔ مسلمانوں کی موت و حیات کی گھڑی آگئی اب رونا چاہیئے اور ہائے واویلے
مچانا چاہیئے اور چیخنا چاہیئے کہ مذہب کا سب سے بڑا معاملہ آگیا اور قیامت ٹوٹ پڑی۔
مجھے اس سے بھی قطعاً انکار ہے کیونکہ راج پال نامی کسی مجہول نے احمد شاہ شائق کی [illegible]

کرکے چار ورق چھاپ دیے۔ اس سے امہات المومنینؓ کی توہین کا سوال پیدا ہو گیا۔ ۔
ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [1] یہ وہ باتیں ہیں جو آپ
لوگوں نے (آپ اس لئے کہ پہلے میرا خیال یہ تھا کہ آپ بھی اس مقام میں پہنچ گئے ہیں)
علانیہ سورج کی روشنی میں کہی ہیں اور یہ آپ لوگوں کے "فدائیان رسولؐ" کی سب سے بہترین
تقریریں ہیں، جن کی رپورٹیں اخباروں میں چھاپی گئی ہیں اور ان پر فخر کیا گیا ہے۔ مجھے
اس سے قطعاً انکار ہے۔ انکار ہی نہیں بلکہ میں اسے اللہ کے برگزیدہ رسولؐ اور اس کی اہل
بیتؓ مطہر کی بڑی سے بڑی توہین سمجھتا ہوں، جو دنیا میں ہو سکتی ہے۔ "قطعی راج پال نے
نے عالم انسانیت کی اس سب سے بڑی ہستی کی اتنی توہین نہیں کی جس قدر آپ لوگ کر رہے ہیں
اور ایک لمحہ کیلئے بھی اپنے اعمال کا محاسبہ نہیں کرتے۔ آپ کو معلوم نہیں پچھلے دنوں کسی چیز نے مجھے
اتنی اذیت نہیں دی[2] جس قدر آپ کے فدائیان رسولؐ کی ان ناقابل برداشت تقریروں نے۔
کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا۔ لطف یہ ہے کہ آپ ازراہ خوش بیانی
مجھے بھی دعوت دیتے ہیں کہ اس میں حصہ لوں۔ میرے عزیز! اس کو غنیمت سمجھو کہ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [3] کرتا رہ گئے اور مجھے مناسب معلوم نہ ہوا کہ اس بارے
میں کچھ لکھوں، ورنہ مضمون طیار تھا اور کمپوز ہو رہا تھا۔ اب وہ رہا ہو جائیں اور جو کچھ ہونا ہے؟

---

[1] جن تقریروں کی جگہ اوپر اور یہاں نقطے لگائے گئے ہیں، ان میں وقت کی عام تقریروں کے خاص الفاظ
و تعبیرات درج تھے، لیکن اب انہیں دہرانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہم انہیں حذف کر کے نقطے لگا دینے
سے اصل مضمون مکتوب پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ [2] یہاں بھی انہیں خاص تقریروں کی طرف اشارہ ہے، جن
کے بعض فقرے مولانا نے اوپر لکھے تھے ان کی تعلی اسلئے کی گئی کہ وہ سرداروں نے جو کچھ کیا، اس کی ترجمانی
کتنی ہی کہ وہ کم ہی جانے بجز مسلمان مقرروں نے اس سلسلے میں جو تقریریں کیں اور ان میں جیسے
الفاظ و تعبیرات سے کام لیا، وہ نہایت رنجیدہ، اذیت افزا اور تعجب آمیز تھے۔ [3] یہاں ان مشہور
مقرروں کے نام درج تھے جو تقریروں ہی کی وجہ سے گرفتار ہو گئے تھے۔

ہو جائے، تو اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ مطابق لوگوں کو بتاؤں گا کہ انھوں نے کیسا غلط اور گمراہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

ناموسِ رسولؐ مجھے قطعاً اس سے انکار ہے کہ عوام کی یہ ذہنیت بنانے کی کوشش کی جائے کہ کوئی جو بات اچھالا اور انھوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا کہ اسلام کی کشتی ڈوب گئی۔ جہاں کسی کمینے نے کوئی بات کسی جلسے میں یا اخبار میں بیہودہ لکھ دی اور بس شور مچانا شروع کر دیا کہ اسلام ختم ہو گیا۔ آپ لوگوں کو نہ تو ان معاملات کی خبر ہے، نہ تعلیم عوام موقع دیتی ہے کہ وہ خود ہی روشنی میں حالات کو دیکھیں۔ آپ نہیں جانتے کہ اس طریقے سے مسلمانوں کی جماعتی ذہنیت کس طرح قتل کی جا رہی ہے۔ قومی خودداری، شرفِ نفس، علوِ نظر اور سنجیدگی و متانت کی جگہ ان میں خفیف الحرکتی، چھچھورا پن اور دون ہمتی کی تخم ریزی کی جا رہی ہے اس کا نام رکھا جاتا ہے فدائیانِ رسول کی فداکاری!

حیرت کی بات ہے کہ ایک صاف بات جو صحیح طریقہ سے کی جا سکتی ہے، اسے خواہ مخواہ غلط طریقے سے کیوں کیا جاتا ہے؟ جو لوگ اس طرح کا پاجی پن کرتے ہیں یقیناً قانون کو ان کا علاج کرنا چاہیے اور ضرور اس کا مطالبہ کرنا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اپنے قومی شرف کو تاراج کرنے کے لیے "ناموسِ رسولؐ" "ناموسِ رسولؐ" کا شور مچایا جائے۔

کیا لغویت ہے، اگر کسی ایسی کتاب کے لکھ دینے سے نعوذ باللہ رسولؐ کے ناموس اور امہات المومنینؓ کے ناموس کا سوال پیدا ہو جاتا ہے تو ان بے خود غلط لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں تو کب سے ناموس کا خاتمہ ہو گیا ہے، کیونکہ کم از کم دس ہزار کتابیں تو اعدائے اسلام نے لکھی ہوں گی اور ہندوستان میں آج نہیں اب سے ستائیس برس پہلے خاتمہ ہو چکا ہے جب احمد شاہ نے امہات المومنینؓ لکھ کر لودھیانہ مشن سے شائع کی تھی۔

صحیح رائے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک تحریک اکثریت کا معاملہ ہے شخصی طور پر
مجھے ہوتی ترین صرف ذہنی فرصت نہ سمجھنا لیکن آپ میرے عزیز ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب
کہ مجھ سے محبت و اخلاص کا رشتہ پیدا کر کے آپ نے میری سمجھ اور میری نظر حاصل کر لی ہے۔
آپ کا اس طرح کی بات لکھنا اور اس اسپرٹ میں لکھنا گویا ایک بڑی ہی مضبوط اور مسلمہ باتوں
کی طرف اشارات نکلے جا رہے ہیں، میرے لئے نہایت تکلیف دہ ہوا۔ خدارا اخبار فروشوں
کی تقلید اعمٰی میں اس طرح وارفتہ نہ ہو جائیے ہر معاملے پر اپنی دماغی روشنی سامنے لا کر رائے
قائم کرنی چاہیئے۔ اگر آپ لوگوں کا بھی یہی حال ہوا تو پھر آپ میں اور آج کل کے اخبار فروشوں کی
رایوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

امید ہے مضامین "شنشیمین" "اوورہالرز" کی نسبت پوری توجہ کر کے اطلاع
دیں گے۔ آپ کا یہ خط آ جائے تو پھر میں آپ کے دوسرے سوالات کا جواب دوں معلوم
نہیں آپ کے والد مع الخیر واپس آئے یا نہیں[1]۔

ابوالکلام

---

[1] یہ مولانا عبدالقادر مرحوم قصوری کے سفر حج کی طرف اشارہ ہے

(۷)

۱۹۔ اے میلی گنج سرکلر روڈ
کلکتہ ۲ جنوری ۲۵ء

عزیزی السلام علیکم

معلوم ہوتا ہے، ہارون آباد میں آپ کی ڈاک کا انتظام ٹھیک نہیں یا کوئی اور بات پیش آرہی ہے۔ عرصہ ہوا آپ کا خط آیا تھا جو میرے پہلے خط کا جواب تھا۔ جس دن خط ملا، اس کے دوسرے دن میں نے جواب بھیج دیا اور بتا دیا کہ جو آپ کے سابق خط میں مرقوم تھا لیکن پھر آپ کا خط ملا جس سے معلوم ہوا آپ میرے جواب سے بے خبر ہیں۔ میں نے مکرر سابق خط کا خلاصہ بھی لکھا اور نئی صورت کا بھی، لیکن اب پھر آپ جواب کا تقاضا کر رہے ہیں۔ یہ بات کیا ہے؟ یہ خط میں رجسٹرڈ بھیج رہا ہوں۔

میں ادھر ارادہ کر رہا تھا کہ جنوری سے "الہلال" ماہوار رسالہ کی شکل میں شائع کرنا شروع کر دوں کیونکہ لوگوں کا تقاضا حد برداشت سے گزر چکا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ماہوار رسالہ وہ مقاصد پورے نہیں کر سکتا جو ہفتہ وار رسالے سے متوقع ہیں اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہفتہ وار "الہلال" اپنی اصلی شان میں دوبارہ شائع ہو تو اس سے زیادہ کوئی علمی اور حقیقی کام نہیں ہو سکتا لیکن اس کی اشاعت جبھی کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ صحیح معنوں میں "الہلال" ہو اور اس کے لئے دو باتوں کا انتظام ضروری ہے۔

اولاً روپیہ کا

ثانیاً اس کا کہ کم از کم ایک سال تک میں براہ راست اسے وقت دوں اور میری نگرانی میں مرتب ہو۔ اس کے بعد ایڈیٹوریل اسٹاف کا سانچا ڈھل جائے گا تو پھر براہ راست نگرانی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

روپیہ کا آپ انتظام کر نہیں سکیں گے اور نہ میں کلکتہ بیٹھے ہوئے لاہور کے پرچے کی نگرانی کر سکوں گا

پچھلی مرتبہ اس لئے دہلی کا خیال ہوا تھا کہ میں وہاں تک جا سکتا اور ٹھہر سکتا تھا مگر افسوس کو منظور نہ تھا کہ معاملہ انجام پا لیے۔[1]

"الہلال" کے لئے قطعی ہے کہ ذاتی پریس ہو۔ کم از کم ایک لیتھو اور ایک ٹائپ کی مشین اور کافی لوازم۔ پھر پہلے سال کے لئے اتنا روپیہ ہاتھ میں رہنا چاہیئے کہ بوقت سکام ہوز کے پیرِ انتظامی اور تحریری اسٹاف کا سوال ہے اس کے مصارف مطلوب ہے۔ البتہ بظاہر بہت کہ مالی اعتبار سے اس کا نفع بخش ہونا قطعی ہے لیکن انفاق سرمایہ کے بعد۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اگر ستائیس ہزار روپیہ پریس پر اور پہلے سال کے مصارف پر لگا دیا جائے، تو دوسرے سال سے "الہلال" کم از کم چھبیس ہزار روپیہ سال کی خالص بچت کا کاروبار ہو جا سکتا ہے۔

آج کل کوئی کاروبار ایسا نہیں ہے جو اس درجہ منفعت بخش ہو سکے، لیکن مشکل یہ ہے کہ شخصی طور پر سردست اتنی رقم کا بھی انتظام مشکل ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ کسی نہ کسی طرح پرچہ نکال دینا، تو یہ کبھی بھی سود مند نہ ہوگا کیونکہ

---

[1] مولانا غلام رسول مہر صاحب نے لکھا تھا کہ اگر اجازت دیں تو "الہلال" لاہور سے جاری کر دیا جائے اس کے جواب میں یہ خط تحریر فرمایا گیا۔ اس کا کوئی حصہ مزید تشریح کا محتاج نہیں۔ مولانا نے ایک مرتبہ کلکتہ سے دہلی میں منتقل ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ دریا گنج میں مکان لے لیا گیا۔ کلکتہ سے پریس دہلی میں بھیجنے کا انتظام کر لیا گیا لیکن ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے بیٹے بشیر احمد کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مولانا کو دہلی آنے نہ دیا اور مشینیں پھر کلکتہ ہی میں نصب کر دی گئیں۔ غالباً اس کے بعد پھر ایک مرتبہ دہلی سے "الہلال" جاری کرنے کی تجویز ہوئی تھی۔

مقصود ایک پرچہ نکال دینا نہیں ہے بلکہ سچ مچ کو "الہلال" نکالنا ہے۔
میں نے اسی لئے مشترک سرمایہ کی تجویز لکھی تھی۔

یقیناً یہ صورت حال بہت ہی افسوس ناک ہے کہ تمام ملک ایک ایسے پرچے کا خواہش مند ہو اور اس کی بنیاد استوار نہ کی جائے، لیکن بغیر سرمایہ کے اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے اپنے اور میرے معاملے کی نسبت لکھا۔ وہ کوئی بحث طلب مسئلہ نہیں ہے میں ایک منٹ میں آپ سے طے کر لوں گا۔ سوال اصل کام کے اسباب کا ہے۔

ابوالکلام

۹

۱۹۔ اے، بالی گنج، سرکلر روڈ
کلکتہ ۳۰ ۹/۲۰ ۶

عزیزی

خط پہنچا۔ جس وقت سے یہ معاملہ میرے سامنے آیا ہے، میں برابر اس پر غور کر رہا ہوں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ اگر سرحد میں کوئی موزوں تعلیمی جگہ نکل آئے تو یہ آپ کے لئے زیادہ موزوں ہوگی۔ وہاں کام کا بہت بڑا میدان ہے اور کام کرنے والوں کی کمی ہے۔ اب آپ نے بمبئی کے لئے لکھا ہے تو میں بمبئی بھی لکھتا ہوں۔ انشاء اللہ میری جانب سے اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

میرا خیال اب بھی سرحد کے لئے ہے۔ وہاں کئی کام اصلاحی شروع کرنے ہیں اور بہ آسانی موزوں جگہ نکل سکتی ہے۔

پنجاب کانگریس کے جھگڑے بدستور چلے جا رہے ہیں۔ بہ ظاہر نا امید ہیں۔ امید نہیں کہ ستیہ پال پارٹی اور گوپی چند پارٹی کی کشاکش ختم ہو سکے۔ اس کا علاج صرف یہی ہے کہ وقتاً فوقتاً قطعاً پر عمل کیا جائے، لیکن مشکل یہ ہے کہ کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آپ کے والد اگر آمادہ ہوتے تو ایک نیا تجربہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ بھی تھک کر بیٹھ چکے ہیں۔

سکندر حیات نے بلا ضرورت ستیہ پال کے خلاف تقریر کر دی اور اب ایک نیا جھگڑا ان دونوں میں شروع ہو گیا۔

اپنے والد کو میرا سلام پہنچا دیجئے اور عزیزی اختر علی[1] کو بھی۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] مولانا عبدالقادر مرحوم بلکہ مولوی محی الدین احمد کے بھائی۔

(۱۰)

کلکتہ

۱۹ اپریل ۴۷ء

عزیزی السلام علیکم

دونوں خط پہنچے۔ دونوں کا جواب بہ ترتیب لکھتا ہوں:

۱۔ پنجاب کانگریس کے باہمی اختلافات یقیناً ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے ہیں۔ ضروری ہے کہ اصلاحِ حال کی کوئی فیصلہ کن کوشش کی جائے۔ میں نے ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر گوپی چند[1] دونوں کو لکھا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے موقع پر کلکتہ ضرور آئیں تاکہ بالمشافہ گفتگو ہو سکے۔ میں اصلاحِ حال کی پوری کوشش کروں گا، نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے۔

۲۔ آپ نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نے مسلم ماس کنٹیکٹ کے لیے روپیہ لیا اور اسے اپنی پارٹی کی راہ میں خرچ کیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ رقم کہاں سے لی گئی ہے، پراونشل کانگریس کمیٹی سے یا کسی دوسری جماعت یا فرد سے؟ اس بارے میں اگر کوئی نتیجہ بات سامنے ہو تو اس سے فوراً مطلع کیجیے۔

۳۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ پنجاب کے مسلمان اس لیے کانگریس سے بیدل ہو گئے ہیں کہ پنجاب اسمبلی پارٹی نے کیوں یونٹی کانفرنس[2] کی دعوت قبول کر لی۔ کانگریس کا طریقِ کار دونوں

---

۱ پنجاب کانگریس کی دونوں مخالف پارٹیوں کے لیڈر۔ ۲ اس سے مراد یونٹی کانفرنس ہے جس کا اہتمام سردار سکندر حیات مرحوم و مغفور نے ۱۹۳۰ء میں کیا تھا۔ سردار صاحب اس وقت پنجاب یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے جسے اسمبلی میں غیر معمولی اکثریت حاصل تھی۔ [illegible] سردار صاحب کی خواہش تھی کہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے تمام اختلافی مسائل بطریقِ احسن طے کرا دیں۔ اس کانفرنس میں دوسری پارٹیوں کے علاوہ پنجاب کی کانگریس پارٹی بھی شریک ہوئی تھی۔

میں ہمیشہ یہی رہا ہے کہ نتیجہ نکلے یا نہ نکلے لیکن ہر ایسی کوشش میں شریک ہونا اور اس
کے لئے ساعی ہونا۔ یہ طرز عمل تو کسی طرح بھی درست نہ ہوتا کہ کانگریس شرکت سے
انکار کر دیتی ۔

۴ . صوبہ سرحد میں انشاء اللہ نہایت آسانی سے ایک معقول جگہ نکل آسکتی ہے۔ میں اس میں
کوئی دشواری نہیں دیکھتا ضرورت صرف تھوڑے سے انتظار کی ہے آپ اس
معاملے کو اب مجھ پر چھوڑ دیجئے اور دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے

۵ . آپ نے مجھے کاموں میں مدد دینے کے لئے جو آمادگی ظاہر کی ہے، اس کے لئے
شکرگزار ہوں۔ میں انشاء اللہ رمضان المبارک کے بعد اس بارے میں آپ کو لکھوں گا

۶ . آپ نے جو تعلیمی رسائل لکھے ہیں، وہ ضرور بھیجیے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ یہ
نصاب میں داخل ہو جائیں ۔

تعلیمی اصلاح کا پورا معاملہ انجام دینا ہے اور ان میں ایک اہم کام تعلیمی نصاب کی
درستگی بھی ہے۔ اس بارے میں بعض دینی بنیادی تجاویز زیر ترتیب ہیں۔ انہیں ہو جانے دیجئے
پھر یہ کام سامنے آئے گا کہ تمام قدیم رسائل تعلیم کو جانچا جائے اور حسب ضرورت نئی چیزیں
لکھوائی جائیں۔ اس وقت میں خود آپ کو بتلاؤں گا کہ آپ کو کیا کرنا چاہیئے آپ نے والد
بزرگوار کو سلام پہنچا دیجئے نیز عزیزی احمد علی سلمہ کو .

ابوالکلام

(۱۱)

کلکتہ

۲۹ / ۱۱ / ۳۹ء

عزیزی

خط پہنچا۔ آپ نے اپنے ایک ابتدائی خط میں ڈاکٹر گوپی چند کی نسبت جو بات لکھی تھی۔ یعنی ماس کنٹیجنٹ کے لئے کسی رقم کو کہیں سے لینا اور اسے غلط طریقہ پر خرچ کرنا۔ میں نے منوا آپ سے دریافت کیا تھا کہ اس بارے میں تحقیق کر کے ضروری تفصیلات لکھئے اور اگر آپ لکھتے تو میں یقیناً اس بارے میں تحقیقات کرتا۔ آپ خط نہ لکھ سکے اور اس بارے میں میں نے بھی کچھ پوچھ گچھ نہ کی۔ لیکن یونٹی کانفرنس میں کانگرس پارٹی کی شرکت و عدم شرکت کے سوال کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس بارے میں آپ کا کچھ لکھنا کوئی اثر نہیں ڈال سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر گوپی چند کی شخصیت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ کانگرس کے مسلک کا مسئلہ ہے۔ اگر گوپی چند کا طریق کار غلط ہے تو اسے اسمبلی پارٹی کی لیڈری سے ہٹا دینا چاہیے۔ لیکن اس کی جگہ جو شخص بھی پارٹی لیڈر ہوگا اس کے لئے اصلی سوال بدستور یہی رہے گا کہ اگر امن و اتحاد کے لئے کوئی اقدام کیا جاتا ہے تو بہ حیثیت کانگرس پارٹی کے اس سے تعاون کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ کانگرس کا مسلک اس بارے میں قطعی اور صاف ہے۔ وہ ہر ایسے اقدام کی تعاون کرے گی خواہ اقدام کرنے والے کانگرسی ہوں یا نہ ہوں۔

آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ستیہ پال اور گوپی چند کے جھگڑوں میں میری ہمدردی ہمیشہ ستیہ پال کے ساتھ رہی۔ بہرحال میں گوپی چند کی پارٹی کے طرز عمل کو پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس معاملے میں محض گوپی چند کی چڑ سے ڈاکٹر ستیہ پال نے جو طرز عمل اختیار کیا، وہ اول دن سے غلط تھا اور خود کانگرس کو نہایت سخت نقصان پہنچانے والا۔

کیا عجیب بات ہے کہ یہ لوگ محض اپنی ذاتی مخاصمت کے لیے کانگرس کے سر مصیبت
لانی چاہتے ہیں اور اسے ایسے دلدل میں پھنسانا چاہتے ہیں، جس سے نکلنا پھر اس کا
دشوار ہو جائے۔

غلط طریق عمل مجھے تعجب ہے کہ آپ کے والد بھی اس رَو میں بہہ گئے۔ آپ کو تو چاہیے تھا
کہ اس معاملے میں محض پارٹی کا سوال نہ دیکھتے، اصل معاملہ کو دیکھتے، جو غلط صورت حال
ان لوگوں نے پیدا کر دی تھی، اگر میں اسے نہ سنبھالتا اور ورکنگ کمیٹی فیصلہ کر دیتی کہ کانگرس
پارٹی یونٹی کانفرنس سے الگ ہو جائے تو کیا نتیجہ نکلتا؟ یونٹی کانفرنس سے جو ناہوا تا تو شاید
کچھ نہیں لیکن تمام ملک میں کانگرس بدنام ہو جاتی کہ دیکھو، کس درجہ متعصب، حاسد اور
خود غرض ہے کہ سکندر حیات صلح و اتحاد کے لئے کوشش کر رہا ہے اور یہ ٹھکرا رہی ہے
اور کیوں ٹھکرا رہی ہے؟ محض اس جلن میں کہ پنجاب میں کانگرس منسٹری نہ بن سکی اور اگر
سکندر حیات کی کوشش سے اتحاد کی راہ نکل آئے تو غیر کانگرسی منسٹری کی پوزیشن بڑھ جائیگی۔

لطف یہ ہے کہ یہ عقلمند بلا تامل اپنے بیانات اور تجویزوں میں صاف صاف یہ کہہ
رہے ہیں کہ یونٹی کانفرنس سے اس لئے مقاطعہ کرنا چاہیے کہ سکندر حیات پارٹی معاملہ اتحاد
میں کامیاب ہو کر غلیاں نہ ہو جائے گویا اگر کمیونل تفرقے کا کوئی حل نکلتا ہو اور اس سے اندیشہ ہو کہ غیر
کانگرسی پارٹی کو کریڈٹ مل جائے گا، تو کانگرس کو چاہیے اس جلن میں آکر اس کی مخالفت
کرے اور جھگڑوں، خونریزیوں کو نشو و نما پانے دے!

میں نے ڈاکٹر ستیہ پال کو لکھا تھا کہ کلکتہ آجائیں۔ وہ آتے تو ان سے زبانی بہ تفصیل
باتیں کرتا، لیکن وہ نہیں آئے۔ ایسی خط و کتابت میں صفحوں کے صفحے کون سیاہ کرے؟
بہرحال مہلت ملی تو انہیں لکھوں گا کسی صوبے میں کانگرس کی اتنی مٹی پلید نہیں ہو رہی تھی
پنجاب میں۔

عرضی شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ملاقاتوں اور تقریروں کی نسبت ایسا طرز عمل یہ

کہ میں قطعاً اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، نہ میں نے آج تک کسی شخص کی سفارش کی ہے۔ کیونکہ اول تو اصولاً اس طرح کی مداخلت کا طریقہ غلط ہے کہ اوپر کو ایک آدمی سفارشیں بانٹتا رہے۔ ثانیاً یہ دروازہ کھلے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں۔ اسے اول دن ہی بند کر دینا چاہیئے۔

لیکن آپکا معاملہ دوسرا ہے اس بارے میں سعی و اہتمام اپنا ضروری فرض سمجھتا ہوں ممکن ہے یہ بھی کمزوری ہو لیکن اس کمزوری سے اپنے کو معاف نہیں رکھ سکتا میں نے اپنے بھانجے کی سفارش کرنے سے یک قلم انکار کر دیا اور اپنی بھانجی کے شوہر سے بھی صاف صاف معذرت کر دی، لیکن آپ کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں اور کروں گا۔

براہِ عنایت اس طرح کے الفاظ نہ لکھیئے جس سے بے اعتمادی مترشح ہو۔ کسی قدر توقف کیجئے اور دیکھیئے نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، ضروری ہے کہ اسے عمل میں بھی لاؤں۔ میں برابر خط و کتابت کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ عید کے بعد میں آپکو نتیجہ سے اطلاع دے سکوں گا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۲)

کلکتہ

۲۰/۱۲/۳۴ء

عزیزی

حکومتِ سرحد نے ابھی تک پبلسٹی کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں کیا ہے اور ضروری ہے کہ جلد از جلد ہو۔ مجھے خیال ہوا تھا کہ سر دست آپ کے لئے یہ صورت نکالی جائے۔ چنانچہ اس بارے میں میں نے زبانی عبدالغفار خاں سے کہہ دیا تھا اور ڈاکٹر خان سے خط و کتابت بھی جاری ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ عدم تجربہ کی وجہ سے کاموں میں بہت ہی سست رفتار ہیں۔ معمولی سی بات کے لئے کبھی بلا وجہ ہفتوں نکل جاتے ہیں۔ میں نے تمام ضروری مراتب انھیں لکھ دیے تھے، مگر ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں ملا ہے۔

آپ نے مجھے بمبئی کی نسبت لکھا تھا۔ اب خیال کرتا ہوں کہ وہیں صورت نکل سکے گی، اور شاید جلد نکل آئے، لیکن اس کے لئے بہتر صورت یہ ہوگی کہ آپ خود بمبئی میں موجود ہوں۔ میں نے کل ایک خط ٹائپ کرایا تھا کہ آپ کو بھیج دوں گا، لیکن اس وقت معلوم ہوا کہ مجوزہ ورکنگ کمیٹی (جسے الہ آباد میں کرنے کا مقصد تھا) بمبئی میں ہوگی، ۲۰ جنوری کو ۱۹۳۵ء۔ چونکہ اس صورت میں مجھے بہر حال بمبئی جانا پڑے گا، اس لئے خط نہیں بھیجا اور چاہتا ہوں کہ آپ ۱۸ جنوری کو خود بمبئی پہنچ جائیں اور وہاں مجھ سے ملیں تاکہ اپنی موجودگی میں آپ کو مسٹر کیمر سے ملا دوں اور زبانی گفتگو کر دوں۔ خط سے یہ طریقہ زیادہ موثر ہوگا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۳)

کلکتہ

۲۰/۱۲/۴۶ء

عزیزی

میں بمبئی ۲ر جنوری کو پہنچوں گا۔ اسی تاریخ سے ورکنگ کمیٹی ہے۔ کمیٹی غالباً تین چار دن تک چلے۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ آپ بھی ۲ ہی کو ضرور پہنچیں۔ ۳ ریا ۴ رکو بھی مل سکتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ میں آپ کو خود ملادوں۔ کمیٹی کے جلسے متواتر رہتے ہیں اور مشغولیت سخت ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اس لئے غالباً ۲۔۳ کو تو موقع بھی نہ لگے، اس کے بعد ہی نکلے۔ بہر حال آپ جب پہنچیں، مجھ سے مل لیں۔ پھر میں حسب حال انتظام کرلوں گا۔ میں نہیں کہہ سکتا، کہاں ٹھہرایا جاؤں۔ غالباً رجب علی پٹیل، وارڈن روڈ کے یہاں ٹھہروں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کے یہاں آجائیں۔ جہاں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوگا اور مجھے کارڈ بھجوادیں۔ میں باہر آکر مل لوں گا اور صورت کار طے پاجائے گی۔

ہو بہ جسر کا معاملہ چھوڑا نہیں ہے۔ بمبئی میں عبدالغفار خاں یا ڈاکٹر خاں ضرور آئیں گے وہ بھی پیش نظر ہے۔ البتہ خیال ہوا کہ بمبئی کی بات بھی پختہ کرلی جائے جو کام پہلے ہو گیا، اسے اختیار کر لیجیے گا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۴)

کلکتہ

۱۴ ستمبر ۳۸ء

عزیزی

خط پہنچا، زخم اور ورم اب تک چلا ہی جاتا ہے، بلکہ کل سے درد میں بھی زیادتی ہے۔ پھر سہ بارہ آج ایکس رے لیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اندر کوئی غیر معمولی خرابی کام کر رہی ہے۔

بمبئی میں مسٹر کھیرے سے میں نے پھر از سر نو باتیں کر لی تھیں۔ یہ بہتر ہوگا کہ آپ ایک خط ان کے نام اس مضمون کا بھیج دیں کہ میں یہاں انتظار کروں گا۔ جب آپ کی جانب سے حکم ملے گا آ جاؤں گا۔ خط و کتابت میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی جزئیات کا اثر طبائع پر بہت کچھ پڑتا ہے۔ خط جب لکھیے تو سنجیدہ عبارت میں، قرینے کے کاغذ پر اور ٹائپ کرا کے۔

مولوی محمد علی نے کاغذات بھیج دیے ہیں۔ میں ایک شخص کا منتظر ہوں جو کلکتہ سے باہر گیا ہوا ہے، وہ آ جائے تو نتیجہ سے انھیں مطلع کر دوں گا۔

پنجاب کانگرس کے جھگڑوں کے لیے، میں نے ورکنگ کمیٹی کی خواہش مان لی تھی کہ وقت نکالوں لیکن اب دیکھتا ہوں کہ صحت اجازت نہیں دیتی۔ نہیں معلوم موجودہ شکایت کب تک رہے، ممکن ہے دوبارہ عمل جراحی کی نوبت آ جائے۔ مجبوراً جواہر لال کو لکھ رہا ہوں کہ وہ پنجاب جائیں۔ اگر وہ نہ جا سکے تو پھر اور کسی کو بھیجوں گا اور ورکنگ کمیٹی کی تجویز بدلواؤں گا۔

قیام کے بارے میں میں نے کوئی خاص ارادہ تو نہیں کیا تھا لیکن میاں افتخار الدین نے پھر لکھا تھا کہ ان کے یہاں ٹھہروں۔ ڈاکٹر عالم صاحب کا بھی خط آیا ہے۔ بہرحال گا

آتا کوئی وجہ نہیں کہ میاں عبدالعزیز صاحب کی دعوت نظر انداز کرتا۔ ان کے یہاں بارہا ٹھہر چکا ہوں ان کی محبت و اخلاص کا شکرگزار ہوں[1]

مولوی عبداللہ صاحب کا خط اس بارے میں مل چکا ہے۔ شکرگزار ہوں، انھیں بھی میرا پیام پہنچا دیجیے۔ والسلام

ابوالکلام

---

[1] عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی تشریف آوری کی خبر سن کر میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا نے مولوی محی الدین احمد یا ان کے مرحوم مولانا عبداللہ مرحوم یا دونوں سے کہا تھا کہ مولانا ان کے ہاں ٹھہریں جیسا کہ پیشتر بارہا ٹھہر چکے تھے۔

(۱۵)

کلکتہ

۲۶/۳/۳۸ء

عزیزی

خط پہنچا۔ خط و کتابت کے بارے میں مسٹر کھیر یہ کیوں کہنے لگے کہ کاغذ کیسا تھا اور خط کیا تھا بھلا ان جزئیات پر کسی سے گفتگو ہی کب ہوتی ہے۔ میں نے محض احتیاطاً آپ کو ایک بات لکھ دی تھی۔

مجھے نقل بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ان سے خط و کتابت جاری رکھیں اب یقینی ہے کہ کوئی صورت نکلے گی۔

اخبار کی نسبت جس قدر گفتگو میاں افتخار الدین سے ہری پورہ میں ہو چکی ہے، وہ اس کے لیے کافی ہے کہ وہاں مزید گفتگو شروع کر دیں اور مجھے آپ یا وہ بذریعہ خط صورت حال سے مطلع کریں۔

فتح وال[1] کا حال اخبارات میں پڑھتے ہی میں نے ڈاکٹر گوپی چند کو لکھا تھا کہ تفصیلات بھیجیں نیز یہ کہ جب نذیر کانگرسی قتل ہو گئے اور ان پر حملہ ان لوگوں نے کیا تھا جنہیں کانگرسی سمجھا جاتا ہے، تو ہمارا فرض ہے کہ اس پر اظہار تاسف کریں اور لوگوں سے اظہار برات جو اس کا باعث ہوئے۔

مجھے جواب کا انتظار ہے

اپنے والد بزرگوار کو میرا اسلام شوق پہنچا دیجئے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] فتح وال ضلع امرتسر میں یہ حادثہ پیش آیا تھا جس میں روایت کے مطابق کانگرسیوں کے حملے میں کچھ غیر کانگرسی قتل ہو گئے

(۱۹)

کلکتہ

۲۵ ۴/ ۲

عزیزی

علیکم۔ ادھر ڈیڑھ سال کے بعد عرق النساء کا دورہ پھر پڑا تھا مگر اب افاقہ ہے۔ لمبئی سے اگر کوئی جواب نہیں ملا ہے تو بہتر ہوگا کہ ایک یاد دہانی کا خط اور لکھ دیجیے اور جواب کا انتظار کیجیے پھر بھی تاخیر ہو تو مجھے مطلع کیجیے۔ اس کے بعد لکھوں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔

سر سکندر حیات یہاں ملنے کے لئے آئے تھے۔ میں نے ان سے ضلع امرتسر کے حادثے کی تفصیلات پوچھیں۔ ان کا بیان معتدل اور معقول تھا اگرچہ ان کے بعض ساتھی جو تقریریں دیتے جاتے تھے فرقہ وارانہ جذبات سے خالی نہ تھے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اصل حادثہ کے لئے کسی ذمہ دار کانگریسی کو ملامت نہیں کی جا سکتی، البتہ جو کمزوری دکھائی گئی ہے، وہ صرف اس بات میں ہے کہ جس طرح صاف صاف اصل حادثہ کی شناخت کا اعتراف کرنا تھا اور حملہ آوروں کی مذمت کرنی تھی نہیں کی گئی۔[۱]

مسٹر چھج رام داس نے اپنے قیام لاہور کے تاثرات لکھے ہیں۔ مئی کے پہلے ہفتے میں وہ پھر جائیں گے اور کوشش کریں گے کہ کچھ کر کے آئیں لیکن سارا معاملہ کوئی کام جب تک کوئی ایسا آدمی آگے نہ کیا جائے گا جو ان گروہ بندیوں سے اوپر ہو کر از سر نو قدم اٹھا سکے، اصلاح حال مشکل ہے اور یہی چیز پنجاب میں نہیں۔ بسیار است و نیست[۲] کا حکم رکھتی ہے۔ رام داس مئی میں لاہور جاتے ہوئے تصور ٹھہریں گے تاکہ آپ کے والد کو اطمینان نصیحت کر سکیں۔ اقبال کی موت سے نہایت قلق ہوا۔[۳] بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

والسلام علیکم ابوالکلام

۱؎ یہی قصہ وال دالا حادثہ جس کا ذکر سابقہ مکتوب میں آچکا ہے۔ ۲؎ حافظ کے مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے یعنی نشست جو آدم ... عالم کہ بسیار است و نیست۔ ۳؎ اس قلق انگیز موقعے پر ایک بیان بھی دیا تھا جو چند الفاظ میں

(۱۶)

کلکتہ

۲۶/۶/۴۸

عزیزی

میں آل انڈیا کانگرس کے صدر دفتر میں ایک یا دو آدمی ایسے رکھنا چاہتا ہوں
جو صرف مسلمانوں کی شکایات کی تحقیقات و انسداد کے لئے مخصوص ہوں یعنی کانگرس کے
اندر جو شکایتیں پیدا ہوتی ہیں ان کے لئے۔ ان کی حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری کی ہوگی۔
کیا آپ سردست یہ کام پسند کروگے؟ لیکن ایک بات قابل غور ہے۔ یہاں زیادہ
سے زیادہ سو روپیہ ماہوار الاؤنس مل سکتا ہے۔ اگر میں زور لگاؤں تو شاید کچھ جزئی اضافہ
بھی ہو جائے۔ اس سے زیادہ مالی نوعیت متوقع نہیں، البتہ صدر دفتر سے انسلاک کی
اہمیت اور فی نفسہٖ وقت کی ایک نہایت ضروری خدمت کی انجام دہی اس جگہ کے حق
میں ہیں۔

اس پر بھی غور کرلو،

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱/۸۱)

کلکتہ

۵ جون ۴۸ء

عزیزی

خط پہنچا۔ ایک خط کل لکھ چکا ہوں، الٰہ آباد کی نسبت جو آپ کا تاثر ہے، وہ صحیح نہیں۔ وہاں بھی آپ اتنا ہی میرا سہارا پائیں گے، جتنا کلکتہ میں۔ علاوہ بریں جو صورت حال وہاں اس اعتبار سے پچھلے دنوں رہ چکی ہے، اب باقی نہیں رہی۔ اسے یک قلم بدل چکا ہوں

بہرحال اس ماہ کے اواخر تک یہ تقرر ملتوی رہے گا اور بمبئی کے لئے بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ اس ماہ کے اواخر تک آپ اور انتظار کرلیں۔ اس طرح اواخر ماہ میں پورا موقع ہو گا کہ جو صورت آپ چاہیں اختیار کی جائے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس وقت آپ کو سرحد کے لئے بھی لکھ سکوں۔ اس بارے میں پھر خط و کتابت کر رہا ہوں۔

ایک خط سے کل معلوم ہوا کہ میاں افتخار الدین یورپ گئے۔ جولائی یا اگست میں واپس آئیں۔ معلوم نہیں آپ ان سے ملے بھی تھے یا نہیں؟ برکلی پورہ میں انھوں نے اخبار کے لئے پورا عزم ظاہر کیا تھا۔ والسلام علیکم

ہاں مولوی محمد علی صاحب کے معاملہ کے لئے میں آپ کو پہلے لکھ چکا ہوں۔ ایک صاحب کا اس وقت انتظار تھا جو پٹیالہ گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کلکتہ پہنچ کر پوری کوشش کی اور کئی جگہیں ٹٹولیں، لیکن ان شرائط پر معاملت کی صورت نظر نہیں آتی۔ ہر شخص چھوٹتے ہی کہتا ہے کہ معاملہ قرض کا ہے مگر ضمانت مفقود۔ باقی رہی کاروباری نوعیت، تو جب کلکتہ اور بمبئی کی بھی جائیداد سے بھی بلا خطرہ صدی انتفاع مل رہا ہے، تو مشکل ہے کہ

کاروباری الجھاؤ کی ذمہ داریاں اس کے لئے برداشت کی جائیں۔

بہ حالت موجودہ اگر کوئی راہ نہیں نکل سکتی ہے تو صرف شراکت کی ہے، یا کوئی سرمایہ دار کام میں شریک کیا جائے۔ کیا مدراس میں کوئی ایسا آدمی نہیں نکل سکتا جو کاروبار کا واضح انتفاع دیکھ کر آمادۂ شراکت ہو جائے!

ابوالکلام

(۱۹)

کلکتہ

۱۹ اپریل ۳۸ء

محبی فی اللہ

آپ کا خط مل گیا تھا مگر منتظر تھا کہ بمبئی کا جواب آجائے تو لکھوں۔ اب جواب مل گیا ہے جو اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔

اب بہ یک وقت دونوں صورتیں کام میں لائی جاسکتی ہیں۔ بمبئی کی بھی اور دفتر کانگریس کی بھی۔ آپ معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے فیصلہ کرلیں۔

بمبئی میں اگرچہ بالفعل ڈیڑھ سو ہی کا معاملہ ہوگا، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ایک مرتبہ یہ کسی نہ کسی کام پر لگ گئے تو پھر مزید ترقی کی راہوں کا پیدا کرلینا مشکل نہ ہوگا۔ اشکال جو کچھ ہوا کرتا ہے۔ ابتدائی تقرر میں ہوا کرتا ہے۔

دفتر کانگریس کا معاملہ ایک قومی خدمت ہے اور اس کے ذریعے سے علائق کا پیدا ہونا ہے دونوں میں سے جو صورت آپ کے نزدیک مرجح ہو، اس کا عزیز موصوف کو مشورہ دیجیے اگر بمبئی والی صورت منظور ہو تو اسے فوراً اختیار کرلیا جائے۔ اگر الہ آباد والی مرجح نظر آئے تو مجھے پہلے بذریعہ تار مطلع کردیا جائے۔ میں بذریعہ تار مطلع کردوں گا کہ کب انھیں الہ آباد پہنچنا چاہیے۔ باقی پنجاب کے حالات کی نسبت آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ فرصت طلب ہے۔ ان شاء اللہ عنقریب اس بارے میں مفصل طور پر لکھنے کی کوشش کروں گا۔

مولوی محمد علی صاحب کا بھی خط ملا۔ حتی الوسع کوشش کر رہا ہوں۔ ان کے کاروبار کی خرابی سے صدمہ و قلق ہوا۔ کاش میری کوششیں بارآور نکلیں۔ والسلام

ابوالکلام

[illegible] سیاق سے صاف واضح ہے کہ یہ مکتوب مولوی محی الدین احمد کے نام نہیں بلکہ ان کے والد ماجد مولانا حبیب اللہ [illegible] ... [illegible] ... موصوف یعنی مولانا [illegible]

(۲۰)

کلکتہ

۸ جون ۴۸ء

عزیزی

کل آپ کا خط پاتے ہی یہاں سے اس مضمون کا تار بھیج دیا تھا کہ مسٹر منشی کے مشورے کے مطابق کام کرو: مطلب یہ تھا کہ اگر وہ واقعی کوئی دوسری انتظامی جگہ دلا سکتے ہیں، تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اسے اختیار کر لیا جائے۔

اب آپ کا دوسرا خط ملا،

مسٹر کھیر اور منشی کی جو باتیں آپ نے لکھی ہیں، ان میں کوئی بات پریشانی کی مجھے نظر نہیں آتی۔ یہ ظاہر ہے کہ انھوں نے کوشش کر کے آپ کے لئے جگہ نکالی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ کل کی کسی کو خبر نہیں۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ عارضی یا مستقل کسی شکل میں بھی مجوزہ [illegible] والی صورت موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو آپ کو فوراً کام شروع کر دینا چاہیے کیونکہ پہلے سے جو بات پیش نظر ہے، وہ یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سر رشتہ کام ہاتھ آ جائے۔ پھر آئندہ ترقی کی راہیں بہ تدریج نکالی جا سکتی ہیں۔

یہ یاد رکھیے کہ فوری طور پر کہیں بھی حسب مطلب جگہ نہیں نکلے گی۔ کام پر لگ کر راہ نکالنی پڑے گی۔

بہرحال پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر مسٹر منشی کوئی دوسری جگہ نکال لیں تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ اگر ایسی کوئی راہ نظر نہ آئے تو پھر ان باتوں پر بگڑنا نہ چاہیے۔ جو جگہ مسٹر کھیر نے قرار دی ہے، عارضی ہو یا مستقل، اس پر قانع ہو کر کام پر لگ جانا چاہیے۔ جب تک آدمی باہر ہے کوئی صورت نہیں نکلتی، جونہی اندر آ گیا پھر ہر طرح کی راہیں نکل آتی ہیں۔ والسلام

ابوالکلام

کلکتہ

۴ مئی ۳۸ء

عزیزی

خط پہنچا۔ اب تو آپ کو تجربے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ معاملہ کی انجام دہی میں کس قدر دقتیں پیش آتی ہیں۔ بہرحال اس کے سوا چارہ نہیں کہ صبر و برداشت سے کام لیا جائے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی کام میں لگ جانا چاہیئے اور دروازے کے اندر آجانا چاہیے پھر کچھ دنوں تک اپنے کاموں کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کرنا چاہیئے یہ دو باتیں انجام پا گئیں تو تیسرا مرحلہ انشاءاللہ خودبخود سامنے آجائے گا۔

کام پر لگ جایئے تو کچھ مدت تک ساری باتیں بھول کر صرف اپنے کام کا بہتر تاثر پیدا کیجئے اور ایسا طرز عمل اختیار کیجئے گویا اپنے مفوضہ کام کی سرگرم مشغولیت کے سوا اور کسی بات کے خواہشمند نہیں۔ جو بات مطلوب ہے وہ خودبخود دوسروں کی طرف سے کرینگے، آپ کو کہنا نہیں پڑیگا۔

مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ صرف یہ ہے کہ والد مرحوم کے نانا کا تعلق قصور سے تھا۔ اس سے زیادہ تفصیلات معلوم نہیں۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں تکمیل تعلیم کے لئے دہلی آئے جب کہ مرہٹوں اور انگریزوں میں جنگ جاری تھی اور شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ درس و تدریس میں داخل ہو گئے۔ پھر انہوں نے دہلی ہی میں قیام کر لیا اور قلعہ کی رکن المدرسین کا منصب ملا۔ اصل خاندان ہرات سے آیا تھا اور عہد کے قاضی القضاۃ کے عہدے پر بعض افراد مامور ہو سکتے تھے۔ [1]

---

[1] جس منتقید کا یہ جواب گیا ہے، وہ قصبہ کے نواحی کے ساتھ خاندان مولانا کے تعلق کے باب میں تھا جیسا کہ بیان مشہور ہوا۔ مولانا نے قزلباش کے والد کے نانا مولانا منور الدین قصبہ کو بغرض تعلیم دہلی آئے تھے پھر دہلی ہی میں توطن اختیار کر لیا مولانا کا خاندان ہرات کا باشندہ تھا اور بعض افراد خاندان جن میں سے مولانا منور الدین کے والد مولانا سراج الدین قاضی علی بھی قابل ذکر ہیں۔ وہ ہرات کا قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے۔ لودھیوں کے عہد میں سکھوں کے قبضے میں آگئی تو یہ قصبہ اس کے نواحی میں آباد ہو گئے۔

ترجمان القرآن کو سر دست نہیں چھاپنا چاہتا۔ پہلے تیسری جلد نکل جائے، جس کا کام جاری ہے، پھر دوسرے ایڈیشن کا اہتمام کیا جائے گا۔ مولوی بلگرامی کا انگریزی ترجمہ اگر موجود ہے تو اسے شائع کر دینا ضروری ہے[1]۔ دراصل اس کے لئے ندوۃ العلما محرک ہوا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ تکمیل نہیں ہو سکی۔ اگر بمبئی میں کوئی اہل خیر اس کے لئے آمادہ ہو جائیں تو ضرور اس کا اہتمام کیجئے۔

میرے خیال میں اس کے لئے کسی ایسے مقدمہ کی ضرورت نہیں جو بعض قرآن پر لکھا جائے۔ البتہ ترجمے کا مطالعہ کر کے ترجمہ کے محاسن پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیئے۔ والسلام علیکم

مولوی محمد علی کے لئے بھی کوشش جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کامیابی کی شکل نکالے۔

ابوالکلام

---

[1] اس سے بھی بالکل واضح ہے کہ دوسری جلد کے چھپ جانے کے بعد مولانا تیسری جلد کی ترتیب میں مشغول ہو گئے تھے اور یہ کہ سب سے پہلے چھاپنا چاہتے تھے حضرت یعنی عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کا انگریزی ترجمہ۔

(۳۳)

اگست سنہ ۱۹۳۶ء

عزیزی

۱۔ لا الٰہ الا اللہ الخ بظاہر شہادتین کا اختصار ہے۔ احادیث سے جو کلمہ ثابت ہوتا ہے وہ شہادتین ہی ہے۔ غالباً اسی عہد میں یہ جملہ بطور خلاصۂ شہادتین کے مستعمل ہونا شروع ہو گیا تھا

۲۔ حدیث میں یوم سے مراد دن کا تعین نہیں ہے بلکہ نفس تعطیل کا یعنی تعطیل کے دن کا انہیں حکم دیا گیا تھا جس سے وہ گمراہ ہو گئے اور سبت کی رعایت کھو دی[1]

۳۔ مولوی محمد علی کیلئے کوشش جاری ہے۔ غالباً قطعی نتیجہ ستمبر میں معلوم ہو۔

۴۔ مسٹر حسن کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہوں، اس سے زیادہ اس طرح کے معاملات میں دخل دینا معقول نہ ہوگا، تاہم ایک اور خط لکھ دیا ہے۔ والسلام علیکم۔

ابوالکلام

---

[1] یہ جواب مولوی محی الدین احمد کے خط کی پشت پر لکھ کر واپس بھیج دیا گیا۔ پہلا سوال جواب سے واضح ہے دوسرا سوال صحیح بخاری کی ایک حدیث کے متعلق تھا جو کتاب الجمعہ میں آتی ہے، یعنی حضرت ابوہریرہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے۔ ہاں انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی پھر یہ ان کا دن تھا جو ان پر فرض کیا گیا تھا انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور اللہ نے ہمیں اس کی ہدایت کی۔ پس وہ لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں۔ یہود کل اور نصاریٰ کل کے بعد۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ ہمارا دن ہے، اس کے بعد یہود کا ہفتہ یعنی سبت، اس کے بعد نصاریٰ کا سبت یعنی اتوار۔

(۲۳)

کلکتہ

۲۳ ۱۰ ۳۸ء

عزیزی

خط لکھنے میں دیر ہو مگر اصل معاملہ سے تغافل کبھی نہیں ہو سکتا۔

اگر پبلسٹی کا کام اس وقت تک نہیں شروع ہوا ہے تو آپ مسٹر پٹیل سے ملیے اور صورت حال بیان کیجیے۔ آپ کو صرف اس پہلو پر زور دینا چاہیے کہ پیش نظر اصلی کام یہی تھا، اور اسی کی ضرورت ہے اس لئے اگر اس میں تاخیر نہ ہو تو بہتر ہے

والسلام علیکم

مولوی محمد علی کے معاملے کیلئے بھی مسلسل سعی جاری ہے مطمئن رہیے۔

ابوالکلام

۴۴

کلکتہ

۲ اپریل ۴۶

حبی فی اللہ

خط پہنچا۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ تحریر سے پوری طرح کام نکلتا نہیں، اور نکالنا بھی چاہوں تو صحت کی کمزوری کاموں کا ہجوم اور طبیعت کی بے تعلقی ساتھ نہیں دیتی۔ مہینوں سے فرنیٹر کے کاموں کا تقاضا ہے مگر ابھی تک وقت نہیں نکال سکا غالباً اس ماہ کے آخر میں قصد کروں۔ ذہن میں یہ ارادہ محفوظ کر چکا ہوں کہ روانگی سے پہلے آپ کو تار دوں گا کہ ایک دو اسٹیشن ساتھ چلیے تاکہ بہ اطمینان باتیں ہو جائیں [1]

مولوی محی الدین کا معاملہ پیش نظر ہے۔ اس وقت تک جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا مگر اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ دائرہ کار میں داخل ہو جائے۔ اب سوچنا ہے کہ معاملہ کیوں کر حسب دلخواہ درست کیا جائے۔ میں غالباً ۸ کو بمبئی کے لئے نکلوں گا اور وہاں پٹیل اور کھیر سے فیصلہ کن گفتگو کر کے ایک فیصلہ کر لوں گا۔ اس بارے میں آپ بالکل مطمئن رہیں اور معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔

پراچہ [2] صاحب کا خط آیا ہے کہ آپ نے کانگرس میں آنا اور پنجاب کی صدارت کا بوجھ اٹھانا منظور کر لیا ہے اس بات سے مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ شاید پنجاب کانگرس کی اصلاح حال کے لئے اب کوئی راہ نکل سکے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] یہ مکتوب مولانا عبد القادر مرحوم کے نام ہے

[2] مشہور کانگریسی شیخ سراج الدین پراچہ

(۲۵)

کلکتہ

۲/۳/۴۶

عزیزی

پچھلے ماہ کا خط لاہور سے واپسی پر ڈاک میں ملا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو جزاء خیر دے آپکا اور میرا رشتہ ایسا نہیں ہے جو اس طرح کی کسی حالت سے بھی متاثر ہوسکے بالتیریں مجبور مبت ہوں۔ صحت ساتھ نہیں دیتی۔ ذمہ داریاں چھوڑ نہیں سکتا۔ اس لئے بےبس ہوکر رہ جاتا ہوں۔ خط وکتابت پابندی کے ساتھ کر نہیں سکتا۔ کوئی ضروری بات ہوتی ہے تو لکھتا ہوں۔ نہیں تو عذر خواہ رہتا ہوں۔

لاہور میں آپکے والد بزرگوار اور مولوی محمد علی، محمود علی کی موجودگی کی مسرت میں اگر کوئی کمی تھی تو آپ کی عدم موجودگی کی۔ تاہم بظاہر کمی تھی ورنہ آپ بھی میرے ساتھ تھے۔ اللہ تعالےٰ جلد سے جلد ایسے حالات بہم پہنچائے کہ آپ کو اطمینان خاطر نصیب ہو۔

سندھ کے متعلق یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ جہاں جہاں مسلمانوں پر سکھوں اور ہندوؤں کے مظالم ہوتے ہیں وہاں کے مسلمانوں نے گاندھی جی کو یہ نہیں کہا ہے کہ نہ تو ہم اپنی حفاظت کرسکتے ہیں، نہ ظلم سہہ سکتے ہیں، نہ اور کوئی راہ اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ آپ باہر کے مسلمانوں کو لاکر ہماری مدد کیجئے۔ اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس درجہ بے حس اور بے ہمت ہوکر ایسا کہے تو گاندھی جی یقیناً اسے یہی کہیں گے کہ تمہارے لئے ہجرت کے سوا چارہ نہیں، مگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کہتا۔ سندھ کے دیہاتی ہندوؤں کی جانب سے یہ بات کہی گئی اسلئے انہیں ہجرت کا مشورہ دیا گیا۔ ہجرت کا مشورہ دینے کے یہ معنی ہیں کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی حال ہو تو بجائے ہندوؤں سے جھگڑا کرنے کی خواہش رکھنے کے۔ اس کے بعد بھی امید نہیں ہو سکتا۔ ہجرت کرکے دوسری جگہ چلے جاؤ۔ اس معاملہ میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ باقی رہا آپ کا ہندوؤں کے عام حالات سے تاثر، تو اس سے کسے انکار ہے۔ یہ صورت حال تو ہر آنکھ کے سامنے ہے۔ والسلام علیکم۔

ابوالکلام

(۲۰۶)

کلکتہ

۲۶ / ۵ / ۳۹

عزیزی

میں ادھر مدت سے مجبور رہا اور اس وقت بھی مجبور ہوں۔ ایک خط سردار پٹیل کے نام بھیج رہا ہوں۔ یہ خط لیکر آپ جائیے اور ان سے ملیئے۔ اگر کارپوریشن میں کچھ ہو سکتا ہے تو صرف انہیں کی کوشش سے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ پیش نظر جگہ کے لئے آپ کامیاب ہو سکیں۔ نہیں معلوم وہاں کتنے امیدوار ہوں گے اور مقامی صورت حال کی کیا کیا کشمکشیں ہوں گی۔ بہرحال کوشش کرنی چاہیئے اور کوشش کا صحیح محل ولبھ بھائی پٹیل ہیں۔

اگر انجمن ترقی اردو والی بات بن گئی ہوتی تو آپ کے لئے سب سے بہتر صورت تھی۔ افسوس ہے کہ اس کی امید نہیں۔ آپ نے حیدرآباد کے لئے لکھا تھا۔ بلا شبہ وہاں صورتیں نکل سکتی ہیں جامعہ عثمانیہ کا میدان بھی کافی وسعت رکھتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا خط سر اکبر حیدری کے لئے کہاں تک موثر ہوگا؟ تاہم طیار ہوں کہ خط لکھ کر آپ کو بھیج دوں۔ میں نے آج تک کوئی سفارش نہیں کی۔ ممکن ہے موثر ہو لیکن اس کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ خود حیدرآباد جائیں۔ بغیر گئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ اس کے لئے طیار ہوں تو خط بھیج دوں۔

محمد علی کیلئے بھی اس وقت تک کچھ نہ ہو سکا۔ میں نے ڈاکٹر محمود کو پھر لکھا تھا اور جب کلکتہ مجھے دیکھنے آئے تو جس درجہ زور دے سکتا تھا اس میں کمی نہیں کی۔ مشکل یہ ہے کہ وہ بھی بغیر کسی مناسب صورت حال کے کچھ نہیں کر سکتے۔ شوگر سنڈیکیٹ کا معاملہ اس وقت چلا جاتا ہے اگر پرائس کے کنٹرول کا فیصلہ ہو جائے تو پھر ایک معقول جگہ بہ آسانی نکل آئے گی۔ ڈاکٹر محمود اس کے لئے کوشاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شکر کی گرانی کی موجودہ صورت حال نے اس کا موقع پیدا کر دیا ہے۔ اور غالباً صورت نکل آئے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

دوسرا مجموعہ

(مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام)

یہ مجموعہ انیس مکاتیب پر مشتمل ہے یہ سب مولانا عبدالماجد دریا آبادی
کے نام لکھے گئے اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۸ء تک مختلف اوقات میں مرقوم
ہوئے۔ مولانا عبدالماجد نے انہیں مع تصریحات مزدرسہ "نیا دور"
کے ایک نمبر میں شائع کرا دیا تھا۔ میرے نزدیک ان میں مزید توضیحات
ضروری تھیں جن کے سلسلے میں خود مولانا عبدالماجد کی تصریحات بھی پیش نظر ہیں
بہرحال یہ مجموعہ مولانا موصوف اور "نیا دور" دونوں کے شکریہ اور اعتراف
کے ساتھ یہاں شامل کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد نے جو تمہیدی عبارت تحریر فرمائی، وہ عموماً اور اس کا ابتدائی
حصہ خصوصاً میرے لئے سراسر تعجب انگیز تھا۔ میں عقیدت یا عدم عقیدت
دونوں میں غلو کو خلاف حق و انصاف سمجھتا ہوں اور خالص غیر جانبداری
کے نقطۂ نگاہ سے اس عبارت کے محرکات پر جتنا غور کیا، مولانا عبدالماجد کے
مقام و مرتبہ بلند سے اسے کوئی مناسبت نظر نہ آئی۔ تاہم ان امور پر بحث
کا یہ صحیح محل نہیں اور اس پہلو کو نظر انداز ہی کر دینا مناسب معلوم ہوا

(۱)

۱۰۷ میکلاؤڈ اسٹریٹ کلکتہ
۱۲ اگست ۱۹۱۲ء

صدیقی العزیز

والا نامہ پہنچا۔ آج صبح مہلت ملی تو عین صبح کے وقت کہ ذہن و دماغ کے سکون اور جمعیت کا وقت ہوتا ہے، اول سے آخر تک پڑھا۔ یقین فرمائیے کہ اس مخلصانہ اظہار رائے و مشورہ کے لئے کمال متشکر اور ممنون ہوں۔

میں آج ہی تفصیلی طور پر اپنی معروضات بھی عرض کرتا، لیکن خود بیمار ہوں اور گھر میں شب سے سخت علالت! دو چار دن کی مہلت دیجئے۔ انشاء جمعرات یا جمعہ کے دن خط لکھوں گا۔

آپکا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ مولانا شبلی یہیں مقیم تھے ان سے پوچھا تھا اور خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مولانا شبلی کی بھی "الہلال" کے لب و لہجہ کی نسبت وہی رائے ہے جو آپکی ہے۔[۱] ابوالکلام

۱؎ ظاہر ہے کہ یہ کانگریس کے خلاف "الہلال" کی شدید و تند پالیسی کا معاملہ تھا جیسا کہ خود مولانا عبدالماجد نے اس مکتوب کی توضیح کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ قابل ذکر امر ہے کہ "الہلال" ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو نکلا اور اس میں ہندستانی مسلمانوں کی سیاست پر سب سے پہلے ۴ اگست ۱۹۱۲ء کے پرچے میں بحث ہوئی۔ غالباً وہ پرچہ دیکھتے ہی مولانا عبدالماجد نے خط لکھ دیا، جس کے جواب میں یہ مکتوب رقم ہوا۔ مولانا نے کچھ دیر بعد "الہلال" میں ایک ضمیمہ چھاپ دیا تھا جس میں "الہلال" کی پالیسی کے متعلق خواندگان کرام سے رائے پوچھی گئی تھی۔ چنانچہ متعدد اصحاب کی رائیں "الہلال" میں چھپتی رہیں۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کے "الہلال" میں ایک نہایت دلچسپ نظم بھی بعنوان "جزر و مد" اس موضوع پر شائع ہوئی تھی۔ اس کا آخری شعر یہ تھا:

فیصلہ کرنے سے پہلے ذرا دیکھ تو لو "جزر" جیسا تھا، اسی زور کا "مد" ہے کہ نہیں

نظم کی اشاعت کے ساتھ ہی خوش ذوق آدمیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ مولانا شبلی کی ہے اور اب تو یہ ان کے اردو کلیات نظم میں شامل ہے۔ مولانا نے جمعرات یا جمعہ کے دن جو خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا، وہ غالباً لکھا ہی نہ گیا۔

(۲)

۱۰۷ میکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ

۷ دسمبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز

سخت نادم ہوں کہ خط کا جواب وقت پر نہ دے سکا اور خواستگاری معافی۔
امید ہے کہ آپ بصحت وعافیت ہوں گے یہ سن کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ نے
ایم۔ اے میں فلسفہ لیا ہے۔ نیز تحصیل زبان جرمن
مولوی عبدالقادر صاحب خط کا جواب نہیں دیتے۔ اخر تسر میں نے خطوط لکھے اور
عرصے تک انتظار کیا۔ میرا سلام پہنچا دیجیے۔

ابوالکلام

(۳)

کلکتہ

۲۶ مئی ۱۹۱۳ء

دیر آمدی اے نگار سرمست
زودت ندہیم دامن از دست

صدیقی الاعز

عطیۂ گرامی کا شکریہ۔ حسب الارشاد دو نمبروں میں شائع ہو جائے گا[۲]

[۱] سلطان سے مراد مولانا عبدالقادر بھاگل پوری ہیں، جیسا کہ مولانا عبدالماجد نے تصریح فرمائی ہے نیز بتایا کہ وہ احمدی مسلک کے تھے اور مولانا ان کے علم و نظر کے مداح تھے۔

[۲] یہ مضمون "فلسفۂ جذبات" کا ایک باب تھا جو بعنوان "خطہ کرب" البلال کی اشاعتوں ۱۸ جون اور ۲۵ جون ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا نے مضمون کے خاتمے پر تحریر فرمایا تھا۔ بقیہ اگلے صفحہ پر

کیا آپ اس کو پسند فرمائیں گے کہ "البصائر" کیلئے جو ایک ماہوار غیر سیاسی خالص علمی و دینی پرچہ ہوگا، جو جولائی سے شائع ہو جائے گا کوئی مضمون مخصوص اہتمام فرمائیں؛ کسی اہم علمی موضوع پر ہو، اور ترجمۃً یا بطور خود۔

ایک مستقل کتاب کے زیر ترتیب ہونے کی خبر پڑھ کر خوشی ہوئی۔

"البصائر" کے لیے مضمون ۱۵ رجون تک ضرور مل جانا چاہیے۔ پہلا نمبر بہت سے

(بقیہ صفحہ سابقہ)

مسٹر عبدالماجد ان معدودے چند تعلیم یافتہ ارباب علم میں سے ہیں، جن کو تصنیف و تالیف اور تراجم کا ذوق ہے۔ ان ابواب کی اشاعت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ طرز تحریر اور اسلوب بیان کے متعلق اگر ارباب علم مشورہ دے سکیں تو قبل از اشاعت کتاب اس سے فائدہ اٹھائیں مگر مجھے اس میں شک ہے کہ لوگ اس طرح کے مضامین کو غور سے پڑھنے اور رائے دینے کی زحمت گوارا کریں گے

آخر میں اپنی طرف سے یہ مشورہ دیا تھا کہ "خط و کرب" کی جگہ "لذت و الم" کے الفاظ زیادہ موزوں اور صحیح تھے اس لیے کہ "حظ" کے معنی لذت کے نہیں البتہ اردو اور شاید فارسی میں لذت کیلئے بولتے ہیں، لیکن با اعتبار لغت غلط ہے۔ نیز کرب، صرف حزن کے معنی میں آتا ہے اور الم میں اس سے زیادہ وسعت و تعمیم ہے۔

غرض اس تحریر میں کوئی چیز کسی غلط نگاہ سے قابل اعتراض نہ تھی مگر سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا عبدالماجد نے کس بنا پر فرمایا کہ

"الہلال" نے اسے چھاپا تو، لیکن بعض مصطلحات پر ایک تنقیدی نوٹ دے کر، جس کا لہجہ مولانا کے مکتوب کے محبت آمیز لہجے سے بالکل مختلف تھا۔

۲۵۔ جون ۱۹۱۳ء کا "الہلال" موجود ہے اور مولانا کی عبارت کا بیشتر حصہ اوپر درج کیا جا چکا ہے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اس کا اسلوب و لہجہ زیادہ محبت آمیز نہ تھا۔

مرتب ہے صرف بعض ابواب باقی ہیں لہ

مخلصکم الوفی

ابوالکلام

(۴۴)

کلکتہ

۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز

آپکا مضمون پہنچا لیکن آپنے کسی قدر جلدی کی۔ میری تحریر ناتمام ہے۔ میں

لہ مولانا "الہلال" کے علاوہ بھی کچھ چیزیں شائع کرنے کے خواہاں تھے مثلاً:

(ا) ایک ماہوار دینی رسالہ جس کا اعلان پہلے "البیان" کے نام سے ہوا تھا۔ اسے صرف تفسیر اور علوم و معارف قرآن کے لیے مخصوص رکھنا چاہتے تھے۔ پھر یہ قرار پایا کہ یہ رسالہ دینی و علمی ہونا چاہیے اور اس کا نام "البصائر" تجویز ہوا۔ زیر غور مکتوب میں اسی کا ذکر ہے۔ پھر "الہلال" میں اشتہار بھی دے دیا گیا تھا کہ البصائر شوال ۱۳۳۱ھ (ستمبر ۱۹۱۳ء) سے شائع ہونے لگے گا، بلکہ اس کا ایک عربی ایڈیشن بھی شائع کرنے کا ارادہ تھا لیکن البصائر نہ اردو شائع ہوا اور نہ عربی۔

(ب) بیچ میں روزانہ الہلال ہفتہ وار "الہلال" سے الگ جاری کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ پھر چند روز تک روزانہ "الہلال" ایک ورق کی شکل میں چھپتا بھی رہا، جس میں خبریں ہوتی تھیں اور میرے علم کی حد تک یہ کلکتہ سے باہر نہ گیا۔ مگر اس سلسلے میں بھی قدم آگے نہ بڑھایا جا سکا۔ اس لیے کہ جن [illegible] کی ضرورت تھی، وہ مولانا کو میسر نہ آ سکے اور صرف ہفتہ وار "الہلال" کسی نہ کسی طرح شائع ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں دو ہزار کی ضمانت ضبط ہونے کے باعث بند ہو گیا۔ اس لیے کہ آگے دس ہزار کی ضمانت دیے بغیر چارہ نہ تھا اور وہ بھی یقیناً [illegible] ضبط ہو جاتی۔

اُسے بجنسہ الہلال میں شائع کر دوں گا اگر اپنی بقیہ تحریر کے ساتھ یا بعد[1] آپ کے غصّے نے بڑا لطف دیا۔

---

[1] اب یہاں تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ فرما لیجئے۔ مولانا عبدالماجد نے جو تحریر بھیجی، ۱۰، ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء کے الہلال میں چھپی۔ اس میں غصے اور خفگی کی کوئی بات نہ تھی۔ سب و لہجہ بھی بالکل علمی تھا۔ تحریر کا مفاد یہ تھا کہ "حظ، جس انگریزی لفظ کے لیے استعمال ہوا ہے اس کا ابتدائی مفہوم حواس ظاہری کو آرام پہنچانا ہے" اسی طرح "کرب" جس لفظ کیلئے استعمال ہوا۔ اس کا مفہوم "اجسام حیاتی میں ناگوار کیفیت" ہے جب یہ الفاظ وضع ہی مادی و حسی کیفیات کیلئے ہوئے تھے، اگرچہ بعد میں ان کا اطلاق وسیع تر ہو گیا تو ان کی جگہ "لذت و الم" کو کیوں نہ استعمال کیا جائے جن میں بہ نسبت حسی کے نفسی انبساط و انقباض کا مفہوم زیادہ پایا جاتا ہے؟ ساتھ ہی یہ فرمایا تھا کہ جب خط اردو کتب لغت مثلاً فرہنگ آصفیہ اور اشعار میں بہ معنی خوشی و انبساط مستعمل ہے تو کم از کم میری رائے ناقص میں یہ سوال کسی قدر غیر متعلق ہے کہ عربی لغت میں حظ کے معنی صرف حصّے کے ہیں۔

مولانا نے اس کے جواب میں جو تحریر ۷ اگست ۱۹۱۲ء کے الہلال میں شائع فرمائی، اس کا مفہوم یہ تھا:

ا۔ لذت و الم، ٹھیک وہی مفہوم ادا کرتے ہیں، جو انگریزی کے الفاظ پلیژر اور پین ادا کرتے ہیں

ب۔ فارسی میں بھی تقیناً "حظ" بہ معنی لذت و مسرت استعمال نہیں ہوتا، مثلاً غالب:

دگر ز ایمنیٔ راہ و قرب کعبہ چہ حظ ظاہر ہے

ج۔ آپ علماء اپنا نفسیات پر کتاب لکھ رہے ہیں، "مثنوی زہر عشق" یا "فریاد داغ" نہیں لکھ رہے، مطلب یہ کہ علمی اصطلاحات جس زبان سے آئی ہیں، ان کے بارے میں تحقیق اسی زبان کی بنا پر ہونی چاہئے۔ مولانا نے صاف لکھا تھا کہ دو چیزیں ہیں اور دونوں بالکل مختلف حکم و حالت رکھتی ہیں۔ ایک مسئلہ تو عام طور پر اردو زبان الفاظ کے استعمال اور ان کے معانی کے قرار دینے کا ہے، دوسرا علمی اصطلاحات کا۔ دوسری صورت میں اب تک اردو عربی کے تابع ہے اور عربی الفاظ کو عربی ہی کے متعارف معانی میں استعمال کرنا پڑے گا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

لکھنؤ میں مولوی ظفر حسن صاحب[1] کے متعلق آپ سے گفتگو ہوئی تھی اور یہ بات قرار پاگئی تھی کہ وہ کچھ دنوں کے لئے آکر یہاں ٹھہریں، لیکن پچھلے دنوں ان کا ایک خط مراد آباد سے آیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس قرار داد کی کچھ خبر نہیں۔ اب غالباً وہ لکھنؤ میں ہونگے جو گفتگو آپ سے ہوئی تھی، وہ ان سے فرما دیجئے۔ اب تک اس کا پورا موقع باقی ہے کہ وہ تشریف لائیں۔

ہاں یہ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل مسلم گزٹ کا ایڈیٹر کون ہے[2]؟ ابوالکلام

(بقیہ منقولہ سابقہ) مولانا عبدالماجد نے پھر ایک مراسلہ بھیجا جس میں "خط بہ معنی لزنت" کیلئے غیاث اللغات کے علاوہ مستشرقین یعنی پامر و ملکس شبلین گاس کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔ ۲۰ راگست کے الہلال میں چھپا۔ نیز اس سلسلے میں مولانا اکبر الٰہ آبادی اور مولانا خدا بندہ جون پوری کی تحریریات شائع ہوئیں۔ پہلا حصہ ۱۰ ستمبر کے نمبر میں اور دوسرا یکم اکتوبر کے نمبر میں۔ پہلا حصہ نکلنے کے بعد ہی مولانا عبدالماجد نے وہ خط بھیج دیا جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ آپ کے غصے نے بڑا لطف دیا۔

یہ مراسلہ ۲۲ راکتوبر کے "الہلال" میں معہ جواب شائع ہوا۔ مولانا عبدالماجد کا یہ مراسلہ واقعی غصے کی حالت میں لکھا گیا تھا۔ عام اسلوب تحریر افسوسناک ہونے کے علاوہ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مولانا نے اپنی خطیبانہ سحربیانیوں سے ایک بہت بڑی جماعت کو مرعوب و مسحور کر رکھا ہے، مگر آپ کے خالص کمال علمی کا ثبوت اب تک باوجود سعی و تلاش نہیں ملا۔ نیز مذہب اور سیاست تو مدت سے آپ کی تیغ خطابیات کے زخم خوردہ ہو رہے ہیں اب مہربانی فرما کر علمی مسائل کی جان پر تو رحم فرمائیے۔

مولانا نے اس کے جواب میں بھی متانت و ثقاہت قائم رکھی اور کوئی غیر مناسب بات نہ کہی۔ کہا تو یہ کہ جو لوگ چالیس سال سے علمی توقعات کا مرکز چلے آتے ہیں، وہ اگر علمی کمالات کا ثبوت دینے میں مقصر رہے تو ان کے لئے افسوسناک ہے۔ مولانا عبدالماجد کے اس جوش مخالفت نے تو تغلسو اجتماع میں ظاہر کیا، تاہم مولانا کی روش میں فرق نہ آیا۔ ۱۔ ظفر حسین خان جو بعد میں خان بہادر اور انسپکٹر آف سکولز بنے، شیعہ کالج میں پرنسپل رہے۔ مولانا انھیں الہلال میں لینے پر آمادہ تھے۔ ۲۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی۔

(۵)

کلکتہ

۵ / اکتوبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز

آپ کا خط پہنچا۔ یہ تو میں نے پیشتر ہی آپ کو لکھ دیا تھا اور اجازت طلب کی تھی کہ مضمون کی اشاعت میں تاخیر ہوگی اور لکھا تھا کہ میں اپنی تحریر کے اختتام کے بعد جو نمبر وار چھپ رہی ہے، اسے صحیح کردوں گا۔ چنانچہ اس کی نسبت آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ادھر میں اور معاملات میں اس طرح مصروف رہا کہ بقیہ مضمون کے لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا بانکی پور چلا گیا تھا وہاں سے واپس ہوا اور بیمار رہوں۔ پس آپ کی تحریر آئندہ اشاعت میں شائع ہوگی[۱] مع میرے مضمون کے تیسرے اور آخری نمبر کے۔ رہا یہ کہ آپ اس کو دوسرے اخبارات میں شائع فرمائیں گے، تو شاید میں نے اب تک کوئی کوشش اس طرح کی نہیں کی ہے کہ لوگ اپنے مضامین "الہلال" کے سوا دیگر رسائل میں شائع نہ کریں۔ یہ آپ کے جس طرح اس وقت ممکن تھا جب آپ نے وہ تحریر مجھے بھیجی، اب بھی ممکن ہے اور آئندہ بھی ممکن رہے گا۔

آپ جس اخبار میں شائع کرنا چاہیں شائع فرمادیں، مجھے تو کوئی عذر نہیں البتہ بصورت عدم اشاعت سامنے بڑھ کے بعد والے پرچہ "الہلال" میں درج ہو سکے گی اور بصورت اشاعت اس کا تذکرہ بحوالہ اخبار شائع کنندہ۔

آپ کو معلوم نہیں مراسلات وغیرہ "الہلال" میں ہمیشہ تاخیر سے شائع ہوتے ہیں کئی

---

[۱] یہ اسی تحریر کی طرف اشارہ ہے، جس کے سلسلے میں مکتوب ۴ لکھا گیا۔ اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی اور بہ ظاہر مولانا عبدالماجد نے اس کی اشاعت کا مطالبہ کیا نیز لکھا کہ اگر آپ نہیں چھاپیں گے تو دوسرے اخباروں میں بھیج دی جائے گی یعنی کسی دوسرے اخبار میں

مضمون ایک ایک ماہ کے بعد نکلتے ہیں۔ یہ بدنظمی ہو یا سوء قصد لیکن ایک عام بات ہے۔
مسلم گزٹ تو بالآخر بند ہی ہو گیا، لیکن افسوس ہے کہ بے موقع اور بہت بری طرح۔
مولوی ظفر حسن صاحب کا خط آیا۔ انھوں نے اپنی موجودہ حالت جو بیان کی ہے مجھے ہمدردی
ہے۔[1] خدا انھیں کامیاب فرمائے۔ ایسی صورت میں تو واقعی ان کا تشریف لانا مشکل معلوم
ہوتا ہے۔

ابوالکلام

(۶)

رانچی (بہار)

۱۵۔ مارچ ۱۹۱۶ء

صدیقی العزیز۔ السلام علیکم

یاد فرمائی کے لیے ممنون و شکر گزار اور تاخیر کے لیے خواستگار معافی ہوں، امید کہ
معذرت مقبول ہوگی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اگر وجود میں آ گئی تو بلاشبہ موجودہ زمانے میں ہندستان
کا سب سے بڑا علمی کام ہوگا۔ البتہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے اشخاص کی کمی ہے اور ضرور ہے
کہ کچھ عرصہ تک مطلوبہ نتائج پیدا نہ ہوں لیکن ابتدا میں تو کوئی کام بھی بالانتظار و تدریج متوقع
نتائج پیدا نہیں کرتا۔ کام صحیح اور مفید ہونا چاہیے۔ نقائص رفتہ رفتہ دور ہو جائیں گے۔
عدم سے وجود مع النقائص بہرحال بہتر ہے اور اشخاص کے فقدان کا بھی علاج یہی ہے کہ کام
ہو۔ آپ نے لکھا ہے کہ سردست صرف معمولی درجہ کی فلسفہ و منطق کی کتابوں کو لکھنا پڑے گا اور
اس لئے طبیعت لگتی نہیں، لیکن یہ تو ناگزیر ہے اور ترتیب مبادیات و اوائل کا کام بھی
منتہیوں ہی کو کرنا پڑے گا۔ مبتدیوں کے لئے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اگر آپ کے قیام و تعلق

---

[1] مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں کہ ان کے عالم کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ خانگی پریشانیوں میں مبتلا تھے

سے عثمانیہ یونیورسٹی نے اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ ہر فن میں مبادیات کا سلسلہ مکمل ہو گیا تو کیا یہ کوئی چھوٹا کام ہے؟[1]

آپ نے فلسفہ کے ساتھ منطق کا بھی ذکر کیا ہے منطق میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا رسالہ "مبادی الحکمتہ" ہر لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔ دربیان اور مسائل میں اس درجہ کا ہے کہ ہمارے قدیم عربی نصاب کے ابتدائی رسائل ایسا غوجی وغیرہ سے لے کر قطبی تک کا قائم مقام ہو سکتا ہے اور حسن بیان و تعبیر و ترتیب و امثلہ کے لحاظ سے بدرجہا ان پر فائق۔ انگریزی کا حال مجھے معلوم نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس کے بعد کا صرف ایک رسالہ درست اور مرتب کیا جائے۔ مجوزہ یونیورسٹی میں ہمارے عربی مدارس کی طرح منطق ابتدا ہی میں نہیں رکھی جائے گی بلکہ جدید نظام تعلیم کے مطابق، ابتدائی سنین کے گزر جانے کے بعد، اور اس وقت کے لیے "مبادی الحکمتہ"

---

[1] مولانا کو اپریل ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے اخراج کا حکم ہوا۔ بعض دوسری صوبائی حکومتیں پہلے ان کا داخلہ بند کر چکی تھیں۔ صرف حکومت بہار کی جانب سے ایسا کوئی حکم ممانعت صادر نہ ہوا تھا۔ چنانچہ مولانا رانچی چلے گئے وہیں کچھ دیر بعد انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ مکتوب اسی زمانے میں کا ہے، جب مولانا رانچی میں نظر بند تھے جیسا کہ خود مکتوب میں فرمایا گیا ہے۔ مولانا عبد الماجد بہ سلسلہ تالیف و ترجمہ حیدرآباد پہنچ چکے تھے جہاں جامعہ عثمانیہ کی تیاری کے سلسلے میں مختلف علوم کی معیاری اردو کتابیں زیر ترتیب تھیں۔ مولانا موصوف فرماتے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں جو تلخ و تند مباحثہ "الہلال" کے صفحات میں بعض اصطلاحات کے پیچھے ہو پڑا تھا، اب مکتوب الیہ کو اس پر ندامت و تاسف تھا اور اپنے خط میں مولانا سے معذرت کی تھی۔

ضمناً اپنے مشاغل کا بھی ذکر کر دیا۔ چنانچہ مولانا نے ان مشاغل کے سلسلے میں اپنے خیالات قدرے تفصیل سے بیان فرمائے۔

بہت اچھی کتاب ہے۔

لیکن یہ صرف مقدمات و مسائل تک ہے مباحث کیلئے اس کے بعد کی دوسری کتاب تیار کرنی چاہئے۔ متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل مفید ہوں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ "تین چار سال ادھر شاید بعض غلط فہمیوں کی بنا پر دلوں کی صفائی میں زنگ آ گیا تھا" آپ نے دل کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ ہونا چاہیئے مفرد میں آپ کو پوری سچائی کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ میرے حافظہ میں کوئی گذشتہ زمانہ ایسا موجود نہیں ہے۔ جس میں آپ کی جانب سے میرا قلب زنگ آلود رہا ہو۔ دنیا میں باہمی علائق کے تکدر کے مختلف اسباب ہوا کرتے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا کہ اس قسم کا کون سبب پیدا ہو گیا تھا؟ کیا اس پورے زمانہ میں آپ نے کوئی بات میری جانب سے دیکھی یا سنی؟

میں نے تو جب کبھی کوئی بات مولانا شبلی مرحوم یا بعض دیگر حضرات سے نقلاً سنی تو خدا شاہد ہے کہ اس کا کوئی اثر اپنے قلب میں حسب عادت محسوس نہ کیا بلکہ اس کو کسی ایسے سبب پر مبنی خیال کیا جو معلوم نہیں۔ اس طرف سے جناب بالکل مطمئن رہیں۔ میں آپ کے جن اوصاف کا علماً یقین کرتا ہوں اور جو باعث نیاز مندی ہو سکتے ہیں، جب تک ان میں تغیر نہ آئے میری نیاز مندی متغیر نہیں ہو سکتی۔ ویسے تو الحمد للہ مجھ کو کوئی وجہ شکایت نہیں لیکن اگر ہوتی بھی تو انشاءاللہ آپ مجھ کو کبھی شاکی نہ پاتے۔

زنجیں عشق بہ کوئیں صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

آپ کی توجہ فرمائی بالکل مخلصانہ اور بے لاگ ہے۔ موجودہ حالات میں کہ نظر بند و معتوب حکومت ہوں، آپ کے لئے کوئی وجہ مراسلت نہیں ہو سکتی تھی الا یہ کہ مخلصانہ و بے غرضانہ لطف و نوازش و مقتضائے خلق بلیغ۔ اس بات کو محسوس کرتا ہوں اور ممنون و متشکر ہوں[1]

---

[1] مولانا کے گرامی نامہ اخلاق کی سیکڑوں دستاویزیں موجود ہیں، انہیں سے ایک دستاویز یہ بھی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

آپ نے جناب مولانا حمید الدین کا ذکر خیر فرمایا ملاقات ہو تو اس دور افتادہ کا سلام شوق عرض کر دیجئے۔

"معارف" آتا ہے۔ نہایت شوق و دلچسپی سے "مکالمات برکلے" کا سلسلہ پڑھ رہا ہوں اور آپ کے حسن بیان و قوت نقل علوم و تسہیل مطالب کی تعریف نہیں کر سکتا۔ آپ انشاء اردو کیلئے وہ کام کریں گے جو اب تک کسی سے نہیں ہوا یعنی نقل علوم۔ سرسید مرحوم کے مجمع نے اردو کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں، لیکن اس مد میں اب تک کچھ نہیں ہوا۔ حکیم عباری صاحب تصورات کلیہ بھی اس بارے میں اتنی ہی مدح کے مستحق ہیں جس قدر کہ آپ۔

فقیر ابوالکلام

(بقیہ صفحہ سابقہ) ملاحظہ فرمایئے، مولانا عبدالماجد نے خفگی کے جوش میں کیا کچھ لکھ دیا تھا پھر خود اپنے مکتوب میں مولانا نے اشارہ کر دیا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم یا بعض دوسرے اصحاب سے نقلاً بعض باتیں ان تک پہنچتی رہیں بایں ہمہ فرماتے ہیں۔

ا۔ آپ کے جن اوصاف کا اعلان یقین ہے، جب تک وہ متغیر نہ ہوں، نیازمندی متغیر نہیں ہو سکتی۔

ب۔ کوئی شکایت نہیں اگر ہوتی بھی تو آپ مجھے شاکی نہ پاتے۔

لہ مولانا حمید الدین مرحوم فراہی اس زمانے میں دارالعلوم کالج حیدرآباد کے پرنسپل تھے۔

لہ انگلستان کے مشہور فلسفی بشپ بارکلے کے مکالمات کو مولانا عبدالماجد نے اردو کا لباس پہنایا تھا اور پہلے وہ ترجمہ "معارف" کے غالباً پانچ نمبروں (نومبر ۱۹۱۰ء - مارچ ۱۹۱۸ء) میں شائع ہوا تھا۔ پھر کتابی شکل میں چھپ گیا۔

ﷺ مولانا عبدالباری ندوی، جن کا مضمون "تصورات کلیہ" پر معارف کے دو نمبروں مارچ و اپریل ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے بارکلے کی مشہور کتاب کا ترجمہ "مبادیٔ علم انسانی" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب بھی اسی زمانے میں چھپ گئی۔

(۷)

رانچی (بہار)
۱۴ر مارچ ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز السلام علیکم
کل خط بھیج چکا ہوں لیکن ایک غلطی ہوگئی جو آپ کو حیران کر دے گی۔ کل ایک خط بمبئی کے ایک تاجر کتب کے نام بھی لکھا اور اس کو فہرست کی قیمت پانچ آنے بھیجنی تھی۔ غلطی سے پانچ آنے کے ٹکٹ آپ کے خط میں رکھ دیئے گئے اور اس کا خط یہیں پڑا رہا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ ٹکٹ کیوں بھیجے گئے۔

فقیر ابوالکلام آزاد

(۸)

رانچی (بہار)
۲۷ر جنوری ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز۔ سلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ
یاد فرمانی کا شکریہ۔ یہ آپ نے خوب کیا کہ حیدرآباد سے کنارہ کش ہوگئے۔ اوّل تو علمی زندگی ملازمت کے ساتھ نبھ نہیں سکتی۔ پھر ملازمت بھی دیسی ریاستوں کی اور ریاست بھی حیدرآباد جیسی سازش کدہ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا نیا نیا غلغلہ ہے چند دنوں کے بعد دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ آپ نے اپنی ایک تصنیف کا ذکر کیا تھا، غالباً اس سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔
یہ تکفیر کا معاملہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ مجھ کو امید نہ تھی کہ آپ اسقدر جلد سلامتی ثابت

لہ مولینا عبدالماجد حیدرآباد سے مستعفی ہو کر لکھنؤ آ گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کی انتہائی خاطرداریوں کے باوجود دل حیدرآباد کے شاہی ماحول میں بالکل نہ لگ سکا۔ دل برداشتگی کا ایک سبب یہ بھی
باقی اگلے صفحے پر

ہو جائیں گے اگرچہ "کفر" کا مقام اس سے ارفع ہے۔ کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو!

امید ہے کہ آئندہ آپ اس طرح کے علائق سے آزاد و کنارہ کش رہیں گے اور آزادانہ و خود مختارانہ اپنے اشغال میں منہمک و مستغرق۔ اگر ایسی زندگی میسر آئے تو اس سے بہتر و کامیاب زندگی کوئی نہیں۔

ابوالکلام

—(۹)—

رانچی (بہار)

۲۶۔ نومبر ۱۹۱۹ء

مدت کے بعد آپ کا خط آیا، خوش وقت فرمایا۔ "تذکرہ" کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی۔ ایک صاحب نے بطور خود شائع کر دیا۔ بہر وجوہ اس کی اشاعت میرے لئے خوش آئند نہ ہوئی۔[1]

(بقیہ سابقہ) ہوا کہ مولانا کی کتاب "فلسفہ اجتماع" پر اعتراضات ہوئے۔ مولانا خود فرماتے ہیں کہ:

اس میں مذہب پر جا بجا حملے تھے (اور "البلاغ" پر بھی جا بجا چوٹیں تھیں) حیدرآباد میں اس پر ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ مکتوب الیہ .. .. واقعۃً اس وقت "عقلیت" اور الحاد میں مبتلا تھا۔ از سرِ نو مسلمان اس کے ایک عرصہ بعد ہوا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بزرگ نے فلسفہ اجتماع کی مختلف عبارتیں پیش نظر رکھ کر ضرب در ضرب کے عمل سے مولانا عبدالماجد کے فتوے اڑھائی کروڑ کفر لگا دیئے گئے تھے۔

[1] "تذکرہ" مولانا کی رائے اور مرضی کے خلاف فضل الدین احمد مرزا مرحوم نے شائع کر دیا تھا مولانا پورا چھاپنا چاہتے تھے۔ فضل الدین احمد نے مختلف اجزا روک لئے اور مولانا کے بیان کے دوسری جلد کا مسودہ بھی انہیں کے پاس تھا۔ مولانا کی رہائی سے پیشتر فضل الدین احمد پنجاب آ گئے تھے پھر ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ مسودہ تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔

"حقیقت"[۱] کے کئی نمبر آ چکے ہیں۔ آپ کے خط کے بعد خصوصیت سے میں نے دیکھا بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت یہ سب سے اچھا دیسی اردو اخبار ہے۔ اگر استقلال کے ساتھ جاری رہا اور مذاقِ عوام کی پیروی نہ کی گئی تو یہ ایک بڑی ضرورت پوری کرے گا۔

آپ نے لکھا ہے کہ تعطل کا زمانہ کیوں نہ تمدنی اصلاحات کی سعی میں بسر کیا جائے؟ لیکن زمانۂ تعطل کی قید کیوں یہ کام تو ایسا ہے کہ بڑی بڑی طاقت ور کارکن زندگیوں کو وقف ہو جانا چاہیے۔ جس چیز کو لوگ سیاسی اصلاح و ترقی کہتے ہیں وہ بھی دراصل تمدنی اصلاحات و ترقیات کی ایک خاص مجموعہ حالت ہی سے عبارت ہے۔ سیاست مصطلحہ کا اس سے باہر کوئی وجود ہی نہیں اور جس قدر بھی جماعتی مطالبات ہیں بغیر درستگی علم و عمل افراد وحصول حقوق معاشرت و مدنیت ممکن نہیں[۲]

بہرحال ایسا ضرور ہونا چاہیے، لیکن آپ نے جس مسئلہ کی نسبت لکھا ہے وہ صرف پنجاب و بمبئی کی بعض اقوام سے تعلق رکھتا ہے یعنی مسئلہ توریث میں رواج اور ہندو لا پر عمل کرتے ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل پیش نظر ہوں تو تحریر فرمائیے میں "حقیقت" کیلئے ضرور لکھونگا۔

مولانا سید سلیمان صاحب دوبار لطف فرما چکے ہیں[۳]۔ انجمن کے جلسے کے موقع پر بھی تشریف لائے تھے آپ کی ملاقات کی یاد آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیاں گذر گئیں۔

ابوالکلام

---

۱ "حقیقت" اخبار ہفتہ وار لکھنؤ شروع ہوا تھا۔ مولانا عبدالماجد اس کے نگران تھے مولانا ظفر الملک علوی مرحوم بھی شریک تھے پھر یہ اخبار رئیس احمد صاحب عباسی کے حوالے ہو گیا اور انھوں نے اسے روزانہ کر دیا۔

۲ اس سے اصلاحات کے متعلق مولانا کے نقطۂ نگاہ کی بنیادی حیثیت واضح ہو سکتی ہے یہ فقرہ کس قدر جامع ہے کہ

جس چیز کو لوگ سیاسی اصلاح و ترقی کہتے ہیں وہ بھی دراصل تمدنی اصلاحات و ترقیات کی ایک خاص مجموعہ حالت ہی سے عبارت ہے سیاست مصطلحہ کا اس سے باہر کوئی وجود نہیں۔

۳ مطلب یہ ہے سید سلیمان ندوی دو مرتبہ رانچی آ کر ملاقات کر چکے ہیں

(۱۰)

رانچی (بہار)
۳ر جنوری ۱۹۲۰ء

صدیقی العزیز

مسئلہ توریث میں یوپی کے مسلمانوں کا حال معلوم نہ تھا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا۔ جن مقاصد کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، وہ اور اسی طرح کے بے شمار مفاسد ہیں، جن کی اصلاح مقدم ترین امور میں سے ہے لیکن اس کے بارے میں سب سے پہلا سوال طریق اصلاح کا ہے کسی جماعت کے رسوم وعوائد اور صدیوں کی مالوفات میں تبدیلی پیدا کرنا ایک ایسا کام ہے۔ جو صرف بحث و نظر سے کامیاب نہیں ہو سکتا یعنی محض دلائل و معلومات کی اشاعت اس کے لئے سود مند نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک تعلق احساس و اعتراف مفاسد اور معلومات مانعہ کا ہے، بہت کم تعلیم یافتہ آدمی ایسے نکلیں گے جو ان سے بے خبر ہوں یا ضرورت اصلاح سے اختلاف رکھتے ہوں۔ تاہم یہ طاقت کسی میں نہیں ہے کہ عملاً اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے اور داعیات و بواعث مفاسد کا عزم و ہمت سے مقابلہ کرے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام فضائل عملیہ کا یہی حال ہے مجرد بحث و نظر سے یہ مرحلہ نہ کبھی طے ہوا ہے نہ ہوگا۔ مفاسد معاشرت میں بڑا حصہ ایسے رسوم و اعمال کا ہے جو شرعاً بھی داخل اشد معاصی و فسق ہیں اس لئے کم سے کم ان کے لئے تو علماء مشائخ کو ضرور سعی کرنی چاہیئے۔ مگر جو حال علماء کا ہے، آپ کو معلوم ہے۔ علماء غیر علماء سے نفس معلومات میں ممتاز ہیں، عمل میں نہیں مفاسد کے دواعی و ترغیبات جس طرح عوام کے لئے قہر و تسلط رکھتی ہیں، ان کے لئے بھی۔ اسی لئے باوجود علم وہ خود بھی مبتلا نظر آتے ہیں[1]

---

[1] اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قوم و جماعت کے رسوم و عوائد اور صدیوں کی مالوفات میں صرف بحث و نظر سے تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی اور اس بارے میں محض دلائل و معلومات کی اشاعت سود مند نہیں ہو سکتی۔ دلائل و معلومات سے کوئی بھی بے خبر نہیں، لیکن عمل کا خانہ بالکل خالی ہے۔

ضرورت اس کے لئے دو باتوں کی ہے، ایک تو سعیٔ اصلاح کے ساتھ ساتھ دفع الفساد و دواعی و ترغیبات کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک ان محرکات کا دفیہ نہ ہوگا، جو مفاسد کے لئے باعث ہیں، مجرد ترک و منع کی دعوت سود مند نہیں ہو سکتی۔ آپ لوگوں سے کہتے ہیں، گرد و غبار سے بچو اور سڑک پر چھڑکاؤ کا انتظام نہیں کرتے۔ ثانیاً ایک ایسی جماعت کا وجود اور منظر عام پر آجانا جو عملاً اصلاح کا نمونہ ہو اور اصلاح کا وجود خارج میں مجسم و متشکل دکھلا دے۔ چند عازم انسانوں کا عمل نفوذ اخبارات کے سیکڑوں آرٹیکلوں سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی جماعت بھی اصلاح و تغیر کے چند ممتاز خصائص کے ساتھ قائم ہو جائے تو چند سالوں کے اندر تمام قوم کی حالت بدل جائے، علی الخصوص انگریزی تعلیم یافتہ جماعت جس میں احساس حال اور طلب اصلاح کی استعداد سب سے زیادہ موجود ہے[1]۔

آپ تصنیف و تالیف میں علم اور سعی و عمل میں اصلاح معاشرت، ان دو چیزوں کو اپنا مطمح نظر بنائیے۔ پہلی بات تو موجود ہے دوسری کے لئے بھی آمادہ ہو جائیے۔ اپنے تعلیم یافتہ احباب میں سے چند عزم صادق رکھنے والے اشخاص منتخب کیجئے اور ایک انجمن قائم کیجئے۔ ابتداء میں صرف دو چار نہایت ضروری اور بنیادی باتیں لے لی جائیں اور صرف ان لوگوں کو شریک کیا جائے جو ان پر پوری طرح عمل کرنے کے لئے تیار ہوں اور تمام موانع کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ کوئی ایسی جماعت وجود میں آجائے تو پھر اخبارات کے مباحث مفید ہو سکتے ہیں ورنہ مجرد مضامین نویسی سے اردو میں معاشرتی مباحث کا ایک نیا لٹریچر فراہم ہو جائیگا عملاً اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا جس کے خصائص و اعمال کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں، معاشرت کا فلسفہ ہے، اصلاح معاشرت نہیں ہے۔

---

[1] کتنی پختہ اور پائیدار بات کہہ دی کہ ایک دواعی و ترغیبات کو روکے کہ کوئی ایسی جماعت پیدا کیجئے جو اصلاح کا عملی نمونہ پیش کرتی ہے۔

تاہم مقصود یہ نہیں کہ مضامین نہ لکھے جائیں۔ ان کی ضرورت سے انکار نہیں۔
بہرحال بہتر ہے میں "حقیقت" کے لئے ضرور لکھوں گا۔ لیکن براہ عنایت حاجی بغلول
اور تجاہل عامیانہ وغیرہ کو تو رکوا دیجئے[۱] یہ کیا مصیبت ہے اگر یہی حال رہا تو وہی "ہمدرد"
وغیرہ کا حال ہو کر رہ جائے گا۔
والسلام علیکم۔ دیکھئے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔

ابوالکلام

—— ۱۱ ——

البلاغ۔ کلکتہ

۱۳ر جنوری ۱۹۲۰ء

صدیقی العزیز

آپ کا خط رانچی میں ملا تھا۔ معافی خواہ ہوں کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔ کلکتہ میں
ایک ہی دن قیام کر سکا پھر دہلی چلا گیا اب واپس آیا ہوں۔ خط میں آپ نے اپنی علمی خدمات
کے ساتھ عملی اقدام کے لئے بھی مستعدی ظاہر فرمائی ہے، اس سے طبیعت نہایت درجہ
مسرور ہوئی۔ کاش اس کا جلد ظہور ہو۔ ہمراہیوں کا انتظار بے سود ہوگا۔ سب سے پہلا اور سب
سے بہتر رفیق خود اپنا ارادہ اور یقین ہے آپ نے مسٹر محمد علی کی شعلہ بیانی کی نسبت جو کچھ
لکھا ہے بالکل متفق ہوں اور اتنا اس پر اضافہ کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص اپنی ہتھیلی کیلئے

---

[۱] مولانا مزاح کے خلاف نہ تھے، اس لئے کہ خود مزاحی مضامین لکھتے رہے۔ مگر عوام پسند ظرافت بلکہ تکلف کی ظرافت کو بہت برا سمجھتے تھے۔ اس کا سلسلہ "ہمدرد" میں شروع ہوا تھا۔ بعض مضامین بہت اچھے لکھے گئے لیکن بعد میں معیار بہت گر گیا۔ "حاجی بغلول" "تجاہل عامیانہ" میں اسی جانب اشارہ ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا یکم جنوری کو نظر بندی سے رہا ہو چکے تھے، مگر چند روز رانچی ہی میں ٹھہرے۔ یہ مکتوب نظر بندی سے رہائی کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

انکاروں ہی کو منتخب کرتا ہے تو خیر یہ بھی ایک راہ ہے، بشرطیکہ میدان چھوڑ نہ دے۔ بہر حال وہ ایک بڑی آزمائش سے کامیاب نکلے ہیں اور ان کی بڑی سے بڑی اور زیادہ سے زیادہ عزت کے لئے یہ بس کرتا ہے۔[۱]

دیکھئے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے۔ رانچی میں نہیں تو کلکتہ میں تو آپ آ سکتے ہیں؟

ابوالکلام

—— (۱۲) ——

ریٹریٹ۔ شاہی باغ
احمد آباد
۲۹ر جون ۱۹۲۴ء

صدیقی العزیز۔ السلام علیکم

سفر سے واپس کلکتہ پہنچا تو آپ کا خط ملا لیکن ہجوم کار نے مہلت نہ دی پھر دہلی اور احمد آباد کا سفر پیش آیا۔ ڈاک رکھ لی تھی کہ جہاں کہیں مہلت ملے گی جواب لکھوں گا امید ہے

[۱] رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی اسی زمانے میں طویل قید و بند کے بعد رہا ہوئے تھے۔ حضرت رئیس الاحرار مرحوم کی طبیعت میں جلال بہت تھا۔ ان کی اسیری کے زمانے میں نہ صرف ترکی سلطنت بلکہ اسلامی خلافت بھی خوفناک مصائب میں مبتلا ہو چکی تھی جس سے وہ حد درجہ متاثر تھے۔ چنانچہ رہا ہوتے ہی انھوں نے تند و تیز تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا عبدالماجد نے اپنے مکتوب میں اسی کا ذکر کیا تھا، لیکن مولانا کے نزدیک اصل شے اس باب میں استقامت تھی اور دیکھئے کس کشادہ دلی سے رئیس الاحرار کی عظمت کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ایک بڑی آزمائش سے کامیاب نکلے ہیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ عزت کے لئے یہ بس کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا تمام امور میں بنیادی اور اساسی چیزوں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے اور جہاں بنیاد و اساس درست ہوتی تھی جزئیات و فروع میں کم یا زیادہ اختلاف کو چنداں اہمیت نہیں دیا کرتے تھے

اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے۔

آپ نے مولوی طفیل احمد صاحب کی نسبت دریافت کیا ہے کہ میں نے ان سے جواز سود کے بارے میں کوئی گفتگو کی ہے؟ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے مجھے یاد نہیں، مولوی صاحب موصوف سے کبھی اس باب میں کوئی گفتگو ہوئی ہو، بلکہ شاید ان سے ملاقات بھی کبھی نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا، کیوں انہیں ایسا خیال ہوا۔ غالباً اس بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ نے ان کے نام کے ساتھ "صاحب جواز سود" لکھا ہے کیا اس سے مقصود کوئی ان کی مصنفہ کتاب ہے۔

باقی رہا اصل مسئلہ تو جہاں تک قرآن اور اسلام کا تعلق ہے نفس ربا کی حرمت میں تو گنجائش قیل و قال نہیں ہے بحرب من اللہ ورسولہ۔ البتہ ربا کے تعین و تشریح میں متعدد فقہی مباحث اور مذاہب و آراء ہیں، جنہیں فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہندستان میں اوائل حکومت انگریزی سے ایک بحث یہ بھی شروع ہو گئی ہے کہ ہندستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام۔ اگر دارالحرب ہے تو فقہا کا قاعدہ ہے "لا ربا بین الحربی والمسلم" یعنی دارالحرب میں مسلمان اور حربیوں کی معاملت ربا نہیں ہے بعض کے نزدیک حربی کی قید بھی زائد ہے پس اس بنا پر متعدد علما کی رائے یہ رہی ہے کہ ہندستان کی موجودہ پولیٹکل حالت میں مسلمان غیر مسلم سے سود لے سکتے ہیں مولوی عبداللہ مرحوم ٹونکی اور مولانا شبلی مرحوم کی یہی رائے تھی۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا اور ندوۃ العلما کی کونسل کے علما کے سامنے پیش کیا تھا۔ غالباً ان کے مسودات میں ہوگا۔

پھر دارالحرب کے شروط میں بھی اختلاف ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی رائے دوسری ہے، صاحبین کی دوسری ہے۔ پھر بعض کے نزدیک ایک ملک دارالاسلام ہو کر دارالحرب ہو جا سکتا ہے، بعض کے نزدیک نہیں۔

حقیقت ان اختلافات سے بالاتر ہے اور دارالحرب میں جواز اخذ سود کی جو تعلیل کی گئی ہے، وہ بھی محل نظر ہے۔ صحیح تعلیل دوسری ہے۔ اگر ضرورت ہوئی اور مہلت ملی تو اس باب میں علاحدہ عرض بھی کیا جا سکتا ہے۔[1]

ابوالکلام

(۱۳)

کلکتہ

۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۲ء

جی فی اللہ، السلام علیکم۔ خط پہنچا۔ دہلی سے واپس آ کر دو ہفتے تک مبتلائے بخار و پیچش رہا۔ اس وقت تک طبیعت بحالی صاف نہیں ہے۔ جہاں تک مسئلہ جواز کا تعلق ہے

---

[1] مولانا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سوال ان سے زبانی کیا جاتا یا تحریری، جواب میں مسئلے کے ایک ایک پہلو کو اس طرح کھول کھول کر بیان فرماتے کہ قلب مطمئن ہو جاتا۔ مسائل کے تجزیے میں انہیں جو خداداد کمال حاصل تھا وہ اس مکتوب سے بھی نمایاں ہے یعنی پہلے نفس مسئلہ واضح کیا۔ پھر ربا کے تعین و تشریح کے سلسلے میں فقہی مباحث و مذاہب کا ذکر فرمایا۔ بعد میں یہ بتایا کہ جب کوئی ملک دارالحرب قرار پا جائے تو فقہا کا مسلک کیا ہے آخر میں دارالحرب کے شروط میں اختلاف کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ دارالحرب میں جواز اخذ سود کی جو تعلیل کی گئی ہے۔ وہ محل نظر ہے، صحیح تعلیل دوسری ہے۔

دیکھیے یہ ظاہر کوئی پہلو واضح نہیں کیا گیا۔ مگر پڑھا لکھا آدمی چاہے تو اسی مکتوب کو مشعل راہ بنا کر مسئلے کے متعلق پوری چھان بین کر سکتا ہے۔

مولانا خلیل احمد مرحوم، مختلف اسباب و دلائل کی بنا پر جواز سود کے قائل ہو گئے تھے اور انھوں نے زندگی کا خاصا بڑا حصہ اسی کوشش میں بسر کر دیا۔ یقیناً انھوں نے نہیں کہا ہو گا کہ مولانا سے گفتگو ہوئی۔ غالباً مولانا عبدالماجد صاحب کو خیال ہوا ہو کہ انھوں نے گفتگو کی۔

جو کچھ ہو رہا ہے تمام تر افراط و تفریط ہے بڑی مصیبت پیش آ گئی ہے کہ مسئلہ دینی احکام و مصالح سے مرزوحہ ہو گیا ہے اور جو لوگ اس جھگڑے میں ہیں انہیں اس کو جس کی خبر نہیں ذاتی کاوشیں اور جماعت بندی کا جذبہ ایک مزید آفت ہے مسئلہ پر آراء کی تقسیم حقیقت کی بنا پر نہیں بلکہ محض پارٹی کی بنا پر ہوتی ہے۔ مختلف حالات و اسباب ایسے ہیں کہ اصلاح حال کی امید بہت ہی کمزور ہے الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے[1]۔

لکھنؤ میں جلسے کے موقع پر آنا ہی پڑے گا، اگرچہ میرے سے یہ جلسہ ہی بے کار ہے ممکن ہے جلسہ کی تاریخیں بدل دی جائیں۔ لوگوں کو اعتراض ہے کہ دہلی میں یہ جلسہ صرف اس لئے قرار دیا گیا تھا کہ رپورٹ وفد چھپ کر شائع ہو جائے اور ممبروں کو مطالعہ و نظر کا کافی وقت ملے، لیکن رپورٹ اس وقت تک تقسیم نہ ہو سکی۔ غالباً آج بمبئی سے روانہ ہوئی ہوگی۔ میں نے شوکت صاحب کو لکھا ہے کہ جلسہ ۱۵ نومبر یا دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہو غالباً ۱۵ نومبر قرار پائے[2]۔ بہر حال امید ہے کہ آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔ قیام غالباً آپ

[1] مولانا مجلس خلافت ہند کے صدر تھے اور سلطان ابن سعود کے ملک الحجاز ہو جانے کا مسئلہ وجہ نزاع ہو گیا تھا جس حد تک مجھے اندازہ ہے نزاع کی حیثیت ابتدا میں بہت محدود تھی۔ لیکن اختلاف عقائد نے اس میں شدت پیدا کر دی۔ ایک گروہ جس میں اہل حدیث شامل تھے، سلطان کا حامی تھا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ جو حجاز، شام اور عراق پر وہابیوں کے سو سو سو سال پیشتر کی یورشوں کے سلسلے میں افسانہ آرائیوں نیز قبہ شکنیوں سے متاثر تھے سلطان کے مخالف تھے خود مجلس خلافت کے ارکان بھی دو فریقوں میں بٹ گئے۔ ایک حامی تھا دوسرا مخالف حامی فریق میں ذی اثر اور متحرک عنصر ارکان پنجاب کا تھا جنہیں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم "پنجابی ٹولہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ ان ارکان میں سے صرف چند اہل حدیث تھے باقی احناف تھے بلکہ شیعہ حضرات بھی تھے۔ یقیناً آخر میں اس معاملے نے فرقہ بازی ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ خود مولانا نیز سید سلیمان ندوی مرحوم کو فریق مخالف میں درجۂ اعتماد حاصل نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ سلطان کی حمایت کی طرف مائل سمجھے جاتے تھے

[2] یاد ہے اجلاس نومبر لکھنؤ میں ہوا اور مولانا کی بعض معاملات پر اختلاف نے شدید صورت اختیار کر لی اور ناکامی پر منتج ہوا۔

علی حسن صاحب بھی آگئے یہاں ہیں[1] لیکن میں تو آپ کے یہاں ٹھہروں گا تا آپ ٹھہرائیں۔
مولوی عبدالرزاق[2] صاحب کا ادھر کئی ہفتہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ مجھے انکی صحت کی طرف سے برابر تشویش رہتی ہے۔ اگر ممکن ہو تو ملیے اور خط لکھنے کے لیے کہیے۔ مولوی ظفر الملک صاحب ملیں تو سلام شوق۔

ابوالکلام

—(۱۴۱)—

کلکتہ

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء

محبی فی اللہ۔ السلام علیکم۔ ایک خط بھیج چکا ہوں۔ میں نے لکھا تھا شاید مجوزہ تاریخوں میں جلسہ کا انعقاد ملتوی ہوجائے۔ چنانچہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا۔ التوا کا باعث یہ ہوا کہ تقریباً انہی تاریخوں میں ہر جگہ کونسل کے انتخابات کی کشمکش درپیش ہے۔ مرکز کے ممبروں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو انتخابات میں مشغول ہیں خصوصاً بنگال اور پنجاب کے ممبر۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ ہماری شرکت ممکن نہیں۔ علاوہ بریں رپورٹ مدعیانہ کی اشاعت میں بھی تاخیر ہوگئی یہ تاخیر قصداً نہیں ہوئی مگر یہ

۱؎ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں مرحوم ابن امیر الملک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم ان کی کوٹھی بھوپال ہاؤس کے نام سے مشہور تھی۔ مولانا وہیں ٹھہرتے تھے۔

۲؎ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، جب "پیغام" کی اشاعت کے وقت کلکتہ میں مولانا کے ساتھ تھے پھر مولانا نے عربی کا رسالہ "الجامعہ" جاری کیا تو مولانا عبدالرزاق اس کے ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں مولانا کا بیان "قول فیصل" عربی میں منتقل کیا جو الگ رسالے کی صورت میں شائع ہوا۔ پھر مولانا عبدالرزاق لکھنؤ چلے آئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں مولانا نے الہلال دوبارہ شائع کیا تو مولانا عبدالرزاق پھر کلکتہ چلے گئے تھے۔

تھی، رپورٹ تنظیم ہے باوجود سعی دسمبر سے پہلے مکمل نہ ہوسکی۔ ایسی حالت میں یہی مناسب تھا کہ تاریخیں بدل دی جائیں۔ پیشتر ہی سے کافی نزاعات موجود ہیں۔ اب محض تاریخ انعقاد کا معاملہ مابہ النزاع کیوں بنادیا جائے۔ نومبر میں انتخابات کی کشمکش ختم ہوجائے گی دسمبر کے پہلے ہفتہ میں بہ اطمینان جلسہ ہوسکے گا۔ آپ لوگوں نے لکھنؤ میں جلسہ کا اہتمام کیا تھا، ممکن ہے اس تاخیر کی وجہ سے کارکنوں کو بے لطفی ہوئی ہو لیکن امید ہے دسمبر کا اہتمام اس کی تلافی کردے،

افسوس ہے کہ "زمیندار" اور "ہمدرد" کی نزاع کسی طرح ختم ہونے پر نہیں آتی پچھلی دفعہ جب شروع ہوئی تھی تو میں نے بہت کوشش کی کہ سلسلہ آگے نہ بڑھے مولوی ظفر علی خاں صاحب سے تو دہلی میں قول و قرار کرلیا تھا کہ وہ مولانا محمد علی کے خلاف کچھ نہ لکھیں چنانچہ سلسلہ رک گیا تھا مگر اب پھر شروع ہوگیا ہے اور بڑھتا ہی جاتا ہے نتیجہ اس کا یہ ہے کہ تحریک کا جو کچھ رہا سہا اثر عوام پر باقی تھا، وہ بھی امید نہیں کہ قائم رہ سکے حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء سے پہلے مسلمانانِ ہند میں جس قدر جماعتی قومی کا نظم اور دماغی انضمام تھا، اتنا بھی اب نہیں ہے اور یہ نتیجہ ہے اس ردِ فعل کا جو ۱۹۲۰ء کی حرکت کے بعد ظہور میں آیا۔ اب مسلمانوں کی دماغی و اجتماعی تالیف و نظم کے لئے از سرِ نو دعوت و تحریک کی ضرورت ہے۔

مولوی عبدالرزاق اور مولوی ظفر الملک صاحب ملیں تو سلام پہنچا دیں آپ کے اخبار "سچ"[1] کا اب کیا حال ہے؟ کتنی اشاعت ہے؟ ممکن ہو تو تفصیلات سے مطلع کریں۔

ابوالکلام

---

[1] مولانا عبدالماجد اور مولوی ظفر الملک علوی نے "سچ" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا بعد میں مولانا عبدالماجد نے "صدق" کے نام سے الگ پرچہ نکال لیا اور "سچ" ختم ہوگیا۔ گویا "سچ" "صدق" کا نقشِ اول تھا۔

(۱۵)

کلکتہ

۱۳ نومبر ۱۹۲۹ء

صدیقی

آپ کا رجسٹرڈ خط دہلی سے واپس ہو کر یہاں ملا۔ سچ یہ ہے آپ نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے میری نظر سے نہیں گزری۔ آپ نے جو اقتباسات پیش کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو تاریخ اسلام کے مبادیات تک معلوم نہیں ہے مجھے نہیں معلوم اس کے مترجم کون صاحب ہیں اور کیوں انھوں نے یہ کتاب ترجمہ کے لئے منتخب کی اگر مقصود یہ تھا کہ ایک مخالف کا نقطہ نظر واضح کیا جائے تو ضروری تھا مقدمہ میں اس کی تصریح کی جاتی اور جا بجا فٹ نوٹ بڑھائے جاتے مصیبت یہ ہے کہ یا تو لوگوں کو کام کا شوق نہیں ہوتا، ہوتا ہے تو نظر و امتیاز میسر نہیں[1]۔ یورپ کی زبانوں خصوصاً جرمن میں اسلامی تاریخی علوم کے متعلق مفید چیزیں موجود ہیں لیکن ہمارے مترجموں کو صرف ایسی ہی کتابیں مل سکتی ہیں۔

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا آپ نے اسے جامعہ کے کارنامے سے کیوں تعبیر کیا؟ اس قسم کے اخبار نویسانہ مبالغوں سے بحث و نقد کی وقعت اور سنجیدگی کو صدمہ پہنچتا ہے اگر جامعہ کے پروفیسر نے ایک غلط کتاب ترجمہ کے لئے منتخب کی یا اس کے نقد و تبصرہ میں کوتاہی کی تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے بہ حیثیت ایک مترجم کے اسے مخاطب کرنا چاہئے جامعہ کے کارکنوں کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا[2]

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ؛ ابوالکلام

---

[1] کہنا یہ تھا کہ بات کہدی ہے کہ یا تو لوگوں کو کام کا شوق نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو نقد و امتیاز میسر نہیں۔

[2] دیکھئے تنقید نویسی کا انداز ہر لحاظ سے سوقیت ہے اور اس لحاظ سے بھی موزوں نہیں کہ یگانہ خود تو لکھیں ایک پروفیسر کی غلط انتخابی کے لئے ادارے کو ذمہ دار ٹھہرا لینا اخبار نویسانہ مبالغہ ہے کیوں پروفیسر کو مخاطب نہ کیا جائے اور کیوں معاملہ اس کی ذات تک محدود رکھا جائے۔

(۱۶)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی
سوراج بھون ۔ الٰہ آباد
۱۹ر جولائی ۱۹۴۵ء

صدیقی

شملہ سے واپس آکر یہاں کی ڈاک دیکھی تو آپ کا کارڈ ملا[1]۔ ایک مدت کے بعد ایک عزیز کی صورت دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے وہ آپ کا کارڈ دیکھ کر ہوئی شکر گذار ہوں اور دعا کرتا ہوں ۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۷)

۲۲ر مئی ۱۹۴۶ء

صدیقی ۔ خط مورخہ ۱۷ر مئی پہنچا ۔ جس معاملہ کی نسبت آپ نے لکھا ہے، وہ پیش نظر ہے ہر بات اپنے مناسب وقت پر ہی انجام پا سکتی ہے اور انشاءاللہ انجام پائیگی[2]۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] مولانا بہ حیثیت صدر کانگریس پہلے احمد نگر میں بعد ازاں بنکوڑا میں اسیر رہے ۔ رہا ہوئے تو کانفرنس کیلئے انہیں شملہ بلایا گیا ۔ یہ مکتوب شملہ سے لکھا گیا ۔ مولانا عبدالماجد نے غالباً رہائی پر مبارکباد دی ہوگی ۔

[2] مولانا عبدالماجد نے دارالمصنفین کی امداد کے لئے لکھا تھا ۔ مولانا بہ حیثیت وزیر تعلیم دارالمصنفین علیگڑھ یونیورسٹی اور متعدد دوسرے اداروں کی امداد کا انتظام فرما دیا ۔

—— (۱۸) ——

۲۲ - پرتھوی راج روڈ - نئی دہلی

۱۱ فروری ۱۹۴۴ء

جناب محترم تسلیم

آپ کا تحفہ حضرت مولانا کو پہنچ گیا[1] اس کے لئے وہ شکر گزار ہیں - مکتوب گرامی بھی موصول ہوا -

"ترجمان القرآن" جلد اوّل زم زم کمپنی لمیٹڈ لاہور میں چھپ رہی ہے غالباً ہفتہ عشرہ میں پریس سے نکل جائے گی - امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے -

نیازمند

محمد اجمل خاں سکریٹری مولانا آزاد

—— (۱۹) ——

۱۹ - اکبر روڈ - نئی دہلی

یکم اپریل ۱۹۴۶ء

جناب محترم تسلیم

آپ کا خط حضرت مولانا کو ملا - وہ فرماتے ہیں کہ ۵ اپریل کو آپ مندرجہ بالا پتے پر تشریف لائیں[2] اور لنچ بھی نوش فرمائیں

راقم محمد اجمل خاں

---

[1] مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں کہ کوئی کتاب بھیجی ہوگی -

[2] مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں کہ آل انڈیا ریڈیو کی مرکزی اردو کمیٹی کا میں ممبر تھا - اس کے جلسے میں شرکت کیلئے دہلی جاتا تھا - مولانا کی جانب سے یہ دعوت نامہ بھی مل گیا - اسی مضمون کا ایک اور خط کمیٹی کے دفتر میں وصول ہوا

تیسرا مجموعہ

(مولانا سید سلیمان ندوی کے نام)

یہ کل اڑتیس مکاتیب ہیں، جو مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات کے بعد "معارف" کے متعدد نمبروں میں شائع ہوئے تھے۔ اشاعت میں نہ مکاتیب کی تاریخی ترتیب پیش نظر رکھی گئی اور نہ تمام مکاتیب کی تاریخیں قرائن کی بنا پر متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے انہیں تاریخ وار مرتب کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا اور ایک مکتوب کے سوا جو آخر میں درج ہے (اور اس کی تاریخ معلوم کرنے کا کوئی قرینہ موجود نہ تھا) تمام مکاتیب تاریخ وار مرتب کر دیئے۔ اغلب ہے کہ یہ ترتیب یا تو صحیح ہو یا اس میں غلطی بہت کم ہو۔ پھر جا بجا حواشی لکھے تاکہ مکاتیب کے مطالب ذہن نشین کر لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

—— (۱) ——

صدیقی الجلیل الاعز انعم اللہ علی بلقائک

والانامہ پہنچا، افسوس ہے کہ مجھے جناب کا وہ خط نہیں ملا۔ دفتر میں پوچھا تو انکار کیا۔ سخت افسوس ہوا۔ کاش آپ اس کا خلاصہ مکرر لکھنے کی زحمت گوارا فرماتے۔

تاریخ عرب کے لئے حاضر ہوں لیکن آپ میری حالت سے واقف ہیں ذمہ داری سے ڈرتا ہوں۔ سیرۃ نبوی کے چھپنے کی بھی گفتگو ہو رہی ہے میں سوا لکھنے پڑھنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ ایسا کیوں نہ کریں کہ کتاب لیتھو میں چھپوائیں اور نقشے مجھے بھیج دیں۔ یہاں بن جائیں گے۔ ٹائپ کے لوگ خوگر بھی نہیں ہیں۔

علوم القرآن اتنا ہی تھا؟ اگر مزید سلسلہ مرحمت ہو تو نہایت ممنون۔

ہاں "الحریت فی الاسلام" کے چند نمبر جو آپ نے لکھے تھے، شاید آپ لے گئے۔ نہیں ضرور ہی بھیج دیجئے۔ اسی طرح چھپ جائیں گے اور سلسلہ مکمل ہو جائیگا۔[1] ندوہ کے متعلق حسب مقدور کر رہا ہوں۔ آپ نے بہت ہی خوب کیا کہ "وکیل" میں اپیل شائع کی۔ اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ دیگر اخبارات میں مضامین نکلیں۔ کاش آپ ایک دو مضمون لکھ کر "زمیندار" میں بھیج دیں۔

ابوالکلام

—— (۲) ——

کلکتہ

الہلال۔ ۹ جنوری ۱۹۱۳ء

قضاھا لغیری وابتلانی بحبھا فھلا بشیٔ غیر لیلی ابتلانیا

صدیقی الجلیل الاعز!

---

[1] علوم القرآن اور الحریت فی الاسلام مضامین کے دو سلسلے تھے جو سید سلیمان نے الہلال کے لئے لکھے تھے

افسوس کہ میں جس خط کا منتظر تھا، وہ باوجود وعدہ آپ نے نہیں لکھا اور اس طرح اس صلاح و مشورہ کی سعی نہ کی جو ایماناً و اخلاقاً آپ پر فرض تھا۔

بہرحال آج میں اپنے شورش قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہوں لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہے تو بغیر از صبر چارہ نہیں۔

معلوم نہیں کہ اس خط کا کیا نتیجہ نکلے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ بھی بدگمانیوں کی نذر نہ ہو۔ تاہم خدائے علیم و بصیر میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ اس وقت ہر حرف جو لکھ رہا ہوں کس عالم میں لکھ رہا ہوں۔ خدارا یقین کیجئے کہ سچائی اور صداقت، محبت، وداد اور ایک گہرے حزن و ملال کے سوا اور کوئی چیز اس وقت میرے دماغ میں نہیں۔ واللہ علیٰ ما اقول شہید، وانہ لقسم لو تعلمون عظیم۔

آپ نے پونا میں پروفیسری قبول کر لی۔ حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے خدا کے لئے میری سنئے اور مجھے اپنا ایک مخلص بھائی تصور کیجئے۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ میں خود غرض ہوں اور میری غرض میری خواہش ہی عنصر اصلی ہے تاہم میری خود غرضی آپ کے لئے مضر نہیں بلکہ بہتر ہے کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی و عربی سکھلا دی۔ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں۔[1]

میرے تازہ حالات آپ کو معلوم نہیں گھر میں علالت میری موجودگی میں بڑھ گئی

---

[1] یہ مکتوب سلیمان ندوی کو دوبارہ "الہلال" میں لانے کی غرض سے لکھا گیا تھا۔ مقصود یہ تھا کہ "الہلال" کی ترتیب کا بوجھ بٹ سکا ہو تو مولانا دوسرا کام شروع کر سکیں۔ سید سلیمان راضی نہ ہوئے جس وجہ سے مولانا کو تنہا سب کچھ کرنا پڑا۔

اور اب اس درجہ حالت ردّی ہے کہ اپنی قسمتِ حیات کے فیصلہ کو بہت قریب پاتا ہوں خود میری حالت ایسی ہے کہ خدا شاہد ہے مسلسل چار گھنٹے کام نہیں کر سکتا ورنہ آنکھوں میں تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ الہلال ایک تحریک تھی جس نے استعداد پیدا کی، لیکن اس استعداد سے معاً کام لینا چاہیئے اور میں نے قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ خواہ "الہلال" کی کچھ ہی حالت کیوں نہ ہو، کام شروع کر دیا جائے چنانچہ شروع بھی کر دیا ہے ایسی حالت میں قیامت ہے کہ اگر آپ باوجود استطاعت وطاقت رکھنے کے میری اعانت سے انکار کر دیں۔

آپ یاد رکھیئے کہ اگر ان مصائب و موانع کی وجہ سے میں مجبور و پابہ گل رہ گیا تو قیامت کے دن یقیناً آپ اس کے ذمہ دار ہوں گے کہ آپ نے ایک بہت بڑے وقت کے ردّ عمل کو اپنی علیٰحدگی سے ضائع کر دیا۔

آپ آکر "الہلال" بالکل لے لیجئے۔ جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے مجھے سوا اس کے اصول و پالیسی کے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں میں بالکل آپ پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ صرف اپنے مضامین تو دیدیا کروں گا اور کچھ تعلق نہیں ہوگا۔ عربی کے لئے مولوی عبدالماجد صاحب کا وعدہ گریز کے لئے ہے۔ ایک اور شخص آپ کے اسسٹنٹ ہوں گے اور وہ عملاً دوسرا بھی آپ کی ایڈیٹری میں روز اوّل سے ہوگا۔

ایک وقت یہ ہے کہ ہر کام کے لئے مالی شرائط کا اظہار ضروری ہے اور ایسا کیجئے تو آپ کہتے ہیں کہ طمع دلاتے ہو۔ استغفر اللہ۔ لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ بغیر کسی ایسی نیت کے محض شرائط معاملہ کے طور پر چند امور عرض کرتا ہوں۔

سر دست آپ تشریف لے آئیں اور ایک سو تیس روپیہ منظور فرمائیں تیس کلکتہ کے مصارف اور انتظام کے لئے ہیں اسکے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہوگا یہاں تک کہ دو

سو پورے ہو جائیں۔

پروف کریکشن کے لئے انور علی آگئے ہیں اور اب اس کے لئے کوئی زحمت نہیں۔ صرف ایڈیٹری کا معاملہ ہے یہ ایک بہتر کام ہے، جو "الہلال" کی گرفتاریوں کی وجہ سے یں شروع نہیں کرسکتا۔ اب اگر اور دیر ہو گئی تو سخت نقصان ہوگا اور اسی لئے میں نے آخری فیصلہ اس کی نسبت کرلیا۔ میں آپ کو پابند نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر آپ خود چاہیں تو جتنی مدت کے لئے کہیں معاہدہ قانونی بھی ہوجا سکتا ہے۔

آپ معاً وہاں استعفا دیدیں اور کلکتہ تشریف لے آئیں اور اس خط کا جواب لاؤنعم میں بذریعہ تار دیدیں۔ مجھ کو پوری امید ہے کہ میری یہ سعی بے کار نہ جائے گی کیونکہ میں سچے دل سے آپ کا طالب ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ سچی طلب و مودت ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے۔ اگر مولانا شبلی کا خیال ہو کہ ان کے ذریعے سے پونا تشریف لے گئے ہیں وہ مُصر تھے، اب ناراض ہوں گے تو میں خود ان سے اس معاملہ کو صاف کرلوں۔ تاہم جو کچھ ہو جلد ہو۔

الوالکلام کان اللہ لہٗ

— ۳ —

صدیقی الجلیل الاغر

انسان کا اپنا فرض نہ ادا کرنا ہمیشہ اس کے لئے موجبِ تاسف وتالم ہوتا ہی اگر میں نے آپ کے خطوط کا جواب دیدیا ہوتا تو آپکو میری خاموشی سے سوءِ ظن نہ پیدا ہوتا۔ استغفر اللہ، لیکن تعجب ہے کہ خطوں کے بارے میں میری اس حالت کی علم کے باوجود آپکو ایسا خیال ہوا، حالانکہ ساری دنیا میری اس عادت سے واقف ہی اور یہ نئی بات نہیں ہی

میں رمضان اور اس کے بعد کے بعض حالات کی وجہ سے بہت ہی پریشان رہا اور اب تک اسی وجہ سے خط نہ لکھ سکا اور آج کل پر وقت گذر گیا۔

میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ کتاب جس طرح اور جس اصول پر آپ چاہیں شائع کرائیں، اصل مقصد اشاعت ہے اور اگر میں اس کا ذریعہ ہوں تو یہ خوشی کی بات ہے کتاب کا دیباچہ تیار کر دیجئے، چھپ جائے گا، لیکن چند باتوں پر نظر رہے :

۱. آپ کو میرا حال معلوم ہے، نیز پریس سے بھی واقفیت ہو گی۔

۲. سر دست نیا ٹائپ کوئی نہیں رہا، نسبتہً نئے میں ہفتہ وار اور پرانے میں روزانہ نکلتا ہے۔ اب خود ڈھلوانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس لئے نئے ٹائپ کے خریدنے میں بھی وقت لگے گا، کیونکہ آرڈر سے ایک ماہ بعد مال دینے کا معاہدہ ہے، اور ہمیشہ معاہدہ سے بھی زیادہ تاخیر ہو جاتی ہے۔

۳. گورنمنٹ بنگال کی ایک کتاب چھپ رہی تھی، نصف باقی ہے۔ جنگ کی وجہ سے روزانہ نکالنا پڑا۔ ان اسباب سے پریس بہت معروف ہے۔

پس اگر میں بہت کوشش کروں گا جب بھی کتاب اس وقت سے ایک ماہ بعد شروع کی جاسکے گی۔ البتہ شروع ہو جانے کے بعد کسی نہ کسی طرح ہفتہ وار اقلاً دو جز ضرور چھپ جائیں گے۔ اس سے بھی زیادہ ممکن ہے۔

آپ نے ایک خط میں "الہلال" کے اغلاط آیات وغیرہ لکھے تھے اور بالکل ٹھیک تھے کیا کہوں آیات کے متعلق بعض اوقات عجیب حالت ہو جاتی ہے۔ الا ان حزب اللہ هم الغالبون کے متعلق دماغ کو غیر محسوس دھوکہ ہوا فان حزب اللہ هم الغالبون اور الا ان حزب اللہ هم المفلحون کے تشابہ سے دماغ نے هم الغالبون پیدا کر لیا اور مادہ تاریخی ہونے کی وجہ سے بہت غنیمت معلوم ہوا۔

حدیث بدأ الاسلام غریباً کے الفاظ میں بھی واقعی غلطی ہو گئی، اگرچہ غریب کے معنی میں نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محدثین نے "غربت" سے فلاکت و ادبار و مغلوبیت و مظلومیت و مسکنت ضرور مراد لی ہے حافظ ابن رجب صاحب طبقات نے شرح میں یک

رسالہ لکھا ہے اور چھپ گیا ہے[1]۔ مختلف اقوال بھی جمع کئے ہیں اور لکھا ہی کہ تنزل مسلمین ومظلومیت حق وقلت صادقین وشیوع فسادات وغیرہ مراد ہیں۔ مسافر کی حالت تفرد وسکنت وبے یاری وبے رفاقت کی ہوتی ہے، اس لئے اردو لفظ غریب کا مفہوم ہر حال میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب نے بالآخر اپنے سوانح وحوادث بیان فرما ہی دیئے، جو بڑے ہی دلچسپ ہیں۔ کاش آپ سنتے۔

مولوی آزاد سبحانی کے متعلق اور لوگوں کا بھی یہی بیان ہے یہاں بھی وہ آئے تھے میں نہ تھا۔ مولوی رکن الدین میں اور ان میں سخت مجادلہ ہو گیا، انھوں نے کہا کہ میری کامیابی میری قوتِ بیانیہ کا نتیجہ ہے۔ دانا صاحب نے نہ مانا۔

بیجاپور والے مضمون کا اس قدر تشکر کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ باتصویر رسالہ کی یہ اصلی شے تھی، جو آپ کی بدولت "الہلال" میں شروع ہو گئی[2]۔ جنگ کی وجہ سے وہ اب تک شروع نہ ہو سکا، ورنہ بلاک بن گئے ہیں، آیندہ ان کے بعد والے نمبر میں انشاء اللہ شائع ہوگا، مگر اس کے بعد کا کوئی حصہ دیجئے تاکہ تسلسل قائم رہے۔

علم الحدیث کے مضامین تو "الہلال" میں نکل چکے ہیں اور آپ کن کی نسبت فرماتے ہیں؟ علوم قرآن میں اور کچھ نہ ملا۔

ابوالکلام

---

[1] غالباً ابن رجب کے رسالے "کشف الکربہ" کا ذکر ہے جس میں حدیث غربت کی شرح کی گئی ہے

[2] میں سمجھتا ہوں کہ سید سلیمان مرحوم نے یہ مضمون ۱۹۱۴ء ہی میں بھیج دیا تھا اور بلاک بھی بن گئے تھے لیکن یہ شائع نہ ہو سکا اور الہلال بند ہو گیا نومبر ۱۹۱۵ء میں البلاغ نکلا تو اس کے پہلے نمبر میں یہ مع تصاویر چھپا۔

(۴)

الہلال

اخ الجلیل الاعز

مدت ہوئی آپ کا والا نامہ آیا تھا۔ اس کے جواب میں ایک بہت ہی مفصل خط رجسٹرڈ بھیجا تھا اور اس کے آخر میں اشاعت اسلام کے متعلق آپ سے ایک ضروری استفسار بھی تھا[1]

تعجب ہے کہ جواب سے اب تک محروم ہوں۔

برمن منگر بر کرم خویش نگر

وہ خط بہت مفصل تھا اور متعدد امور پر مشتمل۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے، سنا ہے کہ آپ نے جوری شروع کردی ہے دارالعلوم کے تازہ حالات سنے ہوں گے۔

مخلصکم

ابوالکلام

(۵)

الہلال آفس

میکلوڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۲۷ جنوری ۱۹۱۵ء

عجبت لمن یقول ذکرت الفی
وھل انسی فاذکر من نسیت

صدیقی العزیز الاجل

کل صبح سفر سے واپس آیا اور خط پڑھا۔ یہ آپ نے پہلے شکایت اس لئے تو نہیں کی ہے

---

[1] اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

تاکہ میرے لئے شکایت کا موقع نہ رہے۔

بینی وبینک فی المحبۃ نسبۃ
مستورۃ من اھل ھذا العالم
نحن اللذان تفارقت ارواحنا
من قبل خلق اللّٰہ طینۃ آدم

خط سے غالباً مقصود وہ خط ہوگا جو آپ نے بھوپال سے لکھا تھا اس کے جواب میں ایک نہایت مفصل خط جس میں متعدد ضروری امور تھے، اعظم گڈھ کے پتے سے لکھا اور آج تک اس کے جواب کے لئے ترستا ہوں۔ اب آپ نے خط لکھا تو جواب کی جگہ الٹی شکایتیں ہیں۔

بہرحال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق و ہم عنان یقین کیجئے اور ہر دم خدمت گذاری کے لئے تیار افسوس ہے کہ ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ کاش اللہ ایک جائی کا سامان پیدا کرتا۔ قوتیں مجتمع ہوتیں۔ تفرق اور عدم توحد نے ان نتائج سے بھی محروم کردیا ہے جو باین ہمہ بے سروسامانی حاصل ہوسکتے تھے۔

دارالمصنفین نہایت آسانی کے ساتھ ایک وسیع النتائج چیز بن سکتا ہے اور ندوہ کا حقیقی بدل، بل نعم البدل۔ اصلی کام وہی ہے باقی سب کے سب فرضی ہیں آپ کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ آدمی پیدا ہوں۔

اس لئے میں نے لکھا تھا کہ۔

ایک اچھے موقع کو ضائع کیا گیا اور بیگم صاحب کے سامنے وسعت و اہمیت کے ساتھ اس چیز کو پیش نہیں کیا گیا۔ میں نے باوجود سخت موانع کے ارادہ کیا تھا کہ صرف اسی کی خاطر خود ملوں اور کہوں[۱]

---

[۱] مطلب یہ کہ نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے سامنے دارالمصنفین کی وسعت و اہمیت واضح کرنی ضروری تھی اور معاملہ صرف سیرۃ النبیؐ کی ترتیب کے سلسلے میں امداد تک محدود نہ رہنا چاہئے تھا۔

اس کا مرکز قطعاً لکھنؤ ہونا چاہیے یا اعظم گڈھ ہو مگر ایک وسیع شاخ لکھنؤ میں ہو
میں نے طریق عمل اور اصول کار کو اسی زمانے میں بصورت اسکیم قلم بند کر لیا تھا اور وہ موجود ہے
میں اواخر جنوری میں پھر نکلوں گا اور کوشش کروں گا کہ فاتحہ کے لئے اعظم گڈھ
حاضر ہوں[1]۔ بصورت دیگر آپ کو اطلاع دوں گا کہ نسبتہً کسی قریب تر مقام پر ملاقات
ہو سکے۔ مولانا عبدالسلام[2] امید ہے بخیریت ہوں گے مع سلام شوق۔

ابوالکلام

خط لکھ کر جب پتہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ اعظم گڈھ میں نہیں بلکہ پونا میں ہیں۔
اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ملاقات کیوں کر ہو۔ بہر حال آپ جلد یکسوئی اختیار کریں یہ بہتر ہے
ایک ملاقات آپ سے بہت ضروری ہے، کوئی طریقہ بتلائیں۔

(۶)

۵ رپن لین۔ کلکتہ

صدیقی الاعز

السلام علیکم۔ شرمندہ ہوں کہ اتنے عرصہ کے بعد آپ کے کارڈ کا جواب دیتا
ہوں۔ میں یہاں نہ تھا، ذیابیطس کی شکایت نے بالکل مجبور کر دیا ہے۔
مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے مکاتیب مشکل ہے کہ اب مل سکیں افسوس ہے
کہ جمع کرنے کا التزام نہیں رہا کچھ ملے تو پرائیویٹ معاملات یا ندوہ کے متعلق ہیں اور
ان کی اشاعت غیر ضروری ہے۔
دارالمصنفین کے قواعد اعظم گڈھ سے آئے ہیں سوائے چند دفعات کے سب
بہتر و مناسب ہیں۔ اب آپ جلد سے جلد رجسٹر ڈکرا لیں اور عملی کام کی صورت نکالیں یک و د

[1] یعنی مولانا شبلی مرحوم کے فاتحہ کے لئے جن کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا۔

[2] مولانا عبدالسلام مرحوم ندوی۔

آدمی بھی ہوں تو کام شروع کر دینا چاہیے۔ یہ ایسا معاملہ تھا کہ اس کے متعلق بالمشافہ صحبتیں ضروری تھیں۔

ادھر فرصت میں آپ سن کر خوش ہوں گے کہ ترجمان القرآن اور تفسیر کا بہت سارا حصہ ہو گیا۔[1] نیز شاہ ولی اللہ مرحوم کے سوانح کے کاغذات نکال کر مرتب کر لیے۔[2] ترجمہ چھپ رہا ہے اور ترجمہ کا ایک مختصر مقدمہ لکھ رہا ہوں جو گویا مقدمہ تفسیر ہوگا اور اصولاً بہت سی نئی باتوں پر مشتمل ہے۔[3]

ندوہ کی نائب نظامت پر مولوی شروانی کے ذریعہ میں نے کئی آدمیوں کو استوار کیا تھا پھر معلوم نہیں ہوا کہ ندوہ کا کیا حال ہے اور آپ کا کیا منشا ہے مولوی شروانی نے لکھا تھا کہ وہ دار المصنفین پر ہیں۔ میں نے لکھا کہ دار المصنفین اسکے لیے مانع نہیں ہے۔[4]

مجھے خوف ہے کہ آپ پونا میں نہیں بلکہ وطن میں ہوں گے۔ لفافہ ابھی لکھا نہیں جی چاہتا ہے کہ دسنہ کے پتہ سے بھیجوں۔[5]

ابو الکلام کان اللہ لہٗ

——— (۷) ———

مکرمی! السلام علیکم

دار المصنفین کا پراسپکٹس پہنچا۔ آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے

---

[1] اس خط پر تاریخ درج نہیں، لیکن بظاہر یہ ۱۹۱۵ء ہی کا ہے فرصت سے مراد یہ ہے کہ الہلال بند تھا اور البلاغ ابھی نکلا نہ تھا۔

[2] مطلب یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے سوانح کے متعلق جو کاغذات موجود تھے وہ سب نکال کر مرتب کر لیے

[3] ترجمے کی پہلی جلد ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی اس کے ساتھ جو مقدمہ ہے وہ اگرچہ بہت سی نئی باتوں پر مشتمل ہے مگر بہت مختصر ہے۔ [4] اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان کو نائب ناظم مقرر کرانے کا خیال تھا [5] دسنہ (بہار) مولانا سید سلیمان کا وطن مالوف

آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے اگر اس میں کوئی جگہ خالی ہو جب بھی میں منظور کرلونگا بشرطیکہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص۔

مولوی عبدالسلام کہاں ہیں؟ ان سے کہیئے کہ خط لکھیں۔

ابوالکلام

(۸)

صدیقی الجلیل الاعز۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

والانامۂ گرامی پہنچا۔ مجھے تو خوف تھا کہ کہیں آپ پونا سے روانہ نہ ہوگئے ہوں۔

"امثال القرآن" کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے بالکل درست ہے یعنی حالاتِ وقت نزول و طریقِ تمثیل و بیانِ عربیہ جاہلیہ۔ یہ دو چیزیں نہ صرف امثال القرآن بلکہ تمام قرآن کے فہم و درس کے لئے بمنزلہ اساس و اصل کے ہیں اور امثال و اقسام و انواع بیان و تخاطب و تذکیر کے لئے تو ایسی نظر انہیں پر ہونی چاہیئے[1]۔

عرصہ کے بعد مولوی عبدالباری کا تذکرہ سننے میں آیا۔ وہ کشمیر میں تھے اور انگریزی کی فکر میں۔ معلوم نہیں اس کی تکمیل کا انہیں موقع کہاں تک ملا۔

دارالمصنفین کے دائرہ کو جس قدر تنگ رکھے گا اسی قدر وہ حقیقی اور عملی ہوگا دو چار آدمی اچھے کام کر سکتے ہیں، لیکن مجمع جہلا بے کار ہے بڑی چیز یہ ہے کہ آئندہ ایسے نمونے قائم کئے جائیں جن میں حقیقت ہو اور رسم پرستی اور وہم سے احتراز کیا جائے آپ دارالمصنفین کو اس کا پہلا نمونہ بنائیے۔ مولانا عبدالسلام کو سلام شوق۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

---

[1] مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو مثالیں بیان ہوئی ہیں ان پر غور کے سلسلے میں اول حالات وقت نزول، دوم طریق تمثیل و بیان عرب جاہلیت پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں محض امثال ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے قرآن کے فہم و درس کے لئے بمنزلہ اساس و اصل ہیں۔

نمبر ۵۴ رپن لین کلکتہ

۲۵ اگست ۱۹۱۵ء

اخ الاعز الاجل

انعم اللہ علیٰ بلقائکم والسلام علیکم

والا نامہ پہنچا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں آپ پونا سے چلے نہ گئے ہوں یہ آپ نے
کیونکر کہا کہ میں آپ کو بھول جاتا ہوں؟ غالباً تواتر و تسلسل مراسلات علائق قلبیہ کے
لئے شرط نہیں ہے آپ یقین کریں کہ موجودہ عہد کے جہل عام اور فساد محیط میں اتحاد مشرب
و فکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا۔

اریدلانسی ذکرھا فکانما

تمثل لی لیلیٰ بکل سبیل

ترجمۃ القرآن کے متعلق اور امور تو پیش نظر تھے لیکن ہر پیراگراف کیلئے عنوانات
کا قائم کرنا ایک نہایت ہی قیمتی اور مفید ترین چیز ہے، جو آپ نے مجھے بتلادیا۔ مجھے اس
کا بالکل خیال نہ تھا۔ البتہ رکوع وغیرہ پیشتر سے نظر انداز تھے اصلی رکوع وہی ہے جو
کسی مضمون مسلسل کا ایک مستقل مختتم بہ علامت وقف تام نکلتا ہو ہفتہ عشرہ میں سورت
بقر آجائے گی تو آپ کے پاس بھیجوں گا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ کام سے پہلے جن مشکلات کا علم
نہیں ہوتا وہ کرنے پر اس طرح سامنے آگئی ہیں کہ قدم قدم پر رُک جانا پڑتا ہے۔

ایک چھوٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ مثلاً امثال القرآن میں اذہان کی
مختلف حالتیں ہیں مطلب صورت یہ ہے کہ صرف مثال پر قناعت کی ہے اور سوائے حکم
تفکر و تعقل کے اور کوئی چیز اصل میں ایسی نہیں ہے جو مشبہ بہ کو واضح کردے۔ اب اگر ترجمہ
میں بھی وہی شکل قائم رہتی ہے تو وضاحت و تفہیم کا اصل مقصد ہی فوت ہوتا ہے۔ اگر

وضاحت کی جاتی ہے تو اختصار میں زور و بلاغت نہیں اور اطناب میں اصل پر بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے بعض مقامات پر میں تھوڑا بہت کامیاب ہوا ہوں کہ ایسے الفاظ جمع ہو گئے جن میں ضمناً وضاحت ہو گئی اور متن سے بھی بہت زیادہ دور نہ نکل جانا پڑا لیکن بعض مقامات کی مشکلیں بہت سرگرداں کرتی رہیں۔

سورۂ بقر کی مشہور مثال "مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ، فَلَمَّا أَضَاءَتْ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ" میرا خیال ہے کہ قرآن کریم کی پہلی سورت میں یہ مثال بلا وجہ عظیم نہیں ہے اور در اصل اس کے اندر بہت ہی بڑی تفصیل پوشیدہ ہے اسے محض بعض یہود و منافقین یثرب سے تعلق نہیں، بلکہ اپنے عموم واطراف میں مجمع انسانی اور ہدایت افراد و امم کی ایک ایسی اصولی تقسیم ہے جس سے باہر کوئی گروہ باقی نہیں رہا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ قدما میں ابن قیم نے اسے محسوس کیا اور "اجتماع جیوش" کے آٹھ صفحوں میں اس پر بحث کی ہے، گو پھر بھی حسب دل خواہ نہیں ہے [1]

اب فرمائیے کہ اگر اس مثال کو اردو میں لکھ کر چھوڑ دیا جائے تو کیا اثر ہوگا؟ لیکن اگر مسطور مثال سے ربط باقی رکھ کر مطلب کو بڑھایا جائے اور کھولا جائے تو کس قدر زیادہ اضافہ اصل پر ہو جائے گا؟ علی الخصوص أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ الخ

بہ ہر حال کسی نہ کسی طرح کام کو جاری رکھا۔ یہ کام در اصل یوں تھے کہ باہم یکجائی ہوتی ہے اور دیر تک صحبتیں اس بارے میں کی جاتیں لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تو جس حال میں جو کچھ ہو جائے اور توفیق مساعد ہو اسی پر شکر کرنا چاہیے۔

---

[1] "اجتماع جیوش" اسلامیہ مطبوعہ امرتسر کے صفحہ ۱ سے یہ بحث شروع ہوتی ہے اور بلاشبہ ایسے نکتے بیان فرمائے ہیں جن کی کوئی مثال پیشتر یا بعد میں نہیں ملتی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سوانح موجودہ ٹونک کی خبر سے کہ آپ نے مجھے بے چین
کردیا۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ حالات ہوں۔ تصانیف میں خاندان وغیرہ کی تفصیل ملتی ہے
لیکن سلطنت مغلیہ کے آخری عہد میں ان کے سالہا سال کیونکر بسر ہوئے اور ایک شخص
جسے ہم حجۃ اللہ البالغہ میں دیکھتے ہیں، عملاً کیسی زندگی بسر کر گیا؟ اس کا کوئی ذریعہ نہیں۔
مولانا شبلی کی بدولت مجھے ایک عمدہ شے ملی اور میں نے نقل لے لی، یعنی ذخیرہ دائرہ
الہ آباد۔ شاہ صاحب کے لئے اس سے زیادہ نہیں ملے گا۔[1]

لیکن خدا را کسی قدر مفصل لکھئے کہ ٹونک کی نسبت کس نے کہا؟ کس کے پاس ہے؟
ٹونک میں اپنے بہت سے مخصوص احباب ہیں نیز حکیم برکات احمد صاحب سے باوجود
توہتب خط وکتابت ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تم ایک اچھی قسم کے گوارا وہابی ہو۔ ممکن ہے ان
کے ذریعہ کام نکلے۔ بہر حال اپنی معلومات نسبت رسالہ ٹونک مفصل لکھیں۔

"الہلال" کا وہی حال ہے جو میں نے آپ سے کہا تھا، گو آپ لوگوں نے کبھی
میرے اس وعدہ کو صحیح نہیں سمجھا کہ میں دوبارہ جاری کروں گا۔ "البصائر" "البلاغ" "البیان"،
"ترجمان" اتنے پریس جب میں چاہوں قانوناً قائم کر سکتا ہوں اور جب چاہوں ان میں
"الہلال" چھاپ سکتا ہوں۔ ان میں سر دست ایک کو اختیار کیا ہے اور صرف آج کل کی بات
ہے تفسیر القرآن باسم "البیان فی مقاصد القرآن" ماہوار رسالے کی شکل میں نکلے گی۔[2]

---

[1] اس سے ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ کے سوانح کے لئے بہت پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ الہ آباد کے دائرہ شاہ اجمل کے ذخیرہ میں شاہ صاحب کے متعلق جو کچھ محفوظ تھا، فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ کہیں کیا ملے گا؟

[2] اس مکتوب سے ظاہر ہے کہ "البلاغ" کے اجرا کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۵ء میں یہ جاری ہوا ساتھ ہی "البیان فی تفسیر القرآن" کا اشتہار نکلا لیکن مولانا ابھی اطمینان سے کاموں کو درست و ترتیب کی بنیادوں کو محکم نہیں کر پائے تھے کہ اخراج کا حکم جاری ہو گیا اور سب کچھ چھوڑ کر انہیں رانچی چلا جانا پڑا۔

مگر میں یہ کہوں تو کیا آپ اسے سچ سمجھیں گے کہ میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں؟

قضاها لغیری وابتلانی بحبها

آپ نے لکھا ہے کہ آپ اکتوبر سے فارغ ہیں، لیکن پونا سے کہاں جائیں گے؟ اعظم گڈھ یا وطن؟ اگر دسنہ کا قصد ہو تو اس سے کلکتہ دور نہیں اور ویسے تو پونہ اور اعظم گڈھ سے بھی ایک لمحۂ محبت میں بُعد، قرب ہو سکتا ہے۔

دار المصنفین کے لئے بہت ضروری ہے کہ اسے حقیقت اور اصلیت کا نمونہ بنایا جائے اور اس کے دائرہ کو اتنا وسیع نہ کیا جائے کہ ہر ایڈیٹر، اہل قلم، اور ہر مضمون نگار مصنف ہو، ورنہ سب کچھ بے سود۔ وہ وقت ابھی سے پیدا کرنا چاہئے کہ اس کا نام سند اور سارٹیفکٹ کا کام دے[1]

فقیر ابو الکلام کان اللہ لہٗ

—— (۱۰) ——

اخ الجلیل الاعز، انعم اللہ علیٰ بلقائک

خط پہنچا۔ ایسی حالت میں کہ آپ کے عدم تعین مکان وعالم اطلاق مقام سے سخت پریشان تھا اور حیران تھا کہ کیونکر خط وکتابت کروں۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میری فرصت موجودہ اب قریب الاختتام ہے۔ مشیت الٰہی جس طرح مہلت دے کر اپنا کام کرانا چاہتی تھی، اسی طرح آخری ابتلاء کو بھیج کر کوئی عظیم الشان مقصد پورا کرانا چاہتی ہے۔ آثار گویا ہیں اور علائم قطعی

---

[1] اصل مکتوب میں سال درج نہ تھا۔ میں نے داخلی شہادت کی بنا پر درج کر دیا۔ اور یہ بالکل درست ہے۔

اخبار موثق اور اطلاعات معتمد ہیں۔[1] تاہم سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے اور میں نے اس دورِ حیات میں بڑے بڑے کرشمے دیکھے ہیں پس کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل ٹھیک ٹھیک کیا ہوگا اور وہی ہو جو اس کی مرضی ہے ایسی حالت میں بہت سوچتا ہوں، لیکن آپ کے سوا کسی کو نہیں پاتا، جس سے اُمید رکھوں۔

مدت ہوئی جب آپ کلکتہ میں تھے اور ایسے ہی ایک اطلاع ملی تھی۔[2] شب کو میں نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا تھا اور آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ خدا را اسے سامنے لایئے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے وقعت دیجئے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ ابھی وقت اپنے کاموں میں کوئی تبدیلی کیجئے۔ البتہ اگر آپ بذریعہ تحریر مجھ سے وعدہ کریں کہ جب وقت آئے گا تو آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک کام کے ہو رہیں گے تو میں بڑی ہی تسکین پاؤں اور اطمینان کے ساتھ آنیوالی حالت کو قبول کر لوں۔ وہ تسکین جو بدبختی سے اور کسی کے پاس نہیں۔

آپ مجھ سے بلا تاخیر بذریعہ تحریر وعدہ کریں کہ اگر میری نسبت آپ کو کوئی نئی خبر ملے تو آپکو پہلا کام یہ ہوگا کہ فوراً کلکتہ آیئں اور "البلاغ" کو جو نکل چکا ہے (اور انشاءاللہ نکلتا ہی)

---

[1] یہ مکتوب تقریباً مارچ ۱۹۱۵ء کے اواخر یا ۱۹۱۶ء کے اوائل کا ہے جب "البلاغ" نکل چکا تھا اور دارالارشاد جاری ہو چکا ہے معلوم ہوتا ہے مولانا کو معتبر ذرائع سے اطلاع مل گئی تھی اور ان کے لئے بنگال سے اخراج کا حکم جاری ہونیوالا ہے اور انہیں پریشانی تھی تو یہ کہ کسی طرح کاموں کے بے خلل جاری رہنے کا بندوبست ہو جائے۔

[2] یہ غالباً اس زمانے کی بات ہے جب سید سلیمان ندوی "الہلال" کے سٹاف میں شامل تھے اور میرے اندازے کے مطابق یہ زمانہ چند مہینے سے زیادہ کا نہ تھا۔ غالباً وہ مئی یا جون ۱۹۱۳ء میں شریک ہوئے اور اکتوبر یا نومبر میں الگ ہوئے۔

اپنی ایڈیٹری میں لے لیں اور ایک خالص دینی و اصلاحی رسالے کی شکل میں مع اس کے خصائص کے اس کو جاری رکھیں۔ کسی پُر خطر راہ کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، نہ جنگ پر ملنے تنخواہ کی ضرورت ہے۔ صرف قرآن و سنت کے معارف و دعوت کو بہ انداز و اصول مخصوص "البلاغ" جاری رکھنا چاہئے اور جب تک اس طرح کیا جائے گا۔ اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

یہاں تمام لوگ آپ کے استقبال کے لئے منتظر ملیں گے اور وہ آپکا اسی طرح ساتھ دیں گے، جس طرح میرا دے رہے ہیں اور اسی طرح حکم مانیں گے اور ماتحت رہیں گے جیسے میرے رہتے ہیں۔

دوسرا اس سے بھی اہم مسئلہ "دارالارشاد" کا ہے[1]۔ افسوس کہ یہ بہت دیر میں شروع ہوا اور اس کی ناتمامی کا داغ بڑا ہی داغ ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا تاہم اگر قرآن حکیم اور علوم اسلامیہ کا درس ان اصولوں پر، جو آپ سے پوشیدہ نہیں، آپ جاری رکھ سکیں، اور رکھ دیں تو وہ بھی بہ صورت موجودہ آپ کے تصرف میں آجائے گا اور پہلے کام سے بھی بڑھ کر کام ہوگا۔ اگر آپ نے اسے بند نہ ہونے دیا تو جو لوگ یہاں مقیم ہیں ان کے مخارج و ضروریات سب بدستور مہیا رہیں گے۔

ضرورت صرف اس کی ہے کہ قرآن حکیم پر، تفسیر بالرائے و عقلیت سے الگ رہ کر احادیث ناقابلِ انکار کا ساتھ دے کر، لغت و ادب کی بالکل نئی تحقیقات و کاوش سے مدد لے کر (جس سے نصف مشکلات حل ہو جاتی ہیں) قرآن کے حقائق اجتماعی کے انکشاف پر زور دیکر اور اس کے درس کو تمام مسائل و عقائد و اعمال بہمہ اقوام و امم و جہات مسئلہ

---

[1] دارالارشاد کی بنیاد رمضان ۱۳۳۳ھ (جولائی ۱۹۱۵ء) میں رکھی تھی اور ذی حجہ ۱۳۳۳ھ (اکتوبر ۱۹۱۵ء) سے درس شروع ہوگیا تھا۔

اصلاح و تبلیغ اہلِ اسلام پر محیط ہو کر کے درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور مسائل اصلاح و تبلیغ نیز تمام علوم اسلامیہ پر مجتہدانہ لیکچر دیئے جائیں۔

اگر آپ ایسا کرنے کے لئے تیار ہوں تو "دارالارشاد" بھی مع کتب خانے کے آپ کے سپرد کر دیا جائے گا۔ تاکہ آپ اس کو قائم رکھیں اور جب تک خدا مجھے دوبارہ مہلت نہ دے آپ میرے بعد کاموں کو التوا سے بچا لیں۔

زندگی چند روزہ ہے۔ ہم سب کو خدا کے حضور میں جانا ہے اور اپنے فرائض کے متعلق جواب دہی کرنی ہے۔ کام نہ میرا ہے، نہ آپ کا۔ اگر آپ نے اس خط کے پڑھنے کے ساتھ ہی تحریری وعدہ بھیج دیا تو میں مطمئن ہو جاؤں گا، ورنہ انشاء اللہ دعوتِ حق رکنے والی نہیں۔ وہ غیب سے کسی نہ کسی آدمی کو اس کے لئے بھیج دیگا اور اس نے ہمیشہ بھیجا ہے۔

"البلاغ" کے علاوہ بالکل علیحدہ ایک معتدل مسلک کا روزانہ اخبار "اقدام" بھی جاری ہوا ہے[۲]۔ وہ بھی آپ کے تحت ہو جائے گا اور ایک بڑا اسٹاف اپنے ماتحت آپ پائیں گے۔ امید ہے کہ دارالمصنفین وغیرہ اس میں مانع نہ ہوں گے کیوں کہ اس کو تو ہر حال میں قائم رکھ سکتے ہیں۔

فقیر ابو الکلام کان اللہ لہٗ

[ا] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک تفسیر قرآن کے اصول و مبادی کیا تھے۔

[۲] یہ روزانہ اخبار مولوی محی الدین احمد قصوری نے کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ افسوس کہ تھوڑی ہی دیر کہ یہ اخبار خلفشار ہی میں بند ہو گیا اور مولوی محی الدین احمد بھی اسے بند کرکے وطن آسنسول چلے گئے۔ یہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔

— ۱۱ —

ڈاک بنگلہ۔ رانچی
۸ راپریل ۱۹۲۶ء

برادرم السلام علیکم

میں سردست رانچی آ گیا ہوں۔ "البلاغ" جاری رہے گا۔ آپ اور تو کچھ نہیں کر سکتے تو کم سے کم اتنا کیجیے کہ ہر دو ہفتہ میں ایک مضمون بقدر آٹھ کالم کے بھیج دیا کیجیے اور مولوی عبدالسلام سے کہیے کہ ہر دو ہفتے میں وہ بھی ایک مضمون اتنی ہی مقدار کا لکھ کر بھیجیں۔ اس طرح دو فارم کا انتظام ہو جائے گا۔ باقی تین فارم خود لکھوں گا[1]۔ مولوی عبدالسلام صاحب سے کہیے کہ یا تو علمی ذوق سے لکھیں یا معاوضہ لیں۔ میں ہر طرح تیار ہوں۔ کم سے کم چند نمبر تک تو ایسا کیجیے۔ اس کی نسبت میں کچھ نہیں لکھتا کہ ایسا کرنا کہاں تک ضروری ہے۔ اس پر آپ خود غور کر سکتے ہیں۔

"البلاغ" کے ابواب آپ کو معلوم ہیں: مقالات، اسوۂ حسنہ، تذکرۂ علمیہ، انتقاد تاریخ وغیرہ۔ ان کے مقاصد بھی آپ کو معلوم ہیں۔ باب التفسیر میں خود لکھا کروں گا۔

براہ عنایت جلد جواب دیجیے۔ زیادہ وقت و فرصت نہیں۔

افسوس کہ باوجود اس قدر شور و غل کے کاموں کو جاری و باقی رکھنے والا کوئی نہ نکلا۔ اور تمام چیزوں کے لیے بحمد اللہ لوگ مستعد ہو گئے، اس کے لیے کوئی نہیں۔

فقیر ابوالکلام

---

[1] یہ بنگال سے اخراج کے بعد رانچی (بہار) پہنچنے کے بعد پہلا مکتوب ہے۔ اس وقت تک مکان کا کوئی انتظام نہ ہوا تھا اور مولانا کو ڈاک بنگلہ میں ٹھہرنا پڑا تھا۔ بعد ازاں مکان کا انتظام کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اخبار کے جاری رہنے کا کیا امکان تھا؟ چنانچہ مولانا کی رانچی کے بعد کوئی [illegible] نہ چھپا۔

— ۱۲ —

رانچی (بہار)
۱۷ - رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ
(۲۶ - جون ۱۹۱۸ء)

صدیقی العزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"انقلاب الامم" کے لیے شکریہ۔ ایسی ہی علمی اور گراں بحث کتابوں کا سلسلہ جاری رہا تو آپ کا قلم وہ کام کرے گا جو انجمن سازوں سے آج تک نہ ہو سکا۔

"انقلاب الامم" کو جو نہی کھولا تو دیباچے کے صفحہ ۱۲ پر نظر پڑی اور ایک سخت غلطی نظر آئی۔ مولوی عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے "وَالنَّاسُ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ" اور پھر اس سے ایک خاص استدلال کرتے ہیں اور کتاب کے بیان کردہ اصولات قرآن کو تطبیق دیتے ہیں۔ میں حافظ نہیں ہوں لیکن یہاں تک حافظہ کام دیتا ہے قرآن اس جملے سے بری ہے۔ مولوی صاحب کے حافظہ نے دھوکا دیا۔ اصل آیت یوں ہے "وَكُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ" یہ دو جگہ ہے۔ سورہ مومنون میں اور سورہ روم میں۔ والناس بما لدیہم فرحون کہیں بھی نہیں ہے۔ بہتر تھا کہ وہ تحریر کے وقت قرآن کی طرف رجوع کرتے۔ تعجب ہے کہ آپ نے بھی اس غلطی کو محسوس نہیں کیا۔

پھر ان کا استدلال بھی صحیح نہیں۔ بحث یہ ہے کہ ہر قوم کا خلقی و حیاتی اور وجدانی و دماغی کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور اس کی تمام حیات اجتماعیہ اس کے مطابق ہوتی ہے۔ لیبان وغیرہ اس کو اقوام کی فطرت اجتماعی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اس اصول کو اصل آیت کریمہ سے کوئی تعلق نہیں، نفیاً و اثباتاً، کیونکہ اس میں تو انسان کو اس کی ضلالت اختلاف و تفرقہ و تشتت و تحزب پر ملامت کی گئی ہے جس کو جا بجا قرآن "بغیاً بینہم" سے تعبیر کرتا ہے۔ مقصود قرآنی یہ ہے کہ اللہ کی شریعت نے لوگوں کو ایک ہی راہ سعادت

کی طرف بلایا اور وحدت و تالیف و جمعیت کی دعوت دی، لیکن یہ ایں ہمہ وہ ایک ہو کر پھر متفرق و تشتت ہو گئے، اور اسی طرح ہدایت کے بعد ضلالت اختیار کی۔ پھر کہاں اقوام کی فطرت اجتماعی اور اس کے خصائص و امتیازات کی بحث جس کا وجود ناگزیر اور اس لئے موجب تحسین ہے اور کہاں مخاطبین شرائع کی ضلالت تشتت و تفرق جس پر قرآن ماتم کرتا ہے۔

سورہ مومنون میں اس آیت کا سیاق و سباق ہے۔

وَلقد آتینا موسی الکتاب لعلھم یھتدون، وجعلنا ابن مریم و امہ آیۃ و آویناھما الی ربوۃ ذات قرار و معین. یاایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا، انی بما تعملون علیم، وان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون. فتقطعوا امرھم بینھم زبرا، کل حزب بما لدیھم فرحون. فذرھم فی غمرتھم حتی حین ۞

سورہ روم میں یوں ہے۔

واتقوہ واقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین، من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا۔ کل حزب بما لدیھم فرحون۔ الخ

آپ ان دونوں موقعوں کو دیکھتے ہیں کہ ان میں بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اقوام گذشتہ کا ہدایت الی صراط مستقیم کے بعد اتباع سبل متعددہ و تفرق و تشتت پر مائل ہونا بیان کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ اصل دین و تعلیم الٰہی وحدت و تالیف تھی، مگر انسانوں نے اپنی ضلالت کی وجہ سے راہ تعدد اختیار کی۔ کل حزب بما لدیھم فرحون میں ان کی کسی فطری حالت کی خبر نہیں دی گئی بلکہ سیاق و سباق و نظم بیان بتلا رہا ہے کہ ان کے متفرق ہو جانے اور ہر گروہ کے اپنے کو بر سر حق سمجھنے اور اس پر قانع و مسرور رہنے کو بہ لحاظ مذمت بیان کیا ہے اور یہ امر بالکل واضح ہے۔

"معارف" میں جو مضامین چھپتے ہیں ان میں بھی بعض اوقات ایسی غلطیاں رہ رہ جاتی ہیں جن پر مخالفین اعتراض کرسکتے ہیں. معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود تمام مضامین کو نہیں دیکھتے۔ پچھلے دنوں مولوی عبدالقادر پونا کا ایک مضمون "ابوحمزہ اصفہانی صاحب تاریخ ملوک الارض" پر چھپا تھا اور کسی پارسی کے انگریزی مضمون کا ترجمہ تھا اس میں جابجا "شامانی" کی کتاب الانساب کا حوالہ دیا ہے حالانکہ آپکو معلوم ہے کہ کتاب الانساب "سمعانی" کی ہے نہ کہ "شامانی" کی. انگریزی میں الف اور عین کا فرق مشکل ہے، اس لئے یا تو مضمون نگار نے یا مترجم نے سمعانی کو سامانی سمجھ لیا، لیکن آپ کو درست کردینا تھا بات بالکل واضح تھی۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

۱۳

رانچی

صدیقی العزیز الاجل!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ پہنچا۔ آپ لکھتے ہیں کہ مجھے علم نہ تھا کہ یہ سلسلہ مراسلت جاری رہ سکتا ہے آپ ایسے باخبر کی یہ مایوسی تعجب انگیز ہے مجھ سے پہلے اور لوگ نظر بند ہوچکے ہیں اور ان کی نسبت آپ کو ضرور معلوم ہے کہ زیر احتساب خط و کتابت کرسکتے ہیں اور کیوں جناب اگر واقعی ایسی حالت ہوجائے سلسلۂ مراسلت کا اجرا ممنوع ہو تو جب تو آپ قطعاً مجھے خط نہیں لکھیں گے جیسا کہ بخیال سد بابِ مراسلت آپ نے اب تک نہیں لکھا؟

یہ آخری بات محض مزاحاً لکھی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ میں خود اس بارے میں احتیاط کرتا ہوں. زمانے کی حالت دوسری ہی. لوگ اپنے سائے سے بھڑکتے ہیں اور ایمان کیلئے اگرچہ یقین و اثبات کے طالب ہیں

مگر ڈرنے کے وہم وخیال کو کافی سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں بیکار کسی ایسے شخص کو خط لکھنا، جس نے خود نہ لکھا ہو، اس پر ناقابل تحمل بوجھ ڈالنا ہے نظر بندی کے بعد میں نے خود اپنی طرف سے پیش قدمی چھوڑ دی ہے جو لکھتا ہے، جواب دیتا ہوں جو خاموش ہے اس کو بولنے پر مجبور نہیں کرتا۔

آپ کو بھی میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ معارف[1] کے ایک پرچہ کی ضرورت ہوئی تو دفتر کے نام کاروباری قسم کا خط لکھوا دیا۔ اب جب کہ آپ نے کتابیں بھیجیں اور ایک فروگذاشت نظر آئی تو ضروری معلوم ہوا کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے عرض کر دوں۔

یہ آپ نے خوب کیا کہ چٹ چھپوا کر تصحیح کر دی، لیکن اصل استدلال کی تصحیح کا اب کوئی علاج نہیں اور وہ کسی طرح صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ قرآن سے اس طرح کا استنباط کرنا قطعاً تحریف معنوی میں داخل ہے کجا آیت کا سیاق وسباق و مضمون اور کجا یہ بیان کا اصول! اصل سوال یہ ہے کہ اس آیت میں بیان واقعہ و خبر محض ہے یا اس پر ملامت کی گئی ہے؟ کل حزب الخ نصف ٹکڑا ہے فتقطعوا امرھم بینھم زبرا کا اور اس میں اس ضلالت اختلاف و تفریق پر ملامت کی ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہے اور جس کو دور کرنے کے لئے انبیائے کرام آتے ہیں۔ پھر کیا انبیاء اس لئے آتے ہیں کہ اقوام کی فطرت کو مٹائیں؟ بما لدیھم اختلاف مزاج ورجحان وامیال وغیرہ نہیں بلکہ الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیٔ الخ۔

اب میں نے پورے مقدمہ کو دیکھا: افسوس کہ صرف یہی استدلال نہیں بلکہ قرآن د

---

[1] اس سلسلے میں تفصیل ملاحظہ ہو۔ ۲۶ جون ۱۹۵۴ء کے مکتوب میں۔ مولانا سید سلیمان نے غالباً لکھا تھا کہ قرآن کی آیت کی تصحیح کر دی گئی ہو تو فرماتے ہیں کہ اصل معاملہ استدلال کا ہے۔ قرآن سے اس طرح کا استنباط تحریف معنوی ہے۔ اس کی تصحیح کیونکر ہو؟

حدیث سے بیان کے اجتماعی اصولوں کے استنباط و تطبیق کی جتنی کوشش کی ہے سب محل نظر ہے اور قریب قریب زبردستی کی تاویل۔ اگر وہ چاہتے تو اس سے زیادہ موثر و مدلل لکھ سکتے تھے۔ یا تو ان مباحث کو علمی نظر سے الگ کر چھوڑ دینا چاہئے یا لکھنا چاہئے تو اس طرح کہ قرآن ان مباحث کے مقابلے میں آکر پھیکا اور بے اثر نہ نظر آئے۔ انگریزی خوانوں پر اس کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اتنا ہی ہے تو کچھ بھی نہیں۔ مولوی عبدالسلام صاحب نے اصل کتاب کا ترجمہ اتنا پر زور، موثر، بلیغ اور دلچسپ کیا ہے کہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ یہ کافی تھا اور مقدمہ میں قرآن کو بیان سے ٹکرانے کی ضرورت نہ تھی۔ ابن خلدون وغیرہ بہت مناسب اور بہتر تھا۔ بہرحال خوشی اس کی ہے کہ ایک عمدہ اور علمی کتاب اردو میں شائع ہو گئی۔

اسی احمد فتحی زغلول نے ایک اور کتاب کا ترجمہ کیا ہے، سرتقدم الانگلیز السکسونیین۔ کتاب اس درجہ علمی نہیں لیکن تربیت و تعلیم اور تقاء امم کے مسئلے پر بہت ہی مفید اور ضروری ہے اگر اس کا ترجمہ بھی آپ شائع کر دیں تو بہت بہتر ہے اگر آپ کے پاس نہ ہو تو میں بھیج دوں۔

ابوالکلام

———(۱۴)———

رانچی (بہار)
۱۲، مئی ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

آج بعض مسائل کی نسبت سخت گمراہی پھیل رہی ہے اور اگر اس کا سدباب نہ ہوا تو ایک نہایت مفید دروازہ کھل کر بند ہو جائے گا۔ اس کے متعلق میں نے ایک مختصر تحریر اخبارات میں شائع کرانی چاہی تھی، لیکن لکھنا شروع کیا تو بہت بڑھ گئی اور اب اخبارات

کے لئے حد تحمل و اندراج سے باہر ہوگئی۔ مجبوراً آپ کو بھیجتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حتی الوسع جلد اور بہ عنوان مناسب اس کی اشاعت کا انتظام ہوجائے گا۔

صورتیں اس کی دو ہیں، ایک یہ کہ "معارف" میں نکل جائے، اگر آپ پسند کریں لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ اس ماہ کا نمبر عنقریب شائع ہونے والا ہوگا۔ اس میں گنجائش نہ ہوگی اور آئندہ ماہ پر رکھا جائے تو بہت زیادہ تاخیر ہوجائے گی اور مقصود بہ وجوہ مصالح تعجیل ہے بلکہ جتنی دیر باوجود تکمیل تحریر بھیجنے میں بہ وجہ قیود واقعہ ہوگئی، اسکو بھی نہ ہونا تھا۔ پس اگر اس ماہ کے نمبر میں اس کا اندراج ممکن ہو، اولاً نصف اول تو اس کی کوشش کیجئے۔ نصف ثانی آئندہ نمبر میں نکل جائے گا۔ اگر اس کا موقع باقی نہیں رہا ہے تو پھر ایک صورت اور ہے یعنی اس تحریر کو نسبتہً خفی قلم اور زیادتی سطور و مسطر کے ساتھ لکھوا چھپوا کر بہ صورت ضمیمہ زائد کے اسی نمبر کے ساتھ نکال دیا جائے اور چند دنوں کے لئے اس نمبر کی اشاعت ملتوی رہے۔ اس صورت میں میرا دوسرا مقصد بھی حل ہوجائیگا یعنی مستقلاً بہ شکل رسالہ بھی اس کی کچھ کاپیاں چاہتا ہوں۔ پس وہی ضمیمہ تین سو الگ بھی معمولی کاغذ پر چھپوا لیا جائے۔ علیحدہ "ٹائٹل" اس پر لگا دیا جائے گا۔

اس صورت میں "معارف" کے زائد اوراق اور علیحدہ رسالہ کے لئے، غرضیکہ جس قدر یہ ٹکڑا چھپے، اس کی اجرت و خرچ میرے ذمہ ہے، کیونکہ "معارف" پر اس کی معین ضخامت سے زیادہ بوجھ نہیں پڑنا چاہئے اور بہرحال مجھ کو چھپوانا ہی ہے۔ رقم مطلوب سے آپ مجھے مطلع کریں تاکہ بھیج دی جائے۔ اگر ایسا ہو تو موجب کمال تشکر ہوگا۔

لیکن اگر یہ دونوں صورتیں ممکن العمل نہ ہوں تو پھر از راہ عنایت جہاں تک جلد ممکن ہو اس کو بہ صورت رسالہ چھپوا دینے کا انتظام فرما دیجئے۔ پانچ سو نسخے کافی ہوں گے مطبع "معارف" میں چھپے اور اگر کسی وجہ سے دقت ہو تو لکھنؤ یا کانپور میں چھپوا دیجئے۔ اعظم گڈھ میں چھپنا تو تصحیح کی طرف سے آپ کی موجودگی اطمینان دلاتی کیونکہ جو مسودہ بھیج رہا ہوں اسمیں

کاٹ چھانٹ جا بجا ہے۔ اس صورت میں بھی فوراً اجرت طباعت سے مطلع کیجئے تاکہ روپیہ بھیج دیا جائے۔

مقصود اصلی اشاعت اور جلد اشاعت ہے۔ اگر الگ چھپے تو تقطیع "معارف" سے چھوٹی رکھی جائے یعنی "مخزن" کی تقطیع۔ کاغذ معمولی ہونا چاہئے اور خط زیادہ جلی نہ ہو۔

ایک اور ضروری بات ہے ابتدا میں چوں کہ خیال نہ تھا کہ تحریر بڑھ جائے گی اس لئے بلا فصل و عنوانات محض نمبروں کی ترتیب سے لکھنا شروع کیا گیا، لیکن اب دیکھتا ہوں تو تحریر بہت بڑھ گئی اور بیچ بیچ میں کہیں موڑ نہیں۔ پڑھنے والے اکتا جائیں۔ پس اب عنوانات کا قائم کرنا تو خالی از اشکال نہیں، البتہ جب کاتب لکھنا شروع کرے تو اتنی ہدایت کر دی جائے کہ تحریر میں جہاں جہاں سے نیا نمبر شروع ہوتا ہے، وہاں بین السطور وسط میں صرف لفظ فصل جلی قلم سے لکھ دیا جائے اور نمبروں کو نکال دیا جائے[۱] مسودہ ہی میں ایسا بنا دیا جائے۔ اس طرح کل بائیس جگہ لفظ فصل آئے گا کیونکہ کل بائیس نمبر ہیں۔

امید ہے کہ اس بارے میں پوری توجہ کام میں لائیں گے[۲]

ابوالکلام

—— (۱۵) ——

رانچی (بہار)
مئی ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

قلبی یحدثنی بانہ ستلقی —— ایک ہفتے سے زیادہ زمانہ گزرا کہ ایک رسالہ جسٹرڈ بھیجا گیا[۳] اب تک جواب و رسید سے محروم ہوں حیرانی ہے کہ کیا معاملہ پیش آیا۔ شاید آپ

---

[۱] نمبر نکالے نہ گئے۔ "معارف" میں یہ دستور باقی ہے اور یقیناً فصلوں کے مقابلے میں نمبر بہتر تھے۔ [۲] یہ اس مضمون کا ذکر ہے جو مساجد اور غیر مسلم کے عنوان سے نصف معارف کے مئی نمبر میں اور نصف جون نمبر میں شائع ہوا تھا۔ [۳] یہ یقیناً مساجد اور غیر مسلم کا ذکر ہے۔

اعظم گڈھ میں نہ ہوں، رمضان المبارک کی وجہ سے وطن آگئے ہوں لیکن اتنی مدت گذر چکی ہے کہ خط اعظم گڈھ سے آپ تک پہنچ سکتا تھا اور وہاں سے جواب آ سکتا تھا۔ بہرحال حقیقت حال سے جلد مطلع کریں۔ اگر کسی وجہ سے رسالہ مذکور کی اشاعت کا سامان نہ ہو سکے تو بلا تاخیر بیرنگ داروغہ الطاف حسین صاحب سکریٹری انجمن مدرسہ اسلامیہ اپر بازار رانچی کے نام بھیج دیں۔ بہ وجوہ جلد از جلد اس کی اشاعت مقصود تھی مگر مشیت الٰہی کہ یکے بعد دیگرے تاخیر ہوتی گئی۔ پہلے یہاں حصول اجازت وغیرہ میں، پھر آپ کی طرف سے بھی جواب نہیں ملتا۔ بہرحال طالب جواب ہوں اور خاموشی سخت موجب اضطراب۔

ایک اور ضروری معاملہ کے لئے لکھتا ہوں۔ مولوی فضل حق صاحب پرنسپل مدرسۂ عالیہ کا مدرسہ سے قطع تعلق ہو گیا ہے وہ ڈھاکہ اور کلکتہ جانے کے لئے مستعد تھے۔ مگر خیال ہوا کہ اگر دار العلوم ندوہ میں قیام ہو تو بہتر ہوگا۔ دار العلوم میں پرنسپل و صدر مدرس کی جگہ خالی ہے ایک زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم ان کو بلا رہے تھے اور کلکتہ میں میرے مکان پر گفتگو ہوئی تھی۔ علوم درسیہ و معقولات میں آج ممتاز سمجھے جاتے ہیں اور تجربہ کار وغیر متعصب و خوش تقریر و تدریس ہیں باقی علوم دینیہ میں جو حال اکثر مدرسین وقت کا ہے وہی ان کا ہے اصلاح تعلیمات و تغیرات کی ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بارے میں مولوی سید عبد الحئی صاحب کو خاص طور پر بہ تاکید لکھیں کہ وہ جلد بلا لئے جائیں۔ ہر طرح بہتر و موزوں ہوگا۔

رسالہ وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھنا ہو داروغہ الطاف حسین صاحب کو لکھئے مولوی سلطان رخصت پر بھوپال چلے گئے، اور وہ معاملہ دار وغہ صاحب ہی سے اب متعلق ہے۔

فقیر ابو الکلام کان اللہ لہٗ

(۱۶)

صدیقی العزیز۔ السلام علیکم

معافی خواہ ہوں۔ جواب میں بہت تاخیر ہوئی لیکن بلا عذر نہ تھی۔ مولوی مسعود
علی صاحب نے ازراہِ عنایت سیرت وغیرہ بھیج دیں، جس کے لئے شکر گذار ہوں۔ دارالمصنفین
سے تحائف تو ہمیشہ پہنچتے ہیں لیکن کبھی کوئی بل نہیں آیا۔ آخر آپ نے کوئی سالانہ یا ہوار فیس تو رکھی ہوگی
جلسہ کے موقع پر ملاقات کی امید تھی مگر پوری نہ ہوئی۔ تمرّ بہ الایام وھی کما ھیا
آپ کے ہموم وغموم کا حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا[1]۔ مجھے یہ تفصیل معلوم نہ تھی لیکن آپ کی
شاعرانہ مایوسیوں سے متفق نہیں ہوں۔ اوائل حوادث میں ایسے ہی احساسات ہوتے
ہیں لیکن فاقہ ما تحذرین قد وقع کے بعد خود بخود طبیعت سکون پذیر ہو جاتی ہے آپ نے
لکھا کہ معنوی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر بہ قول آپ کے معنوی زندگی کے لئے مادی سر و سامان
و محرکات ناگزیر ہیں اور نیز بہ قول آپ کے چاک دامنی کے لئے ایام گل کا اشارہ، تو
بتدریج خود ہی طبیعت اس کا انتظام کرے گی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ ہنگامہ آرائیوں کی شرکت چھوڑ دی۔ سچ یہ ہے کہ اس کے سوا
چارہ نہیں۔ اسوقت مزاج مبتلائے بحران ہے ترک علاج ہی شاید علاج ہو۔ آپ کا عمل
ابو ثعلبہ والی وصیت پر ہے۔ حتی اذا رأیتم شحاً مطاعاً وھوی متبعاً واعجاب کل
ذی رأی برأیہ فعلیک بنفسک ودع عنک امر العوام اعجاب کل ذی رای برأیہ
کا فتنہ موجودہ فتنوں سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ پہلے فتنۂ استبداد تھا۔ اب فتنۂ
حریت ہے۔ علم، اخلاق، مذہب، تقویٰ، جہادِ نفس کوئی شے بھی زمانہ کو مطلوب نہیں
صرف چند الفاظ جمہور کی ضرورت ہے۔ جو شخص ان لفظوں کو بلند آہنگی سے بول دے یہ

---

[1] غالباً اہلیہ کی وفات کا ذکر ہوگا۔

امام العصر ہے۔ "مقاماتِ مقدسہ" "نظر بندانِ اسلام" "قربانی کا وقت آگیا" صرف ان لفظوں کی بغیر مزج معانی پرستش ہو رہی ہے۔ شاید ایسا ہونا بھی ضروری تھا، اس لئے زیادہ شکایت بھی نہیں کرنی چاہئے۔

افسوس و تعجب ہے کہ مجی الملّت[1] وغیرہ خطاب کے قصے میں آپ نے بھی شرکت کی اندرونی مصالح کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بہ ایں ہمہ اگر کوئی بات مفید مصالح ہو، تو اس کو بہ عنوانِ مناسب و معتدل بھی طے کیا جا سکتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ شیطان اور فرشتہ کے درمیان اور کوئی متوسط درجہ نہ ہو۔

"معارف" کے متعلق یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ صرف یہی ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی، جو صرف خدمت علم و تصنیف و تالیف کیلئے وقف ہے

آپ نے تاریخ وفات کی نسبت لکھا ہے[2] سچ یہ ہے کہ اس کا کوئی صاف حل نہیں۔ ربیع کی کوئی بھی تاریخ قرار دیجئے۔ حجۃ الوداع سے حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا اِلّا یہ کہ اس سال کے لگاتار تینوں مہینے ۳۰ - ۳۰ یا ۲۹ - ۲۹ کے مانے جائیں۔ اس صورت میں ۶ اور ۱۳ کو دو شنبہ پڑتا ہے غالباً واقعہ وفات بارہویں گزر کر رات کو علی الصبح ہوا ہے۔ دوسرا دن تیرھویں کا تھا اور لوگوں نے بارہویں ہی تعبیر کر دیا۔

فقیر ابو الکلام

---

[1] یہ میر عثمان علی خاں نظام کو خطاب دینے کا مسئلہ ہے مولانا نظر بند تھے۔ علماء کے مختلف گروہوں نے جمع ہو کر مجی الملت والدین کا خطاب تجویز کیا تھا۔ غالباً یہ سب کچھ اسی غرض سے ہوا تھا کہ ترکوں کے ساتھ جنگ شروع تھی اور انگریز چاہتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کی توجہ کا مرکز کسی دوسری جگہ قائم کر دیں۔ [2] یعنی تاریخ وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ سیرۃ النبی صلعم میں رویت ہلال کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام مستند روایتوں کی بنا پر یکم ربیع الاول سنہ ۱۱ھ مطابق ۲۵ جون ۶۳۲ء تاریخ وفات بتائی گئی ہے۔ دلائل سیرۃ النبی جلد دوم میں ملاحظہ فرمائیں جائیں۔

۱۷۱ —

صدیقی العزیز۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

آپ کے دلچسپ خط نے پوری ملاقات کا لطف دیا۔ آپ کو اسقدر جلا عظم گڈھ کے گوشۂ عافیت سے برداشتہ خاطر نہیں ہونا چاہئے ساری باتیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ جہاں دلچسپیوں کی شورش ہے وہاں امن و جمعیت خاطر کہاں۔

اسباب خواہ کچھ ہوں مگر "محی الملت" خطاب والا معاملہ بہت بُرا ہوا۔ باقی (رہا) "الناظر" کا شور و شغب، تو اس میں بھی وہی غلو تھا جو مؤیدین خطاب کی تحریرات میں تھا اس کارروائی سے بجز چند اشخاص کے ذاتی فوائد یا چند انجمنوں کے وظائف کی اور کوئی نتیجہ نہیں لیکن یہ بات بہ عنوان مناسب بھی حاصل ہوسکتی تھی۔ انصاف کیجئے یہ کیسی بدعت ہے کہ جہاں کسی والیِ ریاست نے چند علماء یا چند انجمنوں کو روپیہ دے دیا حکم دیدیا کہ پرانے قرآن جمع کرلو "محی الملۃ والدین" ہو گیا! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کو صدر الصدور کردینا بہت عمدہ بات ہے مگر حیلۂ ملت و دین نہیں ہے مقصود اگر یہ تھا کہ امراء سے کام نکالا جائے اور جرأت و ہمت افزائی کی جائے تو اور بہت سے نسبتہً کم ناموزوں القاب ہوسکتے تھے اتنے بڑے لفظ کو خراب کرنا اور وہ بھی مجمع علماء کا بہت ہی افسوسناک ہے۔ فرض کیجئے اب حضور نظام واقعی کوئی کام احیاء ملت کا کریں یا کوئی اور رئیس کرے تو اس کے لئے اب کون خطاب باقی رہے گا؟ نصیر الملت پھر غنیمت تھا لیکن مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ نہیں وہی "وکیل" والی بات ہونی چاہیئے [2]

خیر، اب دیکھئے خود ندوہ کو بھی کچھ حصہ ملتا ہے یا نہیں نخرنگی محل اور دیوبند کی

---

[1] یہ خط جابجا سے کرم خوردہ ہو گیا ہے۔ اس لئے بعض الفاظ پڑھے نہ جاسکے۔

[2] مطلب یہ کہ "وکیل" اخبار نے جو تجویز پیش کردی ہے، وہ پوری ہونی چاہئے۔

شرکت کا آپ نے ذکر کیا ہے، لیکن یہ تو کچھ تعجب انگیز نہیں۔ دونوں جگہوں کو وفا الف ل رہے ہیں اگر یہ صحیح ہے کہ مولوی اشرف علی صاحب نے اس کی مخالفت کی تھی تو انکی بہت تعریف کرنی چاہیے۔ بلا شبہ یہ کارروائی شرعاً جائز نہ تھی۔ اذا رایتھم المداحین فاحثوا فی وجوھھم التراب کا مواخذ بہت سخت ہے۔ اور غالباً بخاری میں ہے من کان منکم مادحا لا محالۃ فلیقل احسب فلانا واللہ حسیبہ ان کان یری انہ کذلک ولا یزکی علی اللہ احداً۔ اور یہاں تو لا محالہ کی بھی گنجائش نہیں۔ فقہانے تو خطبۂ بین بجز دعائے خیر کے سلطانِ وقت کے لئے اور تمام باتوں سے۔ وکلہ ہے واذا مدح الفاسق غضب اللہ تعالیٰ واھتزلہ العرش۔

آپ نے ارض القرآن میں صابئین کی نسبت کتاب الرد علی المنطقیین ابن تیمیہ کی عبارت نقل کی ہے[1]۔ اس کے متعلق فرمایئے کہ یہ عبارت آپ نے کس صفحہ سے نقل کی ہے؟ یعنی وہ کتاب آپ کے پاس موجود ہے؟ تفسیر فتح البیان میں نواب صاحب نے ان الذین آمنوا والذین ھادوا والصابئین الخ کی تفسیر میں پوری عبارت نقل کی ہے اور بعض اور کتابوں میں بھی ہے۔ اگر آپ کے پاس کتاب مذکورہ موجود ہے تو میں خواستگار ہوں کہ ایک ہفتہ کے لئے مجھے عنایت فرمایئے۔ بحفاظت واپس کردونگا۔ سید علی بلگرامی کا نسخہ مولانا شبلی مرحوم کے پاس تھا۔ دوسرا نسخہ حکیم نورالدین صاحب قادیان کا تاجر دیوبند آیا، مولانا عبیداللہ صاحب کے پاس رہا، پھر غائب ہوگیا۔ ممکن ہے مولانا مرحوم والا نسخہ اعظم گڈھ میں ہو۔ بہرحال مجھ کو اس کی سخت ضرورت ہے اور ایک کام اس کی وجہ سے ناتمام رہ گیا ہے امید ہے کہ بصورت موجودگی آپ کو ترسیل میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ موجب کمال امتنان وتشکر ہوگا۔ صرف ایک ہفتہ بلکہ اس سے بھی کم کے لئے مطلوب ہے[2]۔

---

[1] ارض القرآن جلد دوم صفحات ۲۱۲-۲۱۳ ۔ [2] کتاب الرد علی المنطقیین کئی سال ہوئے خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق بمبئی میں چھپ چکی ہے۔

آپ نے دارالمصنفین کی موجودہ مالی حالت کا ذکر کیا ہے نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ یہ سب آپ کے قیام و سعی کا نتیجہ ہے بحمداللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی آخرجیات کی امیدیں بار آور ہوئیں لیکن یہ بڑی مصیبت ہے کہ آپ وہاں کے قیام سے اکتا گئے ہیں اگر آپ نے وہاں رہنا چھوڑ دیا تو پھر سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ کوئی ایسا انتظام کیجیے کہ "سیاہ مے خوردنہ ماہ پارسائی باشد"[1] کی اسکیم پر عمل درآمد ہو سکے۔ مستقل قیام وہاں رکھئے عارضی ہر جگہ

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

—(۱۸)—

صدیقی العزیز

مضمون جلدی میں لکھ کر بھیج دیا، مگر ایک بات کھٹکتی تھی۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ نپولین کے قیام مصر کے زمانے میں یہی مسئلہ چھڑا اور شیخ اسماعیل زرقانی نے فتویٰ دیا۔ اس وقت "تحفۃ الناظرین" پاس نہ تھی، کلکتہ کی کتابوں میں تھی۔ مسٹر فضل دین نے اب ڈھونڈ کر بھیج دی تو معلوم ہوا کہ حافظہ نے ایک سخت غلطی کی ہے یعنی فتویٰ شیخ جبرتی صاحب تاریخ نے دیا تھا اور اس فتویٰ کی بنا زرقانی کا ایک فتویٰ تھا۔ پس براہِ عنایت مضمون میں تصحیح کر دیجیے۔ "اسماعیل زرقانی شارح موطا و مواہب کی جگہ" شیخ عبدالرحمٰن جبرتی صاحب تاریخ عجائب الآثار" بنا دیجیے۔ نپولین کے داخلہ مصر سے کئی سال پہلے زرقانی کا انتقال ہو چکا تھا۔[2] کہیں لوگ پڑھ کر ابن مبارک والی بات نہ کہنے لگیں: ان بینہما مفاوز تنقطع فیہا اعناق المطی۔

ابوالکلام

---

[1] مطلب یہ کہ سال کا تھوڑا حصہ باہر گزاریئے زیادہ حصہ دارالمصنفین میں قیام کیجیے۔

[2] یہ تصحیح مضمون میں ہو گئی تھی۔

—(۱۹)—

رانچی (بہار)
۲۶ رمضان ۱۳۳۷ھ
(۲۵ مئی ۱۹۱۹ء)

صدیقی العزیز السلام علیکم

یہ تو اپنے کامل معنوں میں کشف ہے۔ خود مجھے خیال ہوا کہ تین سو کی تعداد کافی نہیں، زیادہ ہو، لیکن اس لئے نہیں لکھا کہ شاید کتابت رسالہ معارف و رسالہ کی ایک ہی رکھی گئی ہو۔ اور مئی نمبر کا حصہ بہ شکل رسالہ بھی چھپ چکا ہو۔ بہرحال یہ خوب کیا کہ تعداد پانچ سو کر دی۔ علاوہ عبارت ہدایہ کے معمولی غلطیاں کتابت کی بھی بہت تھیں، امید ہے درست ہو گئی ہونگی۔

ٹائٹیل کے متعلق استصواب کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے خود کچھ لکھ دیا ہوتا۔ بہرحال اختصار کے خیال سے میں نے صرف ادلۂ شرعیہ بنا دیا۔ بیکر بڑی انجمن کے اہتمام کی تصریح کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن دقت یہ ہے کہ آپ وطن جا رہے ہیں۔ اگر یہ خط آپ کی عدم موجودگی میں پہنچا تو کیا اعظم گڈھ میں کوئی صاحب کھول کر ٹائٹل لکھنے کے لئے دیدیں گے؟ غالبا یہ آپ کو دسینہ میں ملے گا۔

امید ہے کہ علاوہ رسالہ کے "معارف" میں تصحیح کر دی گئی ہو گی۔

مولوی فضل حق صاحب رامپوری کی نسبت معلوم نہیں ہوا کہ ندوہ والوں کا کیا قصد ہے اور مولوی عبدالحیؒ نے کیا جواب دیا؟ ادھر ان کا خط آیا تھا۔ امید ہے کہ آپ نے مکرر لکھا ہوگا جہاں تک مجھے معلوم ہے موجودہ مدرسین دارالعلوم میں سے کسی کو پرنسپل پر مقرر کرنا بہتر نہ ہوگا۔ کوئی مدرس ایسا نہیں ہے۔ بالکل غیر معروف

آدمی کے ہونے سے مدرسہ کی شہرت و وقعت پر بھی مفر اثر پڑتا ہے۔

ابوالکلام

(۲۰)

صدیقی الاعز السلام علیکم

آپ کا خیال درست ہے۔ آج بھوپال سے مولوی سلطان نے آپ کا خط بھیجا اور آپ کا کارڈ بھی ملا۔ تعجیل اشاعت کے لئے ممنون ہوں، علی الخصوص ایسی حالت میں کہ "معارف" کی اشاعت کی تاخیر تک گوارا کرلی گئی۔ امید ہے کہ نمبروں کی جگہ فصل بنادیا گیا ہوگا۔ واقعی بہ شکل رسالہ کوئی دوسرا نام ہونا چاہیے۔ آپ ہی کوئی تجویز کرکے رکھ دیں آپ نے جو نام لکھا ہے اس کا سجع ثانی بہت خوب ہے، یہی ہونا چاہئے۔ مگر ردالمجاہدین مانعین و مخالفین پر چوٹ پائی جاتی ہے اور نسبت جو د، اس لئے رسالہ حدود مناظرہ و جدول میں داخل ہوجائے گا اور یہ مقصود نہیں پس اس کو کسی دوسرے قافیہ سے بدل دیجئے۔ مثلاً "الشاہد" یا "الشواہد" یا "الفوائد" یا "جامع الشواہد"۔ آخری نام بہت پامال ہوچکا ہے، حتیٰ کہ "جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد" تک موجود ہے۔ یہ خوب ہوگا کہ وہاں اخراج وہابیین تک کی کوشش اور یہاں دخول مشرکین تک کی توسیع[1]

فنحن بواد والعذول بوادی

بہرحال کوئی اور قافیہ تجویز کریں اور وہی لوح پر درج ہو۔

پہلے خیال تھا کہ نماز جنازہ غائب والے حصے کو بھیج دونگا کہ رسالہ کے آخر میں درج کر دیا جائے، لیکن جب ستر تک صفحات پہنچ چکے تو اب مزید اضافہ خوب نہیں اس کے اختتام کے بعد "معارف" میں نکل جائے گا۔

---

[1] آخر "جامع الشواہد" ہی نام رہا۔

اجرت طباعت وغیرہ کے متعلق آپ نے کچھ نہیں لکھا۔ یقیناً آپ کا میرا معاملہ
اب اس حد سے گزر چکا ہے کہ اجرت و مصارف کے معاملہ کی نسبت کوئی تردد ہو اور اس بارے
میں یقین کامل رکھتا ہوں مگر یہ ظاہر ہے کہ رسالہ چھپے گا اور پریس کا وقت و مال خرچ ہوگا۔
پریس آپ کی ذاتی ملکیت نہیں۔ بلکہ دارالمصنفین کا ہے پس روپیہ کی ضرورت ناگزیر
ہے ازراہ عنایت مقدار لکھ دیں تاکہ مرسل خدمت ہو۔
"معارف" کا پہلا نمبر سلطان صاحب کے پاس دیکھا تھا میرے پاس نہیں آیا[1]

ابوالکلام

(۲۱)

صدیقی العزیز الاجل　　　السلام علیکم

(جون ۱۹۱۹ء)

"معارف" پہنچا۔ آپ کے پریس کے خوشنویس کا خط نسخ بہت اچھا ہے، ادا کیا
چاہئے، البتہ کتابت کی غلطیاں جا بجا رہ گئی ہیں۔ علی الخصوص عربی عبارتوں میں اور یہ
نقص در اصل میرے خط کی خرابی کا ہے کہ کاتب بآسانی پڑھ نہیں سکتا۔ ہمیشہ تجربہ ہو چکا
ہے آپ کے اور مولوی عبدالسلام کے مضامین میں کتابت کی غلطیاں بالکل نہیں
ہوتیں، اس لئے کہ مسودہ واضح اور خوشخط ہوتا ہے۔
البتہ ایک غلطی اہم ہے، اس کی تصحیح ناگزیر ہے کاتب نے ص ۵۸۲ نمبر ۹ میں کئی
سطریں درمیان سے چھوڑ دی ہیں اور چونکہ پورا حصہ منقول عبارت کا ہی اس لئے
بہ ظاہر عبارت میں کوئی بے ربطی نظر نہیں آتی۔ اس لئے مصحح کی نظر نہیں پڑی۔
نمبر ۹ میں پہلے "الاشباہ والنظائر" کی عبارت نقل کی تھی بغرض ہدایتکا اور ہدایہ

---

[1] یہ مکتوب مئی ۱۹۱۹ء والے مکتوب کے بعد کا ہے۔

کی عبارت کے ترجمے کے بعد "تکملہ فتح القدیر" قاضی زادہ کی۔ لیکن کاتب نے "اشباہ والنظائر" کی عبارت کے بعد اس کا ترجمہ اور "ہدایہ" کا حوالہ اور پھر عبارت "ہدایہ" کا ابتدائی حصہ بالکل چھوڑ دیا ہے اور عبارت "ہدایہ" کے ایک ٹکڑے کو "اشباہ والنظائر" سے ملا کر نقل کر دیا ہے، اس لئے بعد کی جس قدر بحث متعلق "ہدایہ" تھی وہ "اشباہ" سے متعلق ہو گئی لوگ حیران ہوں گے کہ ہدایہ کا نام بھی نہیں آیا، اس کی عبارت کی شرح و اشکال کی کیا بحث ہے اور قاضی زادہ نے اس کی شرح کب لکھی؟ پس براہ عنایت اصل مسودہ کا وہ موقع ملاحظہ کریں۔ غالباً اصل یوں ہی کہ عبارت اشباہ کی "ولو کان المسجد الحرام" پر ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد اشباہ کے صفحہ و کتاب کا حوالہ ہوگا اور غالباً ترجمہ بھی، پھر کوئی اور حوالہ ہوگا یا صرف یہ ہوگا کہ ہدایہ میں ہے:

"ولا باس بان یدخل اھل الذمۃ المسجد الحرام وقال الشافعی یکرہ ذالک"

اس کے بعد تھا "(الی ان قال) ولنا ما روی" الخ کاتب نے درمیان کا تمام حصہ چھوڑ کر (الی ان قال) ولنا الخ کو عبارت "اشباہ" سے ملا کر نقل کر دیا اور اس طرح بعد کا ترجمہ و بحث "اشباہ" سے متعلق ہو گیا۔

بہرحال آئندہ نمبر "معارف" میں اس کی تصحیح کر دیں اور حوالہ صفحہ و سطر دیکر چھوٹی ہوئی عبارت نقل کر دیں اور اگر رسالہ کی شکل میں یہ فارم مزید چھپ چکے ہیں تو کسی پرچہ پر الگ اتنا حصہ چھاپ کر نمبر ۹ والے صفحہ کے ساتھ رکھ دیا جائے۔

ف یہ پوری تفصیل اس مضمون کے متعلق ہے جو "مساجد اور غیر مسلم" کے عنوان سے "معارف" کے دو نمبروں میں شائع ہوا (مئی ۱۹۱۹ء و جون ۱۹۱۹ء) یہ مضمون مولانا نے ۲۴ رجب ۱۳۳۷ھ کو مکمل کیا تھا۔ (۲۵ اپریل ۱۹۱۹ء) جیسا کہ مضمون کے آخر میں مرقوم ہے پھر جامع الشواہد کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گیا تھا جس تصحیح کے لئے مکتوب میں تاکید کی گئی وہ مضمون کے آخر میں جون ۱۹۱۹ء کی اشاعت میں کر دی گئی تھی

کیوں جناب یہ "فاضل" وہی مولوی غلام محمد صاحب ہوشیارپوری کی تشریحات کا مشتق تو نہیں؟ ان کی تحقیقات یہ ہے کہ "ناضل" "فضول" سے مشتق ہے۔

آپ ہمارے مولوی عبدالسلام صاحب کے حسن اخذ و ترتیب و تزیین مطالب کا سلیقہ دیکھتے ہیں؟ صرف بغدادی کی ایک کتاب "الفرق" سے ایک اچھا خاصا پورا مضمون لکھ لیا ہے۔ گو اس میں بعض تفصیلات نئی ملتی ہیں اس لئے ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اس پر ریویو لکھا جائے لیکن مولوی عبدالسلام صاحب نے ایک مستقل مضمون تیار کر لیا۔[1]
سخت افسوس ہوتا ہے کہ با ایں ہمہ استعداد اہلیوں نے اپنی آپ کو کیوں گزارا ہے۔
مولوی عبدالباری صاحب کی رسالے اور اس کا فلسفہ چھپ گئی ہو تو بھجوا دیجئے۔

ابو الکلام

—(۲۲)—

رانچی (بہار)
۱۰ر جولائی ۱۹۱۹ء
صدیقی الاعز

السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ

معلوم نہیں آپ اعظم گڈھ میں ہیں یا وطن میں۔ رسالہ کی نسبت بھی معلوم نہیں ہو اکہ اس کی اشاعت میں کیوں تاخیر ہوئی۔
امید ہے کہ بخیر و عافیت ہوں گے۔

ابو الکلام

---

[1] یہ تحسین ہے مولانا عبدالسلام مرحوم ندوی کے اس مضمون کی جو "اسلام میں مختلف فرقوں کا نشوونما" کے عنوان سے اپریل ۱۹۱۹ء کے معارف میں شائع ہوا تھا۔

(۲۳)

رانچی (بہار)
اگست یا ستمبر ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز السّلام علیکم

مدت سے آپ خاموش ہیں۔ "معارف" کا جدید اہتمام دیکھ کر جی نہایت خوش ہوتا ہے آپ کے پریس سے مجامع الشواہد کا بل اب تک نہیں ملا۔ برابر انتظار رہا۔ براہِ عنایت بھجوا دیجئے۔

بالفعل ضروری بات یہ ہے کہ انجمن اسلامیہ رانچی[1] کا دوسرا سالانہ جلسہ ۲۴، ۲۵، ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو قرار پایا ہے۔ اس سال آپ کی شرکت نہایت ضروری ہے خواہ کچھ ہو مگر آپ کو آنا ہی پڑے گا۔ اگر آپ شریک نہ ہوئے تو بڑا قلق ہوگا۔ بہار کا جو حال ہے پوشیدہ نہیں۔ رنگون تک سے لوگ آئے مگر خود اس صوبے میں کسی کو توفیق نہ ملی تو آپ ہی اس فرض کفایہ کو فرض عین بنایئے۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ صوبہ بہار کی گذشتہ علمی زندگی و تعلیمی حالت پر ایک ایسا لکچر دیجئے (الفاظ مٹ گئے ہیں - - - - - - - - - - - - - -)

مولوی ابوالحسنات صاحب کو بھی ساتھ لایئے گو افسوس کہ عماد[ی] حیدرآباد میں ہیں اور جلسے نہیں جاسکتے اور حادثہ کانپور پر بھی بڑا زمانہ گزر چکا۔

ایک دن کا جلسہ صرف صوبے کے تعلیمی و علمی مذاکرہ کیلئے مخصوص کردیا ہے مولوی

---

[1] مولانا نے رانچی پہنچ کر ایک انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھدی اور ایک مدرسہ قائم کیا ابتدا میں مسجد میں بیٹھتا وصل کیا جاتا تھا پھر سالانہ جلسے ہونے لگے۔ اس کے زیر اہتمام ایک سکول جاری ہوا جسے اس وقت کالج کا درجہ حاصل ہے۔ ابتدا میں مولوی عبداللطیف حسین اس کے سیکرٹری تھے۔ مولانا نے بھی بعض مسائل میں انجمن کے واسطے کردیئے

ابوالحسنات صاحب بھی کوئی تحریر تیار کریں تو بڑی خوشی ہو۔

مشورۃً لکھیے کہ صوبہ بہار کے علما میں کون کون قابل دعوت اور مستحق سعی خاص ہیں؟ آپ لکھیں گے کوئی نہیں، لیکن یہ جواب تو تمام ملک بلکہ تمام دنیا کے لئے بھی دیا جا سکتا ہے۔

مولوی فضل حق صاحب کو ندوہ کے لئے دوبارہ لکھ چکا ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ انھوں نے حکیم صاحب کو کوئی تحریر بھیج دی ہے اور جانے کے لئے مستعد ہیں۔ اصل مدرسۂ عالیہ کی تنخواہیں ان کے پیش نظر ہیں۔ چاہتے ہیں کہ رام پور سے زیادہ توقعات ہوں تو اب نکلیں۔ میرے خیال میں تو ضرور پرنسپل کی تنخواہ بڑھا دینی چاہیئے۔

ابوالکلام

(۲۴)

صدیقی العزیز

اسلام علیکم

آپ نے شرکت کی امید تو دلائی، لیکن فیہ دخن۔ صرف اتنا ہی کافی نہیں۔ آپ کو ۱۴ تک ضرور تشریف لانا چاہیئے۔ کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ مسئلہ تدریج کی اہمیت سے کس فرد و بشر کو انکار ہو سکتا ہے لیکن تاریخوں کا ردّ و بدل تو آپ کے اختیار میں ہے یا تو پہلے فراغت ہو جائے اور جلسہ میں تقریر کریں، تو قلب و دماغ بالکل مطمئن و فارغ ہوں یا پھر رانچی سے واپسی پر رکھیے کہ یہاں کا قیام آتش شوق کے تیز ہونے میں بسر ہوگا۔ وکلا وعد اللہ الحسنیٰ۔ آپ حضرات ام حبیبہؓ کے نکاح والی سنت پر کیوں نہ عمل کریں[1]

بہرحال آپ ۱۴ تک رانچی ضرور پہنچیں، بلکہ پیشتر اور مولوی ابوالحسنات صاحب کو بھی ضرور لائیں۔ ان کی علالت کا حال سن کر سخت رنج ہوا

ابوالکلام

---

[1] یعنی نکاح بذریعہ وکیل

(۲۵۱)

رانچی (بہار)

۲ر جنوری ۱۹۵۰ء

صدیقی العزیز!

آپ کا خط ینزل الغیث من بعد ما قنطوا کا مصداق تھا۔

اذ کتبکم لم تدن منی تشوقا

ینشث لکم کتبی بشوقی الیکموا

جب بہت عرصہ گذر گیا تو مولوی ابوالحسنات کو لکھا۔ معلوم ہوا وطن میں ہیں اور ھلا بکراً تلاعبھا و تلاعبک کی تعمیل میں مشغول۔ اس مشغولیت میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا[1]۔ اگر آپ کو قیام رانچی میں میری کوتاہیاں محسوس نہ ہوئیں تو اس سے ان کا عدم نہیں بلکہ آپ کی محبت کا استغراق ثابت ہوتا ہے اس بات نے دل کی ندامت و اعتراف کو اور زیادہ کر دیا۔

سیرت حضرت عمرؓ کا شکریہ[2]۔ یہ بڑی کمی تھی جو پوری ہوگئی۔ یہ آپ بہت ہی خوب کرتے ہیں کہ دارالمصنفین کے سلسلہ میں مقدم و اہم کتابیں شائع کرتے ہیں عنوانات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالسلام صاحب نے اختصار بہت کیا۔ فقہ و اجتہاد اور مراسیل عمرؓ بن عبدالعزیز وغیرہ کے مباحث نہایت اہم تھے۔ ائمہ کی بعض عمارتیں انہی کی بنیادوں پر کھڑی ہوئی ہیں۔ علی الخصوص امام شافعیؒ۔ ان چیزوں کو غالباً چھوڑ دیا ہے، ائمہ فقہ و حدیث نے ان کی فقہ کو بہت اہمیت دی ہے۔

---

[1] یہ غالباً سید سلیمان مرحوم کی دوسری شادی کا ذکر ہے، جو پہلی اہلیہ کے انتقال کے بعد ہوئی تھی۔

[2] حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سیرت جو مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف تھی۔

"حقیقت" کی نسبت آپ نے لکھا ہے، لیکن لوگوں کے مذاق کی شتر گربگی کا کیا علاج؟
وہی "ہمدرد" کا حال ہو گیا ہے۔ حاجی بغلول اور تجاہل عامیانہ اور کیا کیا جاری ہے۔ یہ
حالات دیکھ کر طبیعت بالکل مکدر ہو جاتی ہے۔ اس اخبار کا شان نزول کیا ہے؟ کیا
"الناظر" نے نکالا ہے؟ آج کل آپ علم اسباب النزول کے مسلّمہ ماہر ہیں، خصوصاً
لکھنؤ کی تنزیلات کے لئے۔

ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بیجا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے
فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی لیکن لوگوں
کا پیمانہ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس کمبخت "تذکرہ" کی ساری باتیں
میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لئے بھیجا تھا
میں نے واپس نہیں بھیجا، اس لئے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع
کرنا چاہتے تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے۔ صرف اتنا
ٹکڑا صد درجہ ضمنی مطلولات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگا۔ خیال کیا کہ مقدمہ
کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا، لیکن انھوں نے بجنسہ چھاپ کر جلد باندھ کر
یکا یک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ
والے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرز تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ
کہ اس مرتبہ جب وہ جلسے کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیونکر
تبدیلی معلوم کی، تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا، جو کبھی کہا تھا۔ حالانکہ میں نے جو
بات کہی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے
اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے اور دونوں مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی
چاہتے ہیں وہ وہی ہے جو ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔

"معارف" کے لئے سیرت ابن تیمیہ کا ایک ٹکڑا جو عقل و نقل کی نسبت ہے، بھیجنا چاہتا

ہوں۔ مولوی یوسف نقل کر رہے ہیں۔ آپ نے کہا تھا، مذہب سلف و تفویض کی تائید صرف تخریب ہے تعمیر نہیں۔ آپ کی یہ بات میرے لئے نہایت تعجب انگیز تھی۔ بہر حال یہ ٹکڑا دیکھئے گا۔

آج باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ جامع الشواہد کا خرچہ طبع اب تک انجمن سے نہیں گیا۔ گو یہ معاملہ آپ سے متعلق نہیں، لیکن اس تاخیر کے لئے اپنا افسوس اور لاعلمی ظاہر کرتا ہوں۔ ان سے کہہ دیا ہے کہ فوراً بھیج دیں۔

ہاں سید احمد بھوپالی تعلیم ہی کی غرض سے لکھنؤ چلے گئے ہیں اس میں طلب و شوق واقعی ہے، لیکن آپ کی اصلاح میں وہ بھی اصلاح عالم کے فتنے میں اسیر ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ تعلیم کے سوا اور ساری باتوں کو اپنے اوپر حرام قطعی کر لو۔ اور مولوی سید عبدالحئی صاحب کو لکھا کہ کوئی انتظام کر دیں۔ انھوں نے بڑی مہربانی کی اور خارج از مدرسہ تعلیم کا انتظام کر دیا۔

الرد علی المنطق کا جو مکمل نسخہ حیدر آباد میں مولانا حمید الدین کو ملا تھا، اسی کا ٹھیک پتہ بتلا دیجئے۔ کیا کتب خانۂ آصفیہ میں ہے؟ امید ہے کہ مولانا موصوف سے دریافت کر کے مطلع فرمائیں گے۔

آپ امرتسر نہیں گئے؟ [1]

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

ابوالکلام

---

[1] اس سال کانگریس کا اجلاس نہایت خوفناک حالات میں بمقام امرتسر منعقد ہوا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا دردناک واقعہ پیش آچکا تھا۔ پنجاب میں مارشل لا کے ماتحت ایسے ظلم ہوئے تھے کہ جگہ جگہ ماتم کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی رہائی کے بعد سیدھے اس اجلاس میں پہنچے تھے اور رئیس الاحرار کی تقریروں نے جوش و فداکاری کی ایک نئی روح پیدا کر دی تھی۔ یہیں غالباً سب سے پہلی مرتبہ مجلس خلافت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جسے بعد میں عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ خود مولانا ابوالکلام یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے تھے اس لئے ان کا امرتسر پہنچنا ان کیلئے ممکن نہ تھا۔

—— (۲۶) ——

کلکتہ

۲۰ مئی ۱۹۲۳ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

آج مولوی عبدالرزاق صاحب نے آپ کا خط اور "الجامعہ" کا وہ نسخہ دکھایا
جس میں آپ نے پنسل سے اشارات کر کے بعض اغلاط واضح کئے ہیں۔ دیکھ کر نہایت
خوشی ہوئی کہ آپ کو اس کام کی صحت و خوبی کا اس درجہ خیال ہے فی الحقیقت یہی سب
سے بڑی مدد ہے جو ہم ایک دوسرے کی کر سکتے ہیں اور ہمیں باہم ایسی ہی توقع رکھنی چاہئے

آپ بے خبر نہ ہوں گے کہ "الجامعہ" کے دونوں نمبر میری عدم موجودگی میں نکلے ہیں
پہلے نمبر کے لئے میں صرف "فاتحۃ الجامعۃ" اور "حرکۃ الخلافۃ وسط الہند" دے گیا تھا۔ خیال
تھا کہ جلد لکھنؤ سے واپس آ جاؤں گا اور تمام مضامین میری موجودگی میں ترتیب پائیں گے
لیکن مجھے آگرہ و پنجاب کا سفر پیش آ گیا اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے اپنے شوق میں
بلا انتظار پرچہ مرتب کر کے شائع کر دیا۔ لاہور میں جب مجھے پرچہ ملا تو اشاعت کی جتنی
خوشی ہوئی تھی اتنا ہی اغلاط پر افسوس بھی ہوا۔ تاہم مولوی عبدالرزاق صاحب کو مستحق ملامت
نہیں سمجھتا وہ جو کچھ کر رہے ہیں، یہ بھی بہت ہے۔ ان کے شوق و مناسبت میں کلام
نہیں، صرف ضرورت مشق کی ہے چند دنوں تک مشق جاری رہی تو قلم محفوظ ہو جائیگا

آپ نے فاتحۃ الجامعہ پر بھی تین نشان کئے ہیں۔ پہلی غلطی صریح کمپوزر کی ہی ہے
کتابت کی غلطی نہیں ہے۔ یعنی "انما الدعوۃ الی الجامعۃ الشرقیہ" میں ضمیر رہ گئی ہے
باقی رہے بقیہ دو مقام تو ان میں ایک کی نسبت بلا شبہ آپ کی اصلاح بالکل صحیح ہے یعنی
"یتحد المتخاصمون" کی جگہ "یتصالح" ہونا چاہئے۔ وہ فقرہ خصومت کیلئے اتحاد موزوں نہیں
ہے، صلح موزوں ہے۔ لیکن دوسری اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ نے لکھا ہے

لہ "سنزید المقالات" کی جگہ "سنطبیہ" ہونا چاہئے لیکن میں خیال کرتا ہوں
سترہ بھی صحیح ہے۔

بقیہ مضامین میں جو غلطیاں دکھلائی ہیں، ان میں زیادہ ترکمپوز اور تصحیح کی غلطیاں
ہیں۔ مثلاً ولینبہ وغیرہ۔ جمع میں ایک ی کی کمی۔ جماعت کی جگہ غلط رسم الخط جماعت،
نقصان کی جگہ نقصانی وغیرہ ذلک۔ آپ کو کمپوزیٹروں کا حال معلوم ہی ہے جو اردو صحیح کمپوز
نہیں کر سکتے وہ عربی میں جس قدر باعث مصائب ہوں کم ہے۔ بڑی وقت تصحیح کی ہے مولوی
عبدالرزاق بھی تصحیح میں بہت پکے ہیں۔ غلطیاں رہ جاتی ہیں اور وہ تصحیح سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں
لیکن چند غلطیاں واقعی کتابت اور تراکیب کی ہیں اور آپ کے اشارات
بالکل صحیح ہیں مثلاً الذی کا استعمال، انعقاد عقد کی جگہ، انتفاضۃ نفس کی جگہ
من الترشیح الفسیم میں مفعول کا حذف وغیرہ۔

لیکن ایک دو مقام پر آپ سے بھی تسامح ہو گیا ہے۔ مثلاً یہ منہ ھو کی جگہ
یہ منہ ایاہ آپ نے لکھا ہے، حالانکہ یہ منہ ھو بھی صحیح نہیں ہے اور یہ منہ ایاہ بھی
نہیں ہونا چاہئے۔ صرف یہ منہ وہاں کافی و صحیح ہے۔ اسی طرح بہ اہتمام زائد کی جگہ آپ نے
البلغ بنا دیا ہے۔ حالانکہ زائد بھی ٹھیک ہے اور امثال موجود ہیں۔ ایک جگہ محکومین میں من نفس
ملک الدولہ کی جگہ بنفس ہے لیکن بہ ظاہر تو وہاں "من" ہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال اغلاط ضرور ہیں، خصوصاً بعض تراکیب کی۔ آپ نے خط میں لکھا ہے کہ دوسرا
نمبر اغلاط سے محفوظ ہے لیکن شاید ابھی اچھی طرح دیکھا نہیں۔ اس میں بھی نہ صرف کمپوز
کی بہ کثرت غلطیاں ہیں بلکہ الفاظ وغیرہ کی بھی۔ الحرکۃ الرھنا یہ میں ایک جگہ
کالنوایہ صرفت قواہم لکھے گئے ہیں یعنی صرف بمعنی خرچ۔ یہ اردو کا محاورہ ہے اور
عربی میں لکھ گئے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر غلطی یہ کی کہ سید رشید رضا کا مضمون بلا مناسبت ہو کر شائع کر دیا

بہتر یہ تھا کہ شائع ہی نہ کرتے یا میرے دیکھ لینے کے بعد شائع کرتے۔ یہ بات اس درجہ نامناسب ہوئی کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔

آپ آیندہ بھی جو اغلاط دیکھیں، مولوی عبدالرزاق صاحب کو ضرور لکھ دیں یا مجھے مطلع کریں۔ اس کی بڑی ضرورت ہے، اس میں مضائقہ و تغافل نہ کیجئے گا۔

مولوی مسعود علی صاحب اور مولوی عبدالسلام صاحب کو سلام کا شوق

ابوالکلام

(۲۷)

دریا گنج۔ دہلی

۷ رجنوری ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز

"ترجمان القرآن" کی پہلی جلد کسی نہ کسی طرح چھپ کر نکل گئی۔ آپ کو اس لیے نہیں بھیجی گئی کہ خیال تھا کلکتہ سے مجلد نسخے آجائیں تو بھجواؤں۔ لیکن آج ایک تار سے معلوم ہوا کہ دو ہفتے کی مزید دیر ہوگی۔ ادھر پولیٹکل حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ نہیں کہہ سکتا کتنے دنوں بلکہ گھنٹوں تک جیل سے باہر رہ سکوں گا، اس لیے طبیعت نے تقاضا کیا کہ غیر مجلد ہی بھجوا دوں۔

نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگزارید کہ ایں نسخہ مجزا ماند

امید ہے مع الخیر و عافیت ہوں گے۔ مولوی عبدالسلام صاحب کے مشاغل کا کیا حال ہے؟ ملتے ہوں تو سلام شوق پہنچا دیجئے۔ مولوی مسعود صاحب نہیں معلوم وہاں ہیں یا نہیں۔ اگر ہوتے تو آپ کے ذریعہ کہلاتا کہ نوٹ بکوں کا اب تک انتظار ہے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ابوالکلام

(۲۸)

دہلی

۲۸؍ جنوری ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز! چند دنوں کے لئے کلکتہ چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو لکھنؤ جانا پڑا۔ اب مہلت ملی تو سب سے پہلے آپ کے خط پر نظر پڑی۔ سحری کا وقت ہے چائے کا دور چل رہا ہے اور آپکو خط لکھ رہا ہوں۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ رمضان میں یہی دور میرے لئے جام صبوحی کا بھی کام دیتا ہے اور سفرۂ افطار کا بھی۔

مجلت نگر کہ در حنا تم لیا فتسدتیا
جز روزہ درست بہ صہبا آکشیدہ

آپ نے جس بات کی شکایت کی ہے، یقین کیجئے میں خود اسے بطور واقعہ کے محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے لوھر ارادہ کر لیا تھا کہ اب تمام کاموں سے الگ ہو کر محض تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہو جاؤں گا اور اگر موجودہ صورت حال اس طرح پیش نہ آگئی ہوتی۔ جس طرح پیش آئی ہے تو میں قطعاً یکسوئی کر لیتا۔ لیکن کیا کیا جائے رفتار زمانہ ہماری خواہشوں کی پابند نہیں۔

تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

آپ نے "ترجمان القرآن" جلد دوم کی اشاعت کے لئے جو آمادگی ظاہر کی ہے یقین کیجئے اس سے میرا دل نہایت درجہ متاثر ہوا۔ یہ محبت و اخلاص کا بڑے سے بڑا ثبوت ہے جس کا میں آپ سے متوقع ہو سکتا تھا۔ عملاً یہ بات ظہور میں آسکے یا نہ آسکے، لیکن میرے دل پر آپ کی محبت کا نقش ثبت ہو گیا۔

مجھے معلوم نہیں "معارف" پریس کا اب کیا حال ہے؟ کیا آپ بہ آسانی ایسی کتابیں چھپوا سکتے ہیں جو زیادہ مقدار میں چھپیں؟ اگر آپ نے انجن لگا لیا ہے تو آپ بڑی سے بڑی

تعداد چھاپ سکتے ہیں۔
جی چاہتا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو۔ دیکھئے اب کب ہوتی ہے؟
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

ابوالکلام

(۲۹)

۳-۲۔ اسٹور روڈ۔ کلکتہ۔
۸ ر جون ۱۹۳۲ء

صدیقی الاعز

امید ہے بخیر وعافیت ہوں گے۔ مدت ہوئی آپ نے لکھا تھا: ابن تیمیہ کی الرد علی المنطق نقل کرائی ہے۔ اگر نقل قابل اشاعت ہو اور کسی اور وجہ سے شائع نہ کر سکتے ہوں تو بہتر ہوگا۔ شیخ محمد منیر ازہری کے حوالہ کر دی جائے وہ ابن تیمیہ کی تمام بقیہ مصنفات شائع کرنا چاہتے ہیں اور الرد علی المنطق کے خواہشمند ہیں۔ میں نے انہیں قاضی شوکانی کی تفسیر "فتح القدیر" کی نسبت لکھا تھا وہ انھوں نے شائع کر دی۔

براہِ عنایت کتاب کی صورتِ حال سے مطلع کیجئے۔ مجھے جیل میں دورانِ سر کی شکایت ہوگئی تھی جس کی وجہ سے طبیعت بیحد مضمحل رہی۔ اب گونہ افاقہ ہے مولوی مسعود صاحب آگئے ہوں تو سلام پہنچا دیجئے۔ معلوم نہیں مولوی عبدالسلام صاحب آج کل کہاں ہیں اور کس عالم میں ہیں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۳۰)

۴۔ اسٹورروڈ۔ کلکتہ

۲۸۔ جون ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز

خط پہنچا۔ تفسیر "فتح القدیر" کا نسخہ خود مصنف کا لکھا ہوا صنعاء میں موجود تھا اسی کی نقل چھاپی گئی ہے۔ مدت ہوئی میں نے اس کی پہلی جلد نواب علی حسن خاں کے یہاں دیکھی تھی۔ مگر بالاستیعاب دیکھنے کا اب موقع ملا اور بہت مایوسی ہوئی۔ کوئی خصوصیت ایسی نہیں ملی، جس کی بنا پر اسے ممتاز تصور کیا جائے۔

آپ نے خط میں کسی اخبار کے مضمون کا ذکر کیا ہے مگر اشارہ اس درجہ مبہم ہے کہ میں سمجھ نہ سکا کس اخبار کی طرف اشارہ ہے۔ علاوہ بریں عبارت میں بعض الفاظ بھی غالباً چھوٹ گئے ہیں۔ "معارف" کا آخری پرچہ میں نے دیکھا، اس میں کسی اخبار کا ذکر نہیں ملا براہِ عنایت لکھیے، کون مضمون اور کس اخبار میں شائع ہوا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

(۳۱)

۴۔ اسٹورروڈ۔ کلکتہ

۱۴؍ اگست ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز

ایک کارڈ اعظم گڈھ سے ہوکر دفتر میں پہنچا ہے، جس میں "ترجمان القرآن" کی درخواست "معارف" کے حوالے سے درج ہے۔ کیا آپ نے معارف میں کچھ لکھا ہے؟ میری نظر سے وہ پرچہ نہیں گزرا۔ اگر ممکن ہو تو بھجوا دیں۔

جلد دوم بقول آپ کے "معروف استراحت" ہے، لیکن "مسند تصنیف" پر نہیں

آغوش کتابت و طباعت میں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس مرحلہ کی مصیبتیں کیوں کر حل کی جائیں۔

میں نے تو اب فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کا بقیہ انفاس صرف اسی کام کے لئے وقف کر دوں۔ دیکھئے مہلت ملتی ہے یا نہیں[1]؟

انشاء اللہ کوشش کروں گا کہ معارف کے لئے وقت نکالوں۔

والسلام علیکم

ابو الکلام

(۳۲)

۴۔ اسٹور روڈ۔ کلکتہ

۲۰ اگست ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز۔ چونکہ ایک درخواست میں "معارف" کا حوالہ دیا گیا تھا اس لئے خیال ہوا کہ شاید کوئی تحریر نکلی ہے۔ اب معلوم ہوا وہ اشتہار تھا۔ آپ نے اشتہار کی مزید اشاعت کے لئے جو آمادگی ظاہر کی ہے، اس کے لئے شکر گذار رہوں۔

خیام پر اگر کچھ آپ نے لکھا ہے تو یہ بے کار کام کیوں ہوا؟ خیام کے بعض رسائل کا مجموعہ روس سے شائع ہو چکا ہے، کیا ان کے علاوہ نئے رسائل دستیاب ہوئے ہیں؟ اگر غیر مطبوعہ رسائل ہیں تو یقیناً یہ ایک قیمتی اضافہ ہوگا، انہیں ضرور شائع کیجئے

یا دش بخیر، مولوی عبد السلام صاحب آج کل کہاں ہیں اور کس عالم میں ہیں؟ اگر اعظم گڈھ میں ہوں تو سلام پہنچا دیں۔

والسلام علیکم

ابو الکلام

---

[1] مہلت نہ ملی اور یہ ارادہ بارہا فسخ ہوا۔

(۳۳)

کلکتہ
۲۷ اگست ۱۹۳۲ء

صدیقی العزیز

مدت ہوئی میں نے ایک مجموعۂ رسائل دیکھا تھا جس میں خیام کے بھی دو رسالے تھے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ روس کا چھپا ہوا تھا۔ غالباً روسی مستشرق کی سالگرہ کی تقریب پر مرتب کیا گیا تھا۔ قیمت زیادہ تھی، اس لئے میں نے اس وقت نہیں لیا۔ کچھ دنوں کے بعد دریافت کیا تو معلوم ہوا موجود نہیں ہے۔

یہ مجموعہ مولوی شرف الدین مرحوم نے بمبئی میں منگوایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی جرمنی یا ہالینڈ کا ایک مجموعہ رسائل ہے، جس میں بو علی سینا کے رسائل ہیں۔ اس مجموعہ میں غالباً الکون والتکلیف چھپ گیا ہے۔ یہ مجموعہ میرے پاس ہے لیکن دہلی میں ہے اور مکان بند ہے۔ میں ہفتہ عشرہ میں جا رہا ہوں، جاتے ہی دیکھوں گا اور آپ کو اطلاع دوں گا۔ ممکن ہے میرا حافظہ غلطی کر رہا ہو، لیکن آپ کے ناموں میں الکون والتکلیف اور کلیات الوجود مجھے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔

غور کرنے سے یہ بات بھی یاد آتی ہے کہ الکون والتکلیف بہت مختصر ہے، زیادہ سے زیادہ چار پانچ صفحات ہوں گے اور غالباً کسی سائل کے جواب میں ہے

یہ تاثر بھی یاد ہے کہ اس میں کوئی قابلِ اعتنا بات نظر نہیں آئی تھی۔

آپ کے پاس اکتفاء القنوع کا نیا ایڈیشن ہے یا نہیں جو ڈاکٹر اڈو[illegible] نے کئی جلدوں میں از سر نو مرتب کر کے شائع کیا ہے؟ اگر ہو تو اس میں دیکھیے۔ اگر نہ ہو تو شرف الدین اینڈ سنس بمبئی، بھنڈی بازار کے پاس موجود ہے، منگوا لیجیے۔ مطبوعات عربیہ کے لئے بہت حد تک اب مکمل فہرست ہو گئی ہے خصوصاً مطبوعات یورپ کا پورا استقصا کیا ہے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

—(۳۴)—

۶ اگست ۱۹۳۵ء

جی فی اللہ   السلام علیکم

انجمن اصلاح المسلمین کان پور کئی سال سے ذکر سیرت کا اجتماع منعقد کیا کرتی ہے گزشتہ سال تمام ارکانِ انجمن اس کے خواہش مند تھے کہ آپ وقت نکالیں اور جلسہ میں تقریر کریں، لیکن آپ وقت نہ نکال سکے۔ امسال پھر ربیع الاول میں جلسہ ہونے والا ہے میں چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہوسکے آپ وقت ضرور نکالیں اور ارکانِ انجمن کو ناامید نہ کریں۔ یہ لوگ اخلاص و مستعدی کے ساتھ یہ کام کر رہے ہیں اور ضروری ہے کہ ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

—(۳۵)—

کلکتہ

صدیقی العزیز!

مصری وفد کی بڑی لمبی داستان ہے .. .. نے سب کو بے وقوف بنانا چاہا، لیکن چونکہ مسلمانوں میں بے وقوف بننے کی استعداد زیادہ ہے اس لیے سب سے زیادہ یہی بنے۔ سب سے پہلے بمبئی کے چند فرصت طلبوں نے ڈاکٹر امبیدکر کے اعلان اور مسٹر گاندھی کے معاملے کو ہر طرح کے مبالغوں سے آراستہ کرکے مصر پہنچایا۔ پیر عبداللہ نوزان بھی اس چکر میں آگئے اور جمعیت شبان قاہرہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی کہ ہندستان کے تمام اچھوت مسلمان ہونے کیلئے تیار ہوگئے ہیں۔ علمائے ازہر کا ایک تبلیغی وفد ضرور بھیجنا چاہیئے۔ مالابار کے ایک طالب علم عبدالقادر نے بھی بہت سی غلط سلط باتیں لکھ دیں اور غالباً لاہور کے علامہ مکانا نے بھی اس میں کافی حصہ لیا۔ وہ قاہرہ میں ڈاکٹر عبدالحمید سے

مل چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے ان سے خط و کتابت کی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے جب ترسیل وفد کے انتظامات مکمل ہو گئے تو شیخ ازہر اور ارکان جمعیت نے یکایک محسوس کیا کہ صورتحال قابل اعتنا نہیں ہی مزید معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ اکتوبر میں شیخ مراغی کا ایک خط مجھے وصول ہوا تھا اور بعد کو بمبئی سے عبداللہ فوزان کا بھی ایک خط ملا تھا۔ دونوں نے استفسار کیا تھا کہ کسی تبلیغی وفد کی ترسیل سود مند ہوگی یا نہیں؟ میں نے انہیں لکھا تھا کہ اچھوتوں کے لئے مصر کا وفد یہاں آکر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس غرض سے وفد کا بھیجنا نہ صرف بے سود ہوگا، بلکہ کئی اعتبار سے مضر ثابت ہوگا۔ لیکن اگر آپ وفد کا اہتمام کر چکے ہیں تو اسے ایک صحیح اور ضروری مقصد کے لئے کیوں نہ کام میں لائیں؟ یعنی مصر اور ہندستان کے علمی اور اسلامی روابط کے استحکام و ترقی کے لئے بھیجیں۔ یہ وہ کام ہے جو برسوں پہلے ہونا تھا، کم از کم اب شروع کیا جائے۔

معلوم نہیں پھر کیا ہوا؟ مصر ہی میں یہ بات قرار پا گئی تھی یا بمبئی پہنچ کر اور صورت حال دیکھ کر قرار دی گئی؟ مگر بہرحال وفد نے محض تعلیمی نوعیت اختیار کر لی اور یہ بہت اچھا ہوا علمائے وفد بہرحال ازہری ہی ہیں، اس لئے کوئی زیادہ توقع تو کی نہیں جا سکتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اب ازہر وہ ازہر نہیں رہا جو پچاس برس پہلے تھا اور جس سے شیخ محمد عبدہٗ کو بالکل مایوس ہو جانا پڑا تھا۔ اب ازہری مولوی بہرحال وقت کی عام مولویانہ سطح سے بلند تر نظر آ سکتا ہے اور شیخ مراغی کی اصلاحات نے تو واقعی اسے بالکل ایک نئے عالم میں پہنچا دیا ہے۔

میں نے آپ کی موجودگی کا حال جس غرض سے دریافت کیا تھا، اس سے عنقریب مطلع کروں گا۔ فروری کے دوسرے ہفتہ تک تو آپ اعظم گڑھ ہی میں ہیں۔

یادش بخیر مولانا عبدالسلام صاحب کا کیا حال ہے؟ اگر اعظم گڑھ میں ہوں تو سلام پہنچا دیجئے۔ افسوس ہے مولوی مسعود علی صاحب نے تو بیماں نہیں بھیجیں۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلام

لہ صحیح تاریخ کا تعین [illegible]

(٣٩)

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء

حبی فی اللہ   السلام علیکم

معاف کیجیے گا، جواب میں تاخیر ہوئی۔ میں کلکتہ میں نہیں تھا۔ ڈاک یہیں جمع ہوتی گئی۔ آپکا خط بھی اسی میں رہا۔ واپسی کے بعد علالت نے دو ہفتہ تک مہلت نہیں دی۔ اب جواب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بلا شبہ آپ کی شکایت بجا ہے۔ ہمیشہ خیال رہا کہ اعظم گڈھ کے لیے وقت نکالوں اور ہمیشہ یہی ہوا کہ قدم نہ اٹھا سکا۔ مگر مشکل یہ ہی کہ جب مجھے میرے لئے کون بلانا چاہتا ہے؟ جو بلاتا ہے، کسی جلسے کے لئے، مدرسہ کے لئے اور وعظ و تقریر کے لئے اور میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ کوئی بات بھی طبیعت پر اس درجہ گراں نہیں گزرتی، جس قدر جلسوں کی شرکت اور فرمائشی تقریریں۔ اگر میں اعظم گڈھ آؤں تو وہاں بھی یہی مصیبت ہوگی۔ آپ تک اس کے خواہشمند ہوں گے کہ ایک جلسہ اور تقریر ضرور ہونی چاہئے۔

اس بارے میں اپنی طبیعت کا حال بیان نہیں کر سکتا۔ بیان کروں تو امید نہیں کہ احباب اسے سمجھنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس بارے میں تمام دنیا کو شاکی پاتا ہوں، مگر میں بھی صورت حال پر قانع ہو گیا ہوں۔

ادھر مدرسہ مئو ناتھ بھنجن کے لئے مولوی رشید الدین صاحب[1] نے اصرار کیا، پھر لکھنؤ آئے اور اصرار کو انتہائی حد تک پہنچا دیا۔ میرے لئے بہت ہی دشوار تھا کہ ان کے اصرار کے مقابلے میں اپنی عذر خواہی پر قائم رہ سکوں۔ مدرسہ کے متعلق میرے تاثرات یہ ہیں کہ یہ ایک صحیح معنوں میں مخلصانہ کام انجام دیا گیا ہے۔ میں مدرسہ کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں، ضرور کرونگا، لیکن وہاں جو کچھ ہو رہا ہے جلسہ اور وعظ گوئی یہ ہے میرے لئے یہ زیادہ سے زیادہ دشوار اور ناقابل برداشت کام ان کے لئے یہی سب سے زیادہ ضروری۔ اب اس کے سوا چارہ

---

[1] برادر مولوی حمید الدین مرحوم۔ اب ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے

نہیں کہ تعمیل کروں۔ انشاء اللہ کرتا ہوں نہیں کروں گا۔ بڑی بات یہ بھی ہوگی کہ اعظم گڑھ آنے اور آپ لوگوں سے دارالمصنفین میں ملنے کا قدیم ارادہ پورا ہو جائیگا۔ کاش سہ شنبہ میں یہ جلسہ کا معاملہ نہ ہوتا۔ میں جاتا، مدرسہ کو دیکھتا، اور کارکنوں سے ملنے کی خوشوقتی حاصل کرتا۔

ابوالکلام

(۳۷)

کلکتہ۔

۳ر فروری ۱۹۳۷ء

صدیقی العزیز

یوپی میں پولنگ تو ۸ر فروری ۱۹۳۷ء تک ختم ہو جائے گی۔ اور پھر جو کچھ بھی ہو آپ سے اور دارالمصنفین سے اس کا رشتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ آپ کا ووٹ ہوگا۔ جو آدھ گھنٹے میں آپ دے آئیں گے یا کسی دوست کے لئے مساعی ہونگی تو جہد وسعی کا زمانہ اب ختم ہو رہا ہے۔ آپ لکھتے ہیں "۲۰ر فروری کے بعد موسم اچھا ہو جائیگا" اچھا کیا خاک ہوگا؟ گرمی شروع ہو جائے گی۔ آپ کے اس مقدمہ سے مجھے قطعاً اختلاف ہے کہ موسم کی موجودہ حالت اچھی نہیں اور اچھا موسم "اس وقت ہوگا جب اچھا موسم ختم ہو جائے گا۔"

براہِ عنایت مجھے بلا تاخیر مطلع کیجئے کہ لکھنؤ سے کب واپسی ہوگی یا لکھنؤ سے جس دن چلیے، مجھے تار دیدیجئے کہ اعظم گڑھ جا رہا ہوں۔

کیا آپ سمجھتے ہیں میں نے مولوی عبدالرزاق صاحب[1] کو نہیں سمجھایا ہوگا؟ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی طبیعت نے دوسرا رنگ اختیار کر لیا ہے اور اب نصیحت و تذکیر بے فائدہ ہے۔ ادھر عرصہ سے وہ ملے بھی نہیں۔ ان کا اخبار بھی میری نظر سے نہیں گزرتا، کیا ادھر انھوں نے اس قسم کا کوئی مضمون شائع کیا ہے؟ والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم

(۴۸)

صدیقی العزیز السلام علیکم

آپ نے کہا تھا، الرد علی المنطقیین ابن تیمیہ کا نا مکمل نسخہ آپ کے پاس مستقر حیدرآباد موجود ہے۔ کیا آپ اس کی مجھے ایک نقل دے سکتے ہیں؟ نقل کی اُجرت کی دیدی جائے گی۔ یا ممکن ہے کہ ایک ماہ کے لئے آپ وہ نسخہ میرے پاس بھیج دیں[1]

ابوالکلام

---

[1] اس کا کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ لہذا اسے تمام خطوط کے آخر میں جگہ دیدی ہے۔

مکاتیب کا چوتھا مجموعہ

یہ مجموعہ متفرق مکاتیب پر مشتمل ہے، جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم ۱
۲۔ محمد اکبر صاحب بہ جواب دعوت شمول نکاح ۱
۳۔ جناب عبدالرحمٰن صاحب ممبر پارلیمنٹ ۱
۴۔ حکیم سعید اللہ صاحب گیاوی ۳
(اول بہ سلسلہ "ترجمان" باقی دو بہ سلسلہ احمدیت)
۵۔ مولانا انشاء اللہ خاں ایڈیٹر "وطن" لاہور ۱
۶۔ مکتوب الیہ غیر معلوم ۱
۷۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم و مغفور امرتسری
۸۔ جناب عبداللہ صاحب بٹ ۱
۹ حکیم عبدالقادر صاحب دامانی ۴
۱۰۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم ۱
(بہ سلسلہ تعلیم حکیم عبدالقادر)

ان میں سے بیشتر مکاتیب کے ساتھ تشریح کے لئے حواشی موجود ہیں۔

(۱)

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے نام

خواہی کہ بہ تو بیش شود شوق نظیری
از پیش خودش گاہ بران گاہ نگہدار

یا جناب الجلیل الاعز، انعم اللہ علی بقائکم

دفتر سے معلوم ہوا کہ "الہلال" کے جو پرچے خدمت عالی میں جاتے ہیں بجنسہٖ واپس آ جاتے ہیں۔ ایک پرچہ میں نے بھی دیکھا۔ اس پر لکھا تھا کہ مکتوب الیہ کو لینے سے انکار ہے۔

میرے دل عقیدت کیش کے لئے تو اتنی نسبت بھی بہت ہے کہ آستانۂ مبارک تک "الہلال" پہنچے اور محروم واپس آئے۔ تاہم اس بے التفاتی کا سبب معلوم کرنے کے لئے بے قرار ہوں۔

میں نے پیشتر ہی عرض کر دیا تھا کہ حاضری سے ارادت کیشوں کو نہ روکیے، ردّی کی ٹوکری ہی تو آخر جگہ مل ہی سکتی ہے۔

جب کبھی کلکتہ سے نکلتا ہوں تو ارادہ کرتا ہوں کہ آستانۂ مبارک پر قدم بوسی کے لئے حاضر ہوں لیکن محرومی پہنچنے نہیں دیتی۔ شاید اب خود سمجھ میں پانی پت حاضر ہوں، گو ڈرتا ہوں کہ "الہلال" کی طرح میری دلی عقیدت کی قبولیت سے بھی انکار ہو۔

ل‍ه مولاناؒ نے "الہلال" ان کی خدمت میں اعزازی جاری کیا تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مرحوم، ہر پرچے پر یہ لکھ کر واپس بھجوا دیتے کہ مکتوب الیہ لینے سے انکاری ہے اس لئے کہ وہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے اور یہ گوارا نہ تھا کہ پرچہ بھیجنے والے کا خواہ مخواہ نقصان ہو۔ مولانا نے اصرار کیا تو پھر "الہلال" کو خواجہ صاحب نے قبول فرما لیا اور دوسروں سے پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے۔ یہ مکتوب ۱۹۱۲ء کا ہے۔

(۴۰)

۱۹ ۔ اے بالی گنج سرکلر روڈ ۔ کلکتہ

۵ ، جنوری ۴۲ ۱۹ء

عزیزی ۔ تمہارا خط پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی ۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اب تمہیں زندگی کی وہ منزل پیش آگئی ہے جہاں انسان کی شخصی زندگی کی ذمہ داریوں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے ۔ یعنی تمہاری شادی ہو رہی ہے میرے لئے ممکن نہیں کہ میں اس موقع پر شریک ہو سکوں ۔ لیکن یقین رکھو میرے دل کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ۔ میں اپنی جگہ اپنی دعائیں تمہارے پاس بھیج رہا ہوں ۔

زندہ باشی و کامراں باشی

اللہ تعالیٰ اس تقریب کو برکت وسعادت کا موجب بنائے اور تمہاری یہ نئی زندگی ہر اعتبار سے کامیاب ہو ۔

میں اس موقع پر تمہیں یاد دلاؤں گا کہ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے تمہیں چاہئے ازدواجی زندگی یعنی شادی کی زندگی کا وہ تصور اپنے سامنے رکھو جو قرآن حکیم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون [1]

خدا کی حکمت کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیئے یعنی مرد کیلئے عورت اور عورت کے لئے مرد ، لیکن خدا نے ایسا کیوں کیا ؟ اس لئے کہ تمہاری زندگی میں تین چیزیں پیدا ہو جائیں جو ان تین چیزوں کے بغیر

---

[1] اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ بنا دیئے تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو کر ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی ۔ البتہ اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کے لئے جو دھیان کرتے ہیں ۔ (سورہ روم)

تم ایک مطمئن اور خوشحال زندگی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں۔

۱. سکون

۲. مودّت

۳. رحمت

لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمہ

سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہو کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے کہ زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں اسے ہلا نہ سکیں۔

مودت سے مقصود محبت ہے۔ قرآن کہتا ہے ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پہ ہے شوہر بیوی سے اور بیوی شوہر سے اس لئے رشتہ جوڑتی ہے تاکہ ان کی ملی جلی زندگی کی ساری تاریکیاں محبت کی روشنی سے منور ہو جائیں۔

لیکن محبت کا یہ رشتہ پایدار نہیں ہو سکتا، اگر رحمت کا سورج دلوں پر نہ چمکے رحمت سے مقصود یہ ہے کہ شوہر اور بیوی نہ صرف ایک دوسرے سے محبت کریں بلکہ ایک دوسرے کی غلطیاں اور خطائیں بخش دینے اور ایک دوسرے کی کمزوریاں نظر انداز کر دینے کے لئے اپنے دلوں کو تیار رکھیں۔ رحمت کا جذبہ خود غرضانہ محبت کو فیاضانہ محبت کی شکل دے دیتا ہے ایک خود غرض محبت کرنیوالا صرف اپنی ہی ہستی کو اپنے سامنے رکھتا ہے، لیکن رحیمانہ محبت کرنیوالا اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور دوسرے کی ہستی کو مقدم رکھتا ہے۔ رحمت ہمیشہ اس سے تقاضا کریگی کہ دوسری کمزوریوں پر رحم کرے، غلطیاں اور خطائیں بخش دے، غصہ غضب اور انتقام کی پرچھائیں بھی اپنے دل پر نہ پڑنے دے

میری دلی آرزو ہے کہ خدا تم دونوں کو توفیق دے کہ اپنی ازدواجی زندگی کو اوّل دن سے اسی رنگ میں شروع کرو جس رنگ میں قرآن کی مقدس تعلیم نے اس معاملہ کو دیکھا ہے اور نوع انسانی کے آگے رکھا ہے یہ نوشتہ کچھ

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ
ابوالکلام

(۳)

بندھیاچل، مرزاپور
۲۲ر نومبر ۱۹۴۵ء

عزیزی۔ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے، مجھے یاد نہیں کہ کشمیر میں آپ کا خط مجھے ملا ہو۔ صحت کی کمزوری اور اشغال کا ہجوم بسا اوقات مجبور کر دیتا ہے تاہم خطوں کے جواب میں عمداً تساہل میری عادت کے خلاف ہے مجھے افسوس ہے کہ یہ معاملہ آپ کے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوا۔[۱]

---

[۱] یہ مکتوب مولانا[۲] نے اپنے ایک نیازمند محمد اکبر صاحب مدراسی کو دعوت شمول کے جواب میں بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی مقدس تعلیم کا خاکہ بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں پیش کر دیا ہے یعنی شادی کا مقصود انسانی طبیعتوں کا ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ ہے جسے زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں ہلا نہ سکیں۔ میاں اور بیوی کے درمیان مودت اور رحمت ہونی یعنی ایسی فیاضانہ محبت جو ایک دوسرے کی غلطیوں اور کمزوریوں کو بخش دینے کے لئے ہمہ تن آمادہ ہو۔ قرآن مجید نوع انسانی کیلئے یقیناً پیغام رحمت تھا، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے معارف خود سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔ دنیا کا کون سا معاشرہ اس تعلیم کی حقانیت سے ایک لمحے کے لئے بھی اختلاف کر سکتا ہے؟

یہ مکتوب "الجمعیۃ" دہلی کے آزاد نمبر سے لیا گیا۔

[۲] اس کے مکتوب الیہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ہیں جن کا اصل وطن جموں ہے تقسیم کے دوران میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ آج کل کشمیر کی طرف سے ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ آپ (مولانا) کشمیر گئے تھے تو میں نے خط بھیجا تھا اور اس کا جواب نہ ملا۔

آپ نے اپنے افکار و عقائد کا جو کچھ حال لکھا ہے، اس سے نہایت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ علم و عمل کی مزید توفیق عطا فرمائے۔

ابن جوزی و ابن تیمیہ وغیرہما محدثین نے صوفیہ کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ لوگ صوفیہ، کاملین کے مخالف تھے خود ابن تیمیہ نے شیخ عبدالقادر جیلانی رح کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے اور ان کے شاگرد ابن قیم نے منازل السائرین کی شرح لکھی ہے[1]

آپ نے میرے شخصی تاثرات دریافت کئے ہیں۔ بس زندگی بھر کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس راہ میں طمانیت قلب کا مقام بغیر ذوق و حال کے میسر نہیں آتا ومن لم یذق، لم یدر

اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو نوافل تہجد کی مداومت کرو۔ فرائض کے سوا تمام نمازیں حتی الوسع تنہائی میں پڑھی جائیں[2] اور استغفار۔ قلب کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ "کمیت" سے زیادہ "کیفیت" کا لحاظ رکھنا چاہیئے اور اس

---

[1] سوال یہ تھا کہ ابن تیمیہ، ابن جوزی وغیرہ نے صوفیہ پر تنقید کی اور محدثین میں صوفیہ بھی گزرے ہیں جیسے شاہ ولی اللہ، مولانا سید عبداللہ غزنوی۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ صوفیہ کا طریقہ صحیح ہے یا محدثین کا یا سمجھا جائے کہ دونوں سے افراط و تفریط ہوئی۔ پھر اہل حق و اصحاب، اقتصاد کس راہ پر چلیں؟ منازل السائرین تصوف کی کتاب ہے۔ مولانا کا مدعا یہ ہے کہ ابن قیم جیسے محدث نے اس کی شرح لکھی ہے۔ گویا محض مخالفت کا تصور صحیح نہیں۔

[2] فرائض تو بہرحال باجماعت ہی ادا کرنے چاہئیں۔ ان کے سوا جو سنن و نوافل پڑھے جائیں، وہ تنہائی میں اور حضور قلب کے ساتھ پڑھے جائیں۔

بات سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہئے کہ فوراً کشود کار نہیں ہوتا۔[1] اگر استقامت کے ساتھ سعی جاری رہی تو بہ حکم والّذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا[2] کشود کار یقینی ہے۔ طلب و سعی کی زندگی بہ ذات خود اپنے اندر لذت و حلاوت رکھتی ہے۔ اس سے اپنے آپ کو محروم نہ رکھیں۔

میں یہاں سے (بندھیاچل سے) ۲ر دسمبر کو کلکتہ جاؤں گا۔ خط کلکتہ کے پتے پر لکھا جائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ،
ابوالکلام کان اللہ لہٗ

---

[1] یہ دو نکتے ایسے فرمائے، جن کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے مثلاً لوگ نوافل زیادہ تعداد میں ادا کرنے کے لئے مضطرب رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تعداد زیادہ ہو تو زیادہ خیر و برکت کا باعث ہوتی ہے، حالاں کہ اصل شے توجہ اور استحضار قلب ہے بالکل یہی حال تسابیح و اوراد کا ہے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ ادھر سلسلہ شروع کیا اور ادھر کشود کار کے منتظر بن گئے حالانکہ یہ معاملہ اللہ کی رحمت کے بعد طبیعت کی کیفیت پر موقوف ہے اور استقامت بہرحال لازم ہے۔ مولانا نے کتنی پتے کی بات کہہ دی کہ سعی و طلب خود بھی تو اپنے اندر ایک لذت و حلاوت رکھتی ہے۔

[2] اور جنھوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم سمجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں (عنکبوت)

(۴)

کلکتہ ۱۴ ۲۳۔۳ء

یا سمہٗ
(بنام حکیم سعد اللہ گیاوی)

حبی فی اللہ۔ السلام علیکم۔ خط پہنچا۔ اگر آپ نے "ترجمان القرآن" کا براہ راست مطالعہ نہ کیا ہوتا اور پھر آپ مجھ سے استفسار کرتے تو میں آپ کو معذور تصور کرتا، لیکن آپ لکھتے ہیں کہ آپ نے کتاب منگوائی اور اس کا مطالعہ کیا اور پھر بھی اس بارے میں مضطرب ہیں کہ میرا اعتقاد کیا ہے! ایسی حالت میں معاف کیجئے گا اگر میں یہ کہوں کہ یہ صورت حال میرے لئے ناقابلِ فہم ہے۔

کیا آپ مجھے تحریر کریں گے کہ "ترجمان القرآن میں کہاں یہ لکھا ہے کہ قرآن کے نزدیک نجات کیلئے ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ کم سے کم سورہ بقرہ آل عمران، نساء، مائدہ، انعام میں پچاس ساٹھ جگہ ایمان بالرسل کا حکم آیا ہوگا۔ کیا آپکو کوئی مقام ایسا ملا ہے جہاں اس کی یہ تشریح کی گئی ہو کہ ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ اتنا ہی نہیں بلکہ تفسیر سورہ فاتحہ میں تو خصوصیت کیساتھ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی ہے کہ قرآن کے نزدیک "تفریق بین الرسل" کفر ہے یعنی سلسلۂ نبوت کی کسی ایک کڑی کا انکار بھی سب کا انکار ہے اور دروازہ نجات بند کر دیتا ہے۔ اگر "ایمان بالرسل" ضروری نہیں تو تفریق بین الرسل کیوں کفر ہے؟

میں نہیں سمجھتا آپ حضرات نے "ترجمان القرآن" کا واقعی مطالعہ بھی کیا ہے یا محض سنی سنائی باتوں پر بحث کر رہے ہیں۔

نہ صرف "ایمان بالرسل" بلکہ "ایمان بالملائکہ" "ایمان بالکتب" "ایمان بالآخرۃ" بھی ضروری ہے اور جس شخص کو اس سے انکار ہو وہ نجات کی راہ پر نہیں۔ یہ بات ترجمان القرآن میں اس درجہ واضح و آشکارا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیونکر ایک بے غرض آدمی اس کے سوا کوئی اور مطلب نکال سکتا ہے باقی رہا ختم نبوت کا مسئلہ تو اس کی بحث کا محل تفسیر سورہ فاتحہ نہیں ہے، بلکہ سورہ احزاب ہے

تفسیر فاتحہ اس لئے نہیں لکھی گئی ہے کہ عقائد و فقہ کے تمام مسائل جمع کر دیئے جائیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ صرف فاتحہ کی تفسیر مرتب کی جائے کل کو آپ کہیں گے کہ میرے نزدیک روزہ فرض نہیں ہے کیونکہ میں نے تفسیر فاتحہ میں کہیں اس کی فرضیت پر زور نہیں دیا ہے۔

بہر حال آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ "ایمان" سے مقصود یہ ہے کہ اللہ پر، اللہ کے رسولوں پر، یوم آخرت پر، اور قرآن اور صاحب قرآن پر ایمان لائے اور عمل سے مقصود وہ اعمال ہیں جنہیں قرآن نے اعمال صالحہ قرار دیا ہے۔

البتہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ تمام گذشتہ رسولوں کی تعلیم بھی یہی رہی ہے اور دین حق ایک سے زیادہ نہیں۔ اگر ایک یہودی حضرت موسیٰ کی سچی تعلیم پر عمل کرنا چاہے گا یا ایک مسیحی حضرت مسیحؑ کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہوگا تو اسے ٹھیک ٹھیک یہی راہ اختیار کرنی پڑیگی جو قرآن نے واضح کر دی ہے اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت ہے جو "ترجمان القرآن" کے بعض مقامات میں واضح کی گئی ہے۔

آپ نے مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی کا جو خط نقل کیا ہے اس کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ میرے عقیدے کی نسبت انکا خیال صحیح نہیں ہے غالباً گذشتہ فروری کے اواخر کی بات ہے کہ لاہور سے ایڈیٹر "انقلاب" نے مجھے اس بارے میں ایک خط لکھا تھا۔ میں نے انہیں وہی جواب دیا جو آپکو دے رہا ہوں انھوں نے بھی مولوی صاحب موصوف کی کسی کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ بعد کو انھوں نے میرا خط چھاپ دیا۔ اور مجھے لکھا کہ مولوی صاحب کو غلط فہمی کا اعتراف ہے۔[۱]

لطف کی بات یہ ہے کہ اس اثنا میں دو مرتبہ مولوی صاحب ممدوح کلکتہ آئے اور گھنٹوں مجھ سے یکجائی رہی، لیکن انھوں نے اس معاملہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

ابوالکلام

جواب کیلئے ٹکٹ کی ضرورت نہ تھی۔ جواب دینا اسلامی فرائض میں داخل ہے لہٰذا ٹکٹ واپس بھیجتا ہوں۔

---

[۱] ملاحظہ ہو میری شائع کردہ کتاب "نقش آزاد" جس میں یہ پورا خط شائع ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ مزید تعلیقات بھی موجود ہیں۔ مولانا جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنے کو سخت ناپسند جانتے تھے اور میرے علم کی حد تک انھوں نے کبھی کسی کا بھیجا ہوا ٹکٹ جواب کیلئے استعمال نہیں کیا۔

(۵)

۱۹ - الف بالی گنج سرکلر روڈ - کلکتہ -

۱۸ مارچ ۱۹۳۶ء (بنام حکیم سعد اللہ گیاوی)

حبی فی اللہ - السلام علیکم - خط پہونچا - آپ دریافت کرتے ہیں، احمدی فرقہ کے دونوں گروہوں میں سے کون سا گروہ حق پر ہے؟ قادیانی یا لاہوری؟ میرے نزدیک دونوں حق وصواب پر نہیں ہیں - البتہ قادیانی گروہ اپنے غلو میں دور تک چلا گیا ہے، حتیٰ کہ اسلام کے بنیادی عقائد متزلزل ہوگئے ہیں - مثلاً اس کا یہ اعتقاد کہ اب ایمان ونجات کیلئے اسلام کے معلوم ومسلّم عقائد کافی نہیں، مرزا صاحب قادیانی پر ایمان لانا ضروری ہے، لیکن لاہوری گروہ کو اس غلو سے انکار ہے - وہ نہ تو مرزا صاحب کی نبوت کا اقرار کرتا ہے، نہ ایمان کی شرائط میں سے کسی نئی شرط کا اضافہ کرتا ہے - اسے جو کچھ ٹھوکر لگی ہے، اس بے محل اعتقاد میں لگی ہے جو اس نے مرزا صاحب کے لئے پیدا کر لیا ہے -

باقی رہے مرزا صاحب کے دعاوی تو میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص جس نے اسلام کے اصول ومبادیات کو سمجھا ہے اور عقل سلیم سے بے بہرہ نہیں، یہ دعاوی ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم کر سکتا ہے -

آپ نے اپنی طبیعت کے اضطراب کا ذکر کیا ہے میں آپ کو ایک موٹی سی بات لکھتا ہوں - اگر غور کیجئے گا تو ہر طرح کے اضطراب وشکوک دور ہو جائیں گے -

آپ دو نوں باتوں پر یقین رکھتے ہیں یا نہیں؟ ایک یہ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے دوسری یہ کہ انسان کی نجات کے لئے جن جن باتوں کے ماننے کی ضرورت تھی وہ سب اس نے صاف صاف بتلا دی، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی اعتقاد شرط نجات ہو اور اس نے صاف اور صریح نہ بتلا دیا ہو -

اگر یقین رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ رکھتے ہیں تو غور کیجئے اگر ایک زمانہ میں کا نور

کے لئے کسی نئے ظہور پر ایمان لانا ضروری تھا تو کیا ضروری نہ تھا کہ قرآن اس کا صاف و صریح حکم دیتا؟ کم از کم اتنی صراحت کیساتھ جتنی صراحت کیساتھ اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔

اچھا قرآن کی ایک ایک آیت دیکھ جائیے۔ کہیں آپ کو یہ حکم ملتا ہے کہ ایک زمانے میں کوئی نیا نبی یا مسیح یا مجدد یا محدث (بالفتح) مبعوث ہوگا اور مسلمانوں کیلئے ضروری ہوگا کہ اسے پہچانیں اور ایمان لائیں؟ اگر کوئی ایسا حکم نہیں ملتا تو پھر آپ یہ کون سی مصیبت آپڑی ہے کہ بیٹھے بٹھائے اس جھگڑے میں پڑیں اور ایک نئے ایمان اور نئی شرط نجات کے سراغ میں نکلیں۔

اس بارے میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، تیسری کوئی نہیں۔ یا تو نجات کے لئے وہ عقائد کافی ہیں جو قرآن نے صاف صاف بتلا دیئے ہیں یا پھر کافی نہیں۔ اگر کافی ہیں تو قرآن نے کہیں یہ حکم نہیں دیا کہ کسی نئے ظہور پر ایمان لاؤ اور اگر کافی نہیں ہیں نئے شرائط نجات کی گنجائش باقی ہے تو قرآن ناقص نکلا اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے اعلان "الیوم اکملت لکم دینکم" میں صادق نہیں۔

ہر مسلمان کے سامنے دونوں راہیں کھلی ہیں۔ جو راہ چاہے اختیار کرے۔ اگر قرآن پر ایمان ہے تو نئی شرط نجات کی گنجائش نہیں۔ اگر نئی شرط نجات مانی جاتی ہے تو قرآن اپنی جگہ نہیں رہا والعاقبۃ للمتقین[1]۔

ابوالکلام

---

[1] یہ مکتوب بھی مولانا حکیم سعد اللہ ہی کے نام تحریر فرمایا گیا۔ یہ پہلے بھی ایک مجموعے میں شائع ہو چکا ہے بعد میں بھی "میرا عقیدہ" میں شائع ہوا۔

(۶)

۱۹۔ الف بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ۔

۵ رجون ۱۹۳۶ء (بنام حکیم سعد اللہ گیاوی)

محبی فی اللہ۔ السلام علیکم۔ خط پہونچا۔ میں پچھلے خط میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اس پر غور کر لیجیے، جتنے سوالات آپ نے لکھے ہیں، ان سب کا جواب اس میں آچکا ہے کسی ایسے سوال کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ ہر صدی کے مجدد پر ایمان لائیں ان سے پوچھیے کہ یہ حکم کس قرآن میں نازل ہوا ہے؟ اگر قرآن سے مقصود وہ قرآن ہے جو محمد رسول اللہ پر نازل ہوا ہے تو بتائیے کس پارہ، کس سورۃ، کس آیت میں یہ بات کہی گئی ہے کہ

"ہر صدی میں ایک مجدد آئے گا اور مسلمانوں کیلئے ضروری ہے

کہ اس کی معرفت حاصل کریں۔۔۔ اور اس پر ایمان لائیں"

اگر نہیں کہی گئی ہے تو ہمیں کونسی ضرورت ہے کہ اس لغویت میں پڑیں؟ ہم نہیں جانتے مجدد کیا بلا ہوتی ہے؟ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ کی آخری اور کامل ہدایت آچکی ہے جس کا نام قرآن ہے اور جس کے مبلغ محمد رسول اللہ تھے جو انسان اس پر ایمان لاتا ہے اور اس کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل کرتا ہے اس کے لئے نجات ہے، اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ ہم کو کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔

جو شخص کہتا ہے کہ نجات و سعادت کے حصول کیلئے یہ کافی نہیں اور کسی مجدد پر ایمان لانا ضروری ہے وہ یا تو اسلام پر بہتان لگاتا ہے یا اسلام کی بو بھی اس تک نہیں پہونچی۔

باقی رہا نزول مسیح کا معاملہ تو یہ ایک نہایت اہم معاملہ ہے اور اگر کسی زمانے میں مسلمانوں کی نجات و سعادت اس پر موقوف رہنے والی تھی تو ضروری تھا کہ قرآن صاف صاف اسے بیان کر دیتا، اسی طرح صاف صاف جس طرح اس نے تمام مہمات دینیہ و اعتقادیہ بیان کر دی ہیں

لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن میں کوئی تصریح موجود نہیں پس کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کے اعتقاد پر مجبور ہوں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ اب نہ کوئی بروزی مسیح آنیوالا ہے نہ حقیقی۔ قرآن آچکا ہے اور دین کامل ہو چکا ہے۔

اگر آپ طالب علم حقیقت ہیں تو ان جھگڑوں میں نہ پڑیے، ان خرافات کے بارے میں سوالات کیجئے۔ ہمیں تلاش نجات کی ہے۔ اگر نجات کے لئے قرآن کامل ہے تو پھر وہ عقائد کافی ہیں جو قرآن نے بتلا دیئے ہیں۔ زیادہ کاوش میں پڑیں ہی کیوں؟

ابو الکلام

(۷)

کلکتہ

۱۳ جولائی ۱۹۳۶ء (بنام مولانا ثناء اللہ مرحوم امرتسری)

مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ نے ازراہ عنایت "اہلحدیث" کا جو پرچہ بھیجا تھا وہ وصول ہوا۔ جو تحریر اس میں شائع فرمائی ہے وہ نظر سے گذری۔ حیران ہوں کہ آخر ان خطوط میں کونسی ایسی بات تھی جس سے ان دور از کار نتائج کی طرف آپکا ذہن منتقل ہوا۔ یہ خطوط ایک خاص شخص کے خاص استفسار کے جواب میں لکھے گئے ہیں اور ضروری ہے کہ اُسے پیش نظر رکھا جائے۔ مستفسر نے لکھا تھا کہ ایک عرصے سے بعض احمدی مبلغ قادیانی طریقے کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں کئی صاحبوں سے استفسار کیا لیکن جواب سے رد وکد کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، دل کا کانٹا نکلتا نہیں۔ جو بات سب سے زیادہ مضطرب کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ ایمان ونجات کا ہے اگر واقعی کسی نئے ظہور پر ایمان لانا ضروری ہوا اور میں ابھی بحثوں میں رہ جاؤں تو کل کو میرا کیا حشر ہوگا۔

میں نے اس کے جواب میں ایک ایسی موٹی سی بات لکھ دی، جو مخاطب کے اذعان و رفع اضطراب کے لئے قاطع اور مختتم ہو سکتی تھی اور جس کے فہم کے لئے نہ تو مطولات ومقدمات کی ضرورت ہے، نہ علم وفن کے استعداد کی۔ ایک لمحہ میں ساری رد وکد ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے لکھا کہ اتنی بات مانتے ہو یا نہیں کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور جن باتوں پر ایمان لانا شرط اسلام ونجات ہے وہ اس نے بتلا دی ہیں۔ اچھا، کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کا کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھ لو، کہیں یہ حکم پاتے ہو کہ آئندہ ایک زمانہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بے سود ہو جائیگا اور ایک نئے ظہور پر ایمان لانا پڑیگا؟ یا کسی زمانے میں اسلام کی پچھلی شہادتیں بیکار ہو جائیں گی اور ایک تیسری شہادت کا اضافہ ہو جائیگا؟ مثلاً ایمان بالمجدد۔ اگر نہیں پاتے ہو تو پھر کون سی مصیبت آپڑی ہے کہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو اور

ایمان و نجات کی طرف سے مضطرب ہوتے ہو۔

بلاشبہ اس تخاطب میں میں نے صرف قرآن کا ذکر کیا۔ احادیث کا ذکر نہیں کیا اس لئے کہ مخاطب کے لئے اتنا ہی کہنا قاطع و فیصلہ کن تھا ورنہ ظاہر ہے کہ احادیث میں بھی کہیں یہ بات نہیں آئی کہ آئندہ اسلام کے شرائط ایمان میں ایک نئی شرط بڑھ جائے گی اور ایک نئے رسول پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔

اب فرمایئے اگر ایسا لکھ دیا گیا تو اس میں کون سی برائی کی بات ہو گئی ہے جو اس درجہ ناگواری خاطر کا موجب ہو رہی ہے؟ کیا قرآن کا حوالہ دینا انکار حدیث کیلئے مستلزم ہے؟ کیا احادیث میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ نئے نئے ظہوروں پر ایمان باللہ و ایمان بالرسولؐ کی طرح ایمان لاتے رہنا[1]۔

اس کے بعد مستفسر نے اپنے مبلغ دوست کا قول نقل کیا کہ مسلمانوں کو ہر صدی کی مجدد پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے نیز یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت مسیح علی انبیاء وعلیہ الصلاۃ والسلام بحیثیت رسول کے آئیں گے اور انہی کے ہاتھوں اس دین کی تکمیل ہوگی میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلامی عقائد میں کسی ایسے مجدد کی جگہ نہیں جس پر ایمان بالرسل کی طرح ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہو۔ باقی رہا نزول مسیح کا معاملہ تو شرائط ایمان کی ترمیم و تنسیخ کا معاملہ نہایت اہم اور اساسی معاملہ ہے اگر مسلمانوں کی نجات کسی نئے ایمان پر موقوف رہنے والی ہوتی تو ضروری تھا کہ اس کا صاف صاف حکم دیدیا جاتا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا پس ہمارا عقیدہ یہی ہونا چاہیئے کہ دین کامل ہو چکا آخری کتاب نازل ہو چکی اور اب تکمیل دین کیلئے نہ کسی بروز مسیح کی گنجائش ہے نہ حقیقی کی۔

---

[1] صاف ظاہر ہے کہ مولانا ثناء اللہ مرحوم کا پہلا اعتراض یہ تھا، مولانا آزاد نے معاملہ جواب صرف قرآن مجید تک کیوں محدود رکھا اور احادیث کا ذکر کیوں نہ کیا؟ گویا مولانا ثناء اللہ کے دل میں احادیث سے انکار یا اعراض کا وسوسہ پیدا ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ اس عبارت میں جو نفی کی ہے، وہ کسی ایسے نزول کی گئی ہے، جو دین کی تکمیل کے لئے ہوگا اور بہ حیثیت رسول کے ہوگا، نہ نفس نزول کی۔[1]

چنانچہ سیاق و سباق اس کی صاف شہادت دے رہا ہے، اس سے اوپر مجدد کی نفی کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ وہاں بھی مقصود ایسی تجدید (کی نفی) ہے کہ جس پر ایمان لانا مثل "ایمان بالرسل" کے ضروری ہو، ورنہ حدیث یجدد لہا دینہا الخ موجود ہے اور مجدد لغوی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ایسے مجدد یعنی مصلحین حق پیدا ہو چکے ہیں پیدا ہوتے رہیں گے، حتی یاتی امر اللہ وہم غالبون۔

بلاشبہ روایات میں نزول مسیح علیہ السلام کی خبر دی گئی ہے اور صحیحین کی روایات اس باب میں معلوم و مشہور ہیں۔ اس سے کسے انکار ہے؟ لیکن اس معاملہ کا تعلق قیامت کے آثار و مقدمات سے ہے نہ کہ تکمیل دین کے معاملے سے۔ نیز انہی روایات میں تصریحات موجود ہیں کہ حضرت مسیحؑ کا نزول بہ حیثیت رسول کے نہ ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ یہی رہا ہے کہ دین ناقص نہیں اور اپنی تکمیل کیلئے کسی نئے ظہور کا محتاج نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے؟

میں اس کا آپ کو کیا جواب دوں کہ آپ کو میرے عقیدہ کی خبر نہیں؟ کیا آپ کی نظر سے میری بے شمار تحریرات نہیں گزری ہیں؟ یہ سوال آپ اس شخص سے کر رہے ہیں جو اپنی تحریرات میں نہ صرف حدیث کو حجت اور واجب العمل ثابت کر چکا ہے بلکہ جس کو ایسے فہم کی توفیق ملی ہے کہ تعلیم الکتاب والحکمۃ میں حکمت سے مقصود سنت ہے اور جس نے جا بجا مقدام کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ" نیز روایت مشہورہ یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بہذا القرآن فما وجدتم من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ اتنا ہی نہیں بلکہ جس کی تمام قلمی جدوجہد کیسر دعوت اتباع کتاب وسنت پر مبنی

---

[1] یہ نکتہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔

رہی ہے اور جس کے عقیدہ میں کتاب کا ہر وہ اتباع، اتباع نہیں جو سنت کے اتباع سے خالی ہو۔

ایں دو شمع اند کز از یک دگر افروختہ اند

یہ ظاہر ہے کہ میں ایک شخص کے استفسار کا جواب لکھ رہا تھا کوئی تصنیف نہیں کر رہا تھا۔ اس طرح کے سوالات روز لوگ کرتے ہیں اور کم سے کم جملوں میں جو جواب دے سکتا ہوں، دے دیا کرتا ہوں۔ یہی استفسار کا جواب سینکڑوں آدمیوں کو دیا ہوگا۔ ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے اور چاہیئے یہی محل میں رہ کر اس پر غور کیا جائے پھر خصوصاً اگر تحریر کسی ایسے شخص کی ہو جس کے عقائد و مسلک سے ہم ناواقف نہیں تو اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہی مطلب ٹھہرائیں، جو اس کے عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے ہونا چاہیئے اہل حق و دانش کا طریقہ جو ہمیں بتلایا گیا ہے وہ تو یہ ہے کہ یستمعون القول فیتبعون احسنہ واولئک الذین ہداہم اللہ و اولئک ہم اولوا الالباب۔

یہاں تک تو آپ کے استفسار کا جواب تھا۔ اب ایک دو لطیفے بھی سن لیجئے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر مجھے اس کا جواب دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابھی تک آپ نے رائے قائم نہیں کی ہے۔ میرے جواب کا انتظار ہے، لیکن مضمون کی سرخی میں آپ نے از راہ غایت تنابز بالالقاب کے ساتھ میرا نام درج کر دیا ہے گویا جزم و تعین کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ

اگر فیصلہ ہو چکا تھا تو استفسار کیوں؟ اگر استفسار ہے
تو پھر یہ تنابز بالالقاب کیوں؟

دوسرا لطیفہ یہ ہے:

خطوط میرے تھی۔ استفسار مجھ سے کرنا ہے، لیکن مضمون اخبار میں شائع کرتے ہیں اور پھر اس کا پرچہ ڈاک کے ذریعے بھیج دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس ڈاک کے ذریعے آپ کا اخبار مجھے مل سکتا ہے، اسی ڈاک کے ذریعہ آپ کا خط بھی مجھے مل جاتا۔ بہر حال آپ نے خیال کیا کہ خط بھیجنے کا زیادہ محفوظ ذریعہ یہی ہے کہ اخبار میں جواب دیا جائے۔ خیر! ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے

ابوالکلام

(۸)

عزیزی - السلام علیکم ۔

آپ نے اخبار کا جو پرچہ بھیجا ہے میں نے دیکھا۔ جن صاحب نے میرے خطوط شائع کئے ہیں، اگر وہ ان کے ساتھ اپنے خطوط بھی شائع کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس طرح جواب کی نوعیت پوری طرح واضح ہو جاتی جس عبارت کی نسبت آپ دریافت کرتے ہیں وہ دراصل ان کے ایک سوال کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ۔

احمدی جماعت کے مبلغ کہتے ہیں، ہمیں حضرت مسیح علیہ السلام کے دوبارہ ظہور پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا اور دین کی تکمیل انہی کے ہاتھوں ظہور میں آئے گی۔

میں نے جواب لکھا "یہ صحیح نہیں۔ اگر کسی زمانے میں مسلمانوں کیلئے یہ بات ضروری ہونے والی تھی کہ کسی کے ظہور پر ایمان لائیں اور دو شہادتوں پر ایک تیسری شہادت کا اضافہ ہو جائے تو ضروری تھا کہ اس کا انہیں صاف حکم دیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ پس معلوم ہوا کہ اب تکمیل دین کے لئے نہ کسی بروزی مسیح کی ضرورت ہے، نہ حقیقی مسیح کی۔ قرآن آچکا اور دین کا معاملہ کامل ہو چکا پس اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ روایات میں جس نزول مسیح کی خبر دی گئی ہے، اس کا تعلق قیامت کے آثار و مقدمات سے ہے۔ دین کی تکمیل سے نہیں ہے کہ حضرت مسیحؑ بہ حیثیت ایک نبی کے نازل ہوں گے اور ہر مسلمان کے لئے ضروری ہو گا کہ نبوت کے ایک نئے ظہور پر ایمان لائے۔

نہ یہ مطلب ہے کہ بہ سلسلہ آثار قیامت نزول مسیح کی جو خبر دی گئی ہے، اس کی نفی کی جائے چنانچہ عبارت مسئولہ عنہا کا بغور مطالعہ کیجئے۔ سارا زور تکمیل دین

اور شرائط ایمان و نجات کے معاملے پر پڑ رہا ہے۔

اور جو کچھ نفی کی گئی، اسی کی گئی ہے۔ عبارت کے الفاظ یہ ہیں۔
اگر کسی زمانے میں مسلمانوں کی نجات و سعادت اس پر موقوف رہنے والی تھی تو ضروری تھا کہ قرآن صاف صاف اسے بیان کر دیتا، اسی طرح صاف صاف جس طرح تمام مہمات اعتقادیہ کردی ہیں۔

یعنی نزول مسیح کی خبر محض آثار قیامت کے سلسلے میں دی گئی ہے۔ مسلمانوں کی نجات و سعادت کے معاملہ کا اس سے تعلق نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہمیں اس کا حکم دیا جاتا۔ پس اب تکمیل دین کے لئے نہ کوئی بروزی مسیح آنے والا ہے، نہ حقیقی۔

ابوالکلام

(۹)

نمبر ۱۱۔ کولوٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۲ دسمبر ۱۹۰۶ء

شفیق مکرم

اظہار ندامت و معذرت کے لئے الفاظ نہیں ملتے کہ میری عدم اطلاع میں آپکا وی۔ پی واپس ہو گیا۔ قطعی ارادہ ہے کہ وسط جنوری سے مرحوم دار السلطنت کو زندہ کردوں۔ غالباً آپ بھی اس کو پسند کرینگے کہ ایک مستقل اخبار میرے زیر قلم ہو۔

اب کچھ کام کی باتیں سنئے۔ آپ کو تاریخ ہندستان فارسی سرجان مارشمین کلارک مطبوعہ قدیم کلکتہ، ارکان ارلبو، مآثر عالمگیری اور تاریخ نادرہ کی ضرورت تھی چنانچہ چنانچہ متعدد بار اس ضرورت کا آپ اظہار کر چکے ہیں ان چاروں کتابوں کے کافی نسخے میرے پاس موجود ہیں مگر اب مبادلہ کتب نہیں ہو سکتا۔ نقد قیمت پر معاملہ کیجئے۔

آپ تاریخ ہند اور مآثر عالمگیری کو چھ چھ روپے میں فروخت کرتے ہیں مجھ سے چار اور ساڑھے تین میں لیجئے۔ اوّل الذکر آپ تین میں بصیغۂ مبادلہ لے چکے ہیں اور بصورت نقد آٹھ آنے کی تخفیف۔ ارکان ارلبو اور تاریخ نادری ایک روپیہ اور دو روپے سے کم ممکن نہیں۔ اُمید ہے کہ بہت جلد تفصیلی جواب دیں گے۔

کوئی کارآمد اور قیمتی کتاب معاوضے میں دیجئے تو لینے کے لئے تیار ہوں مثلاً "تمدن عرب" یا مطبوعات مصر عربی۔

* دار السلطنت[۱] کی نسبت اب تک کوئی نوٹ وطن میں نہیں نکلا۔ دار السلطنت "وطن" کے مقاصد کا حامی اور اس کی اسلامی خدمت کا ہمیشہ معترف رہیگا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

---

[۱] بنام مولوی انشاء اللہ خاں مرحوم مالک و مدیر "وطن" لاہور

(۱۰)

کلکتہ

۵ جولائی ۴۲ء

عزیزی

آپ کا خط مل گیا تھا مگر ہجوم اشغال سے بروقت جواب نہ دے سکا۔
آپ کے مسودات کا فائل رجسٹرڈ بھجوا رہا ہوں، جس تحریر کا میں نے وعدہ کیا تھا، چند دنوں کے بعد وہ بھی بھیج دوں گا۔ موسم کی سختی اور قلب کی شکایت نے آج کل مجھے بالکل بے کس کر دیا ہے یہاں کے حالات کے تقاضے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے اور اگر کسی دوسرے سرد مقام پر چلا بھی جاؤں تو چین سے نہیں بیٹھ سکوں گا۔ والسلام علیکم [۱]

ابوالکلام

---

[۱] بنام جناب عبداللہ بٹ سکریٹری دی پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن۔ لاہور

(۱۱)

یہ مکتوب مختصر سی تمہید کا متقاضی ہے۔ مولانا کے نہایت مخلص شیدائیوں میں
سے ایک میرے عزیز دوست حکیم مولوی عبدالقادر صاحب اعوان ودامانی (ٹانک
ڈیرہ اسماعیل خاں) ہیں ان کا جذبہ والہیت ایسا تھا کہ دور حاضر میں اس
کی مثال نہیں مل سکتی چنانچہ ایک مرتبہ فیصلہ کر لیا گیا کہ زندگی کا کچھ حصہ
مولانا کی خدمت میں گزاریں اور اسی عزم کا عریضہ خدمت والا میں
بھیج دیا۔ مولانا نے جو جواب دیا وہ ذیل میں درج ہے۔

کلکتہ۔ ۱۵ اپریل ۱۹۲۳ء

وفقنا اللہ سبحانہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ والسلام علیکم۔ خط پہنچا۔ اللہ تعالیٰ
اپنا فضل وکرم آپ کے شامل حال فرمائے اور اپنی محبت واطاعت کی توفیق
دے۔ آپ نے یہاں آنے اور قیام کرنے کا جو شوق ظاہر کیا ہے تو انشاء اللہ
اس طرف سے غفلت نہ ہوگی مگر ابھی توقف اور وقتاً فوقتاً خط وکتابت
جاری رکھیں۔ جوں ہی مناسب وقت آئے گا۔ اس کا انتظام ہو جائے گا۔
جس جگہ ہوں اور جس حال میں ہوں، محبت حق اور خدمت خلق میں
مشغول رہیں۔ یہی دو سرچشمہ سعادت ووصول الی اللہ ہیں۔ محبت حق اس کے
احکام کی اطاعت میں اور خدمت خلق محتاج تشریح نہیں آپ کی محبت و
اخلاص سے بے خبر نہیں ہوں۔ انشاء اللہ یہ اخلاص ضائع نہ جائے گا اور
چونکہ للہ فی اللہ ہے، مقبول ہوگا۔ والعاقبۃ للمتقین۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۲)

حکیم عبد القادر صاحب ایک مرتبہ کلکتہ پہنچ گئے اس زمانے میں مولانا کلکتہ سے دہلی منتقل ہونے کی تیاری کر چکے تھے۔ سامان بندھا پڑا تھا بلکہ کچھ بھیجا بھی جا چکا تھا۔ لہذا تھوڑی ہی دیر قیام کا موقع مل سکا۔ حکیم صاحب روزانہ عطر کی ایک شیشی اور انگور کا ایک خوشہ مولانا رحمہ کی خدمت میں بھجوا دیتے۔ ایک روز مولانا نے تحفہ رکھ لیا۔ دوسرے روز بھی اسے قبول فرما لیا، جب تیسرے دن تحفہ پیش ہوا تو لکھ بھیجا۔

عزیزی

یہ اور اس قسم کی دوسری چیزیں کبھی کبھی بجائے انبساط خاطر کے انقباض خاطر کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ اگر میری رضا اور خوشی مطلوب ہے تو اس چیز کو انگور کے خوشوں اور عطر کی شیشیوں میں نہ ڈھونڈھئے گا۔

ابوالکلام

(۱۴۳)

جس زمانہ میں "الہلال دوسری مرتبہ جاری ہوا یعنی ۱۹۲۷ء میں حکیم صاحب موصوف دوبارہ کلکتہ پہونچ گئے۔ مولانا نے انہیں اپنے پاس ٹھہرایا اور فرمایا کہ

عزیزی

آپ جس غرض سے آئے ہیں، اسکا حصول بغیر اطمینان[۱] کے ممکن نہیں اور بہ اطمینان ملاقاتوں کے لئے قیام ناگزیر ہے۔

میں آپ کی نسبت غور کرتا رہا۔ طبیعت نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کچھ عرصہ کے لئے یہاں مشغول ہوجائیں۔ بالفعل آپ یہ کیجئے کہ:

۱۔ اخبار کے جس قدر پرچے روزانہ باہر جاتے ہیں، بدرالدین سے دریافت کر کے بنڈل تیار کیجئے اور ڈاک بھیج دیجئے۔ تین چار بجے کے اندر روانہ ہوجانے چاہئیں

۲۔ اس کے علاوہ اردو کی خط و کتابت کا کام کرتے رہئے عجب نہیں اللہ تعالیٰ بہترین صورت ہر اعتبار سے پیدا کر دے۔ میں کل صبح آپ سے باتیں کرونگا

ابوالکلام

---

[۱] بدرالدین احمد مولاناؒ کی بیگم صاحبہ کے بھائی تھے۔ افسوس کہ مدت ہوئی ان کا انتقال ہو چکا ہے حکیم عبدالعزیز نے وہاں کام کر کے دلی میں تنخواہ قبول نہ کی۔ البتہ کھانا مولانا کے ہاں کھاتے تھے رمضان شریف میں ایک مرتبہ مولانا کے خسر آفتاب الدین مرحوم نے پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ کوئی تکلیف نہیں۔ البتہ شام کا کھانا ذرا دیر سے آتا ہے اور میں جلد کھا لینے کا عادی ہوں۔ آفتاب الدین احمد صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا کم مقدار میں پہونچتا ہے چنانچہ اس روز سے مقدار میں بہار گنا کھانا آنے لگا اور حکیم عبدالعزیز نے مولانا کی خدمت میں حقیقت حال عرض کر کے صورت حال تبدیل کرائی۔

(۱۴۱)

حکیم صاحب مولانا ہی کے پاس تھے کہ گھر سے ایک صاحبزادی کے انتقال کی خبر ملی۔ مولانا کو معلوم ہوا تو تحریر فرمایا۔

عزیزی۔ آج ارادہ تھا، آپ سے باتیں کروں گا مگر کام ختم نہ ہوا، اب کل انشاءاللہ بالتفصیل باتیں ہوں گی، کل آپ نے جس حادثے کی خبر دی، یقیناً وہ آپ کے لئے سخت قلق و رنج کا باعث ہوا ہوگا۔

انسان کی کمزوریوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی صدمہ نہیں لیکن انسان کی روحانی و ایمانی تقویت کے لئے بھی اس سے بڑھ کر اور کسی حادثے میں آزمائش نہیں، آپ نے مجھ سے صبر و تسکین کے کلمات چاہے ہیں، لیکن اس سے زیادہ میں نہیں کہہ سکتا جو خود آپ کہہ چکے ہیں۔ "فصبر جمیل"۔ صبر جمیل کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی خواہش پر خدا کی مشیت کو اس طرح مقدم کر دے کہ اپنی خواہش کے خلاف جو کچھ ہو، اس پر رنج و الم کا احساس بھی پیدا نہ ہونے دے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قلب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور یہ بچہ قیامت کے دن ذریعہ بخشش و شفاعت ہو، جیسا کہ حدیث شریف میں تیقین دلایا گیا ہے

ابوالکلام

(۱۵)

حکیم صاحب دہلی میں طب پڑھنے کے خواہاں تھے۔ مولانا نے مندرجہ ذیل مکتوب مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے نام عنایت فرمایا۔

صدیق محترم! حامل مکتوب عبدالقادر اضلاع سرحد کے ایک سعید و مخلص طالب العلم ہیں اور دہلی جا رہے ہیں کہ کچھ عرصہ طب میں مشغول رہ کر اپنے لئے وجہ معیشت کی راہ پیدا کر لیں۔ یہ خواہش مند ہیں کہ جناب کے خاندان گرامی کے کسی رکن سے فن کی تحصیل کریں۔ غالباً متعدد حضرات کے مطب میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر جناب اپنے خاندان کے کسی طبیب کے ہاں ان کی تحصیل کا انتظام فرمادیں انتظام سے صرف یہ مقصود ہے کہ آپ ان کی نسبت امر فرما دیں۔ اس صورت میں یقیناً یہ توجہ حاصل کر لیں گے۔[1]

ابوالکلام

---

[1] یہ تمام مکاتیب حکیم عبدالقادر صاحب کی ایک کتاب سے ماخوذ ہیں جو موصوف نے مولانا کے ساتھ عقیدت و نیاز کی سرگزشت کے طور پر مرتب فرمائی ہے۔

مضامین

ہجرت کا فتویٰ

مولانا نے ۱۹۲۰ء میں ہندستان سے ہجرت کے متعلق جو فتویٰ دیا تھا وہ
بالکل ناپید تھا۔ اتفاق سے اخبار "اہل حدیث" امرتسر کی اشاعت مورخہ ۳۰
جولائی ۱۹۲۰ء میں اس کا اصل متن شائع ہوا تھا۔ وہیں سے نقل کر کے
بطور یادگار محفوظ کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ فتویٰ ترک موالات کے مفصل
پروگرام کے نفاذ سے پیشتر دیا گیا تھا۔ جب ترک موالات کا پروگرام منظور ہو گیا
اور جمعیت مرکزیہ خلافت و جمعیۃ العلمائے ہند کے علاوہ کانگریس نے بھی اسے منظور کر
لیا تو پھر یہیں وسیع پیمانے پر قومی کام شروع ہو گیا اور باہر جانے کی ضرورت
نہ رہی۔ تاہم یہ فتویٰ مولانا کی ضروری تحریرات میں محفوظ ہو جانا چاہیے جس
رسالے کا ذکر فتوے کے آخر میں فرمایا گیا ہے، میرے علم کے مطابق وہ شائع
نہ ہوا۔ کم از کم میری نظر سے اس کا کوئی نسخہ آج تک نہیں گزرا۔

ابتدا میں[1] یہ ضروری لکھتے ہیں۔

تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح مہمہ امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر
ڈالنے کے بعد میں پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانانِ
ہند کے لیے بجز ہجرت کے اور کوئی چارۂ شرعی نہیں۔ ان تمام مسلمانوں کے لیے جو
اس وقت ہندستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں، ضروری ہے کہ
ہندستان سے ہجرت کر جائیں اور جو لوگ یکایک ہجرت نہیں کر سکتے وہ مستعد
مہاجرین کی خدمت و اعانت اس طرح انجام دیں گویا وہ خود ہجرت کر رہے ہیں یعنی
اصل عمل جو اب شرعاً درپیش ہے، ہجرت ہے، اس کے سوا کوئی نہیں۔ ہندستان
سے ہجرت قبل از جنگ مستحسن تھی، اب یہ استحسان شرائط شرعیہ کے ماتحت وجوب تک

---

[1] یہ تمہید اہل حدیث میں نقل ہی نہیں ہوئی تھی

پہنچتا ہے، البتہ جن لوگوں کی نسبت ظن غالب ہو کہ مقصد کی جد و جہد اور کلمۂ حق کے اعلان و تذکیر کے لئے ان کا قیام ہندستان میں بہ مقابلہ ہجرت کے زیادہ ضروری ہے یا جو لوگ دیگر عذرات مقبولہ شرعی کی بنا پر ہجرت نہ کر سکیں یا ایک اتنی بڑی وسیع آبادی کی نقل و حرکت میں قدرتی طور پر جو تاخیر ہونی چاہئے، اس کی وجہ سے تاخیر ہو، سو بلا شبہ وہ لوگ ٹھہر سکتے ہیں ان کو اپنی تمام قوتیں اتباع شرع کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔ ایک منظم جماعت کی شرعی ہیئت پیدا کر کے زندگی بسر کرنی چاہئے اور جہاں تک عزم و نیت کا تعلق ہے ہجرت کے ولولہ و تہیہ سے خالی نہیں رہنا چاہئے۔ ہندستان میں ایک ایسی جماعت کا قائم ہو جانا، موجودہ حالات کی بنا پر اصلی کام ہوگا۔

البتہ واضح رہے کہ ہجرت کی جو صورت اس وقت ہندستان میں درپیش ہے شرعاً اس کی یہ صورت نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص بطور خود ارادہ کر لے اور نکل کھڑا ہو۔ ہجرت کے تمام اعمال تنظیم و جماعت کے ساتھ انجام پانے چاہئیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا صاحب جماعت کا کام ہے کہ کس شخص کو فوراً ہجرت کرنا چاہئے اور کس شخص کی استعداد ایسی ہے کہ اس کا قیام اندرونی خدمات کے لئے مطلوب و مفید ہے۔ نیز ہجرت کی جائے تو کس مقام پر اور کن حالات کے ساتھ کہ موجب ثمرات و برکات ہو؟ ہر شخص بطور خود ان امور کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

جب ایک طالب عمل کو ہجرت کا حکم دیدیا گیا تو اس کے لئے ہجرت کرنا واجب ہو جائے گا۔ اعمال ہجرت کا جو نمونہ اسوۂ حسنۂ نبوت نے ہمارے لئے چھوڑا ہے، وہ یہ ہے کہ ہجرت سے مقدم ہجرت کی بیعت ہے۔ بغیر بیعت کے ہجرت نہیں کرنی چاہئے۔ پس ضروری ہے جو لوگ ہجرت کریں، پہلے ہجرت پر بیعت کریں۔

مختلف اسباب کی بنا پر (جن کی تشریح رسالۂ ہجرت میں ملے گی) یہ ظاہر ہے

کہ نہ تو ہندستان سے بہ یک وقت تمام لوگ ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ شرعاً مطلوب ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہندستان میں بھی اسلامی آبادی باقی رہے گی۔ پس جو لوگ ہندستان میں ہیں وہ جب تک ہندستان میں رہیں، شرعاً ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اسلام کے فریق محارب سے کسی طرح کا علاقہ، محبت والفت، یا اعانت وخدمت کار کھیں۔ جو شخص رکھے گا، وہ حسب نص قرآنی اسلام کے دشمن میں محسوب ہوگا۔ ومن یتولھم منکم فانہ منھم۔

"علاقہ محبت وخدمت" میں نے "موالات" کا ترجمہ کیا ہے، جو قرآن میں وارد ہے۔ موالات میں وہ تمام باتیں داخل ہیں، جن سے خلافت کمیٹی "نان کوآپریشن" کے نام سے روک رہی ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ اعلان جنگ ترکی کے وقت سے مسلمانوں کے لئے وہ تمام باتیں ازروئے شرع ممنوع ہو چکی ہیں۔ گزشتہ فروری کے جلسۂ دہلی سے لے کر اپریل کے جلسۂ خلافت کمیٹی بمبئی تک میں نان کوآپریشن کو منظور ومقبول کرانے کی جس قدر کوشش کی حتیٰ کہ وہ منظور کر لیا گیا، اس کی بنا یہی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اسلامی مطالبات کے بعد بہ طور ایک دفاعی عمل کے اس تجویز پر عمل کیا جائے گا، کیوں کہ شرعاً نہ تو یہ دفاع و جہاد ہے، نہ کوئی مستقل عمل۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ دفاع کے مقدمات میں داخل ہے۔ مسلمانوں کو ترک موالات اول روز ہی سے کرنا تھا۔ نہ کیا تو یہ اشد شدید معصیت اور نفاق قطعی۔ اب جب بھی کریں اور جس قدر بھی کریں عین مطلوب ومقصود۔ چنانچہ دہلی کی سب سے پہلی نان کوآپریشن سب کمیٹی کے بعد ہی میں نے میرٹھ خلافت کانفرنس میں بہ تفصیل واضح کر دیا تھا کہ ہمارا مقصود اس سے کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ کام کیوں اور کس شکل میں انجام دینا چاہیے۔

یہ میری رائے ہے، میری بصیرت ہے، میرا یقین وایمان ہے نہ کوئی قیاس ورائے اور پولیٹیکل حکمت عملی۔ تمام یورپ اسلامی حکومت سے نکل چکا، بغداد و شام جا

چکے، لیکن ایمان باقی ہے۔ اب ہم کو قسطنطنیہ کا بچاؤ نہیں کرنا ہے بلکہ اپنے ایمان کا بچاؤ درپیش ہے اور مقصود بقاء ملک نہیں ہے بلکہ صرف بقاء ایمان۔

اگر قسطنطنیہ و بغداد کو نہیں بچا سکتے تو کم از کم اپنا ایمان تو بچا لے جائیں میں نے آخری فیصلہ کرلیا ہے اور پورے اطمینان و انشراحِ قلب کے ساتھ اس مسلک پر مستقیم ہوں جس طالب حق کو مجھ پر اعتماد ہو، اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھداھم اللہ واولئک ھم اولو الالباب۔ بالفعل طریق عمل یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عمل دے وہ فوراً مجھے اپنے عزم سے مطلع کریں یا حسب ذیل اصحاب سے مل کر تفصیلی ہدایات حاصل کرلیں۔

۱۔ مولوی عبد القادر صاحب وکیل، قصور (ضلع لاہور)
۲۔ مولوی محی الدین احمد صاحب بی۔اے، قصور (ضلع لاہور)
۳۔ مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی (امرتسر)
۴۔ مولوی عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی ایڈیٹر "البیان" (لکھنو)

رسالہ ہجرت زیر تحریر ہے، عنقریب شائع ہوگا۔ جن حضرات کو دلائل شرعیہ کی نسبت تامل ہو، وہ اس کا انتظار کریں۔

فقیر احمد

فتنہ ارتداد اور مسلمان

آگرہ کے آس پاس ایک گروہ راجپوتوں کا مقیم تھا جنہیں ملکانہ راجپوت کہتے تھے اور ان کی تعداد چار لاکھ کے قریب تھی۔ یہ لوگ خدا جانے کب مسلمان ہوئے ۱۹۲۳ء کے اوائل میں ہندوؤں نے انہیں ازسر نو ہندو بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ آریا سماج نے یہ سلسلہ جاری کیا اور سوامی شردھانند اصل تحریک کے لیڈر تھے۔ غالباً ابتدا میں اسے بہت مخفی رکھا گیا مگر اوائل مارچ میں راز منکشف ہو گیا۔ اس پر مسلمانوں میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوئی اور بہت سی تبلیغی جماعتیں اطراف ملک سے آگرہ پہنچ گئیں۔ یہ واقعہ بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کا ایک بہت بڑا موجب بنا۔

تحریک ترک موالات پر پہلی ضرب اس وقت لگی جب گاندھی جی نے چوری چورا میں پولیس کی چوکی پر عوام کے حملے سے متاثر ہو کر اعلان کیا کہ ملک میں ابھی تک عدم تشدد کی فضا پیدا نہیں ہوئی۔ اس بنا پر مجوزہ سول نافرمانی غیر معین مدت کے لئے ملتوی کی جاتی ہے۔ اس سے مختلف حلقوں میں افسردگی و دل شکستگی پیدا ہوئی۔ حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے چھ سال کی قید کی سزا دیدی۔ تحریک پر دوسری ضرب فسادات سے لگی۔ ملکانہ راجپوتوں کو ہندو بنانے کی تحریک نے مسلمانوں کو یقین دلا دیا کہ ہندو کسی بھی حالت میں مل جل کر کام کرنے کے خواہاں نہیں۔ چنانچہ فضا اتنی بگڑی کہ پھر وہ ۱۹۴۷ء تک اندازہ پر نہ آسکی۔

مولانا خود حالات دیکھنے کے لئے آگرہ گئے تھے واپسی پر لاہور میں انھوں نے مندرجہ ذیل بیان جاری کیا جو ۱۵ اپریل ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں شائع ہوا تھا۔

اضلاع آگرہ کے ملکانہ راجپوتوں کو ہندو بنانے کی جو تحریک شروع کی گئی ہے اس کی نسبت حسب ذیل خیالات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں:

ہندستان میں ہر شخص اور ہر جماعت کو حق حاصل ہے کہ جائز اور با امن طریقے سے اپنے مذہب کی اشاعت و تبلیغ کرے۔ قدرتی طور پر بھی ہر شخص اور ہر جماعت اپنی پسند اور مرضی میں آزاد ہے۔ ہر انسان حق رکھتا ہے کہ اپنے اعتقاد کی طرف دوسروں کو دعوت دے اور جس اعتقاد کو حق سمجھے اپنی پسند اور مرضی سے قبول کرے۔ اعتقاد اور پسند کی آزادی انسان کا قدرتی اور پیدائشی حق ہے انسان نے اپنے اور بہت سے حقوق کی طرح یہ حق بھی کھو دیا تھا۔ تیرہ سو برس ہوئے قرآن نے از سر نو اس کا اعلان کیا: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ[1] (البقرہ)

حق کا مسئلہ

اگر ملکانہ راجپوتوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی پسند اور مرضی سے ہندو قوم میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ضرور انہیں یہ حق حاصل ہے میں سمجھتا ہوں ان کے اس حق سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ اسوقت تک ہندو اس بات کے لئے تیار نہیں تھے اور نہ ازروئے مذہب اسے جائز سمجھتے تھے۔ اب اگر کچھ لوگ ہیں جو آریہ سماج کے ساتھ اس بارے میں متفق ہو گئے ہیں تو

---

[1] دین کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں (کیونکہ وہ دل کے اعتقاد سے تعلق رکھتا ہے اور جبر و تشدد سے اعتقاد پیدا نہیں کیا جا سکتا) بلا شبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے اور اب دونوں راہیں لوگوں کے سامنے ہیں جسے چاہیں اختیار کریں) پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کرے (یعنی سرکشی اور فساد کی قوتوں سے بیزار ہو جائے) اور اللہ پر ایمان لائے تو بلا شبہ اس نے (فلاح و سعادت) کی مضبوط ٹہنی پکڑ لی یہ ٹہنی ٹوٹنے والی نہیں اور یاد رکھو اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔

جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے مسلمانوں کیلئے کوئی وجہ نہیں کہ اس بات پر معترض ہوں۔ ان کے لئے صرف ایک ہی بات صحیح اور برمحل ہوسکتی ہے۔ وہ بھی اپنا مذہبی فرض انجام دیں اور ملکانہ راجپوتوں کو اسلام میں مضبوط اور مستقل بنانے کی کوشش کریں۔ اپنے کام سے غفلت کرنا اور غفلت کے جب قدرتی نتائج پیدا ہوں تو غیروں کا گلہ کرنا نہ تو عقل و دانائی کی بات ہے نہ عزت و شرف کی۔

ملکانہ راجپوتوں کا معاملہ

لیکن موجودہ مسئلہ حق اور آزادیٔ انتخاب کا سوال نہیں ہے۔ معاملہ کے جس پہلو نے عام جذبات پر اثر ڈالا ہے وہ دوسرا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا کوئی جماعت اپنی اسپند سے ایک مذہبی حلقہ چھوڑ کر دوسرا اختیار کرلے، دوسری صورت یہ ہے کہ اس غرض سے ایک آرگنائزڈ (منظم) اور جماعتی کوشش بطور ایک مومنٹ (تحریک) کی شروع کی جائے۔ آریہ سماج کی جانب سے جو کوشش شروع ہوئی ہے وہ دوسری قسم کی ہے، پہلی صورت نہیں ہے۔ قدرتی طور پر اس کے اثرات پہلی صورت سے مختلف شکل میں نمایاں ہونگے میں پورے وثوق کے ساتھ رائے رکھتا ہوں کہ جن لوگوں نے موجودہ وقت میں یہ تحریک شروع کی، انھوں نے ملک کا عام مفاد نظر انداز کردیا۔ ان کا فرض تھا کہ اس بات سے غفلت نہ کرتے اور سمجھتے کہ اس وقت ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے جو ملک کے جذبات اور توجہ کو ملکی اتفاق اور مشترک جد وجہد سے ہٹا کر کسی اشتعال انگیز مقصد کی طرف لے جائیں یہ بات کہ سیاسی اور ملکی اتفاق ایک دوسری چیز ہے اور اپنی مذہبی تبلیغ کی سرگرمی دوسری چیز، ایک کا اثر دوسرے پر نہ پڑنا چاہیئے، کتنی ہی معقول اور صاف ہو لیکن عملی طور پر قوموں اور جماعتوں کی سائیکولوجی (نفسیات) پر منطبق نہیں ہوسکتی۔ میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جن لوگوں نے یہ تحریک شروع کی، انھوں نے ملک کی متفقہ فضا کو مکدر کرنے اور عام جذبات کو ہیجان میں لانے کی بہت بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی سوامی شردھانند جی میں

کہ ملکانہ راجپوت دراصل ہندو ہی ہیں۔ ہندوؤں نے اب تک چھوڑ رکھا تھا۔ اب شدھی کرنے سے یہ مقصد ہے کہ بہ طور ہندو رکنا کو ائز (تسلیم) کر لیا ہے۔ میں ان کی بات تھوڑی دیر کے لئے مان لوں گا اور کہوں گا کہ اگر یہ صحیح ہے تو ان کا پہلا کام یہ تھا کہ ان کروڑوں اچھوت جماعتوں کی خبر لیتے جن کی مظلومانہ حالت نہ صرف ہندستان بلکہ تمام نوع انسانی کے دامن پر وحشت و قساوت کا سب سے بڑا دھبا ہے کیا وہ اس کام سے فارغ ہو گئے ہیں کہ اب ان کے لئے صرف ملکانہ راجپوتوں ہی کا ایک میدان عمل باقی رہ گیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرائض

بلاشبہ معاملہ کا یہ پہلو ایسا ہے جسے ہم افسوس کیساتھ محسوس کرتے ہیں، لیکن صرف محسوس ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ بہتر ہے کہ کرنا چاہیں۔ یہ بات مسلمانوں کے سوچنے کی نہ تھی۔ ان لوگوں کے سمجھنے کی تھی جنھوں نے یہ کام شروع کیا ہے اب بھی صرف انہی کے سمجھنے کی ہے یا ملک کے ان ہندو لیڈروں کے غور کرنے کی ہے جن سے حقیقت حال پوشیدہ نہ ہونی چاہئے۔ مسلمانوں کو نہ چاہئے کہ شکوہ و شکایت کریں یا اپنے لئے کوئی ایسا پوزیشن (موقف) اختیار کریں جس سے توقع اور خواہش نکلتی ہو۔ یہ کام شروع نہ کیا جاتا تو بہتر تھا لیکن جب شروع کر دیا گیا ہے تو مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی چارہ کار رہ گیا ہے، یعنی وہ بھی اپنا فرض سکون اور خاموشی کے ساتھ انجام دیں۔ دوسروں کے لئے یہ نیا قدم ہے لیکن ان کے لئے ان کا اصلی اور دائمی فرض ہے اگر انھوں نے اپنا فرض ادا کیا ہوتا تو آج یہ نتائج پیش نہ آتے۔

حالات کا نقشہ

دوسرا مسئلہ ان حالات کا ہے جو اس تحریک کے سلسلے میں وہاں پیش آ رہے ہیں عام مسلمانوں کے دلوں پر جو چیز زیادہ اثر ڈال رہی ہے، وہ صورت حال یہ ہے کہ ملکانہ راجپوتوں کا ایک پہلا گروہ اس بات کے لئے تیار کر لیا گیا تھا کہ شدھی ہونا قبول کر لے، وہ ہو گیا۔ اب باقی

جماعتیں اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں۔ ایک طرف شدھی سبھا اور وہ لوگ ہیں جو شدھی ہو گئے ہیں اور دوسری طرف اپنی قدیم حالت پر قائم ملکانہ راجپوت ہیں۔ پہلی جماعت کوشش کر رہی ہے کہ سب کے سب شدھی ہونا قبول کر لیں، دوسری اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ اپنی قدیم حالت پر باقی رہے تیسری جانب وہاں کی قدیم ہندو آبادی ہے اور قدرتی طور پر وہ پہلی جماعت کے ساتھ ہے یہ بالکل واضح ہے کہ جب کبھی ایسی صورتحال پیدا کی جائیگی تو ضرور کشمکش اور جبر و اکراہ کی صورتیں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ مذہب اور قومیت کی معاملہ میں بھی انسان حق و انصاف کے حدود کے اندر نہیں رہ سکتا۔ قدرتی بات ہے کہ جو لوگ شدھی کرنیکے خواہش مند ہیں، وہ ہر طرح کے وسائل کام میں لائیں گے جو ہو گئے ہیں وہ ضرور چاہیں گے کہ کسی نہ کسی طرح دوسروں کو بھی اس کے لئے مجبور کریں۔ اطراف کی ہم مذہب جماعتیں بھی، پوری طرح اپنا زور لگائیں گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ طرح طرح کی حق تلفیاں ہونگی، جبر و اکراہ سے کام لیا جائے گا ناجائز دباؤ ڈالا جائیگا، ناجائز ترغیبیں دی جائیں گی اور اس طرح ایک پوری آبادی امن و سکون اور معاشرتی عافیت کی جگہ بدامنی و کشاکش میں مبتلا ہو جائیگی۔ کسی جگہ نناوے آدمی شدھی ہو جائیں گے، ایک نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس پر کیا گزریگی؟ شوہر ہو جائیگا، بیوی نہ ہوگی عجب نہیں اسے مجبور کرنے کیلئے طرح طرح کی سختیاں کی جائیں

شدھی سبھا سے سوال!

میں سوامی شردھانند اور شدھی سبھا کے ارکان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے ان خرابیوں کے روکنے کا کیا انتظام کیا ہے؟ اور کیا از روئے حق و انصاف اس کی ذمہ داری ان کے سر عائد نہیں ہوتی؟ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جب وہ ایک ایسی نازک اور مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر دینے والے کام کی دعوت لیکر اٹھے تو انھوں نے انسان کے حق و امن کو تحفظ کیلئے بھی اپنا کوئی فرض محسوس کیا یا نہیں؟ اگر از خود نہیں کیا تو جب کبھی کوئی ایسا واقعہ ان کے علم میں آیا، انھوں نے اس کے انسداد کیلئے کوئی کوشش کی۔

یہ معاملہ اس قدر واضح اور قدرتی ہے کہ واقعات کے ظہور سے پہلے ہی ہر ذی عقل اور انصاف پسند دماغ اسکی ضرورت تسلیم کریگا، لیکن اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ یہ محض قیاس ہی نہیں ہے، واقعات کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اخبارات میں متعدد اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جن کے ساتھ جبر و اکراہ اور ناجائز دباؤ اور ترغیب کی صورتیں پیش آئی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمام واقعات صحیح ہیں یا نہیں؟ لیکن ان میں سے چند آدمی میرے سامنے بھی آگرہ میں آئے۔ انھوں نے اپنی اپنی سرگزشتیں سنائیں۔

دو جماعتوں کی زیادتی

ان لوگوں نے دو جماعتوں کی طرف سے زیادتی کی شکایت کی۔ ان کی طرف سے جو شدھی ہوگئے ہیں اور ان ہندوؤں کی جانب سے جو وہاں پیشتر سے آباد ہیں۔ ایک مسلمان درزی کو میں نے دیکھا جو اپنی دکان اور مشین چھوڑکر آگرہ بھاگ آیا ہے۔ اس کے گاؤں میں تمام آدمی شدھی ہوگئے ہیں۔ انھوں نے اور پرانے ہندوؤں نے مل کر اسے مجبور کیا کہ وہ بھی ہو جائے۔ جب اس نے انکار کیا تو اس کا بیان ہے کہ مارنے پیٹنے کے لئے تیار ہوگئے۔ ایک ملکانہ[1] راجپوت ہے جو اپنی زمین اور مکان چھوڑکر چلے آنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے گاؤں میں اکثر خاندان شدھی ہوگئے تھے یہ نہیں ہوا اس لئے اس کے خلاف سب نے جتھا بندی کرلی۔ آخر مجبور ہوکر بھاگ آیا اب اس کی زمین پر دوسروں نے قبضہ کرلیا ہے۔ ایک عورت پیش کی گئی جس کا تمام گاؤں شدھی ہوگیا ہے چونکہ وہ اور اس کا لڑکا شدھی نہیں ہوئے۔ اس لئے وہاں کے آدمیوں نے ایکا کرلیا ہے کہ اسکی زمین پر کوئی آدمی کام نہ کرے۔ ایک دوسری جگہ کی نسبت بیان کیا گیا کہ شوہر شدھی ہوگیا، بیوی نہیں ہوئی۔ وہ دوسرے گاؤں کی ہے۔ شوہر نے اسے مکان میں بند کر دیا ہے اور مجبور کر رہا ہے کہ شدھی ہونا منظور کرلے۔

کنور عبدالوہاب کا بیان

آخری واقعہ کنور عبدالوہاب[1] نے سوامی شردھانند اور بعض دیگر ارکان شدھی سبھا کے

---

[1] مشہور قومی کارکن تھے جنھوں نے مختلف مسلمان گروہوں کو شدھی سے محفوظ رکھنے کیلئے بڑی سرگرمی سے کام کیا۔

سامنے بیان کیا۔ میں نے جب ان سے پوچھا تو انھوں نے تسلیم کیا کہ ایسا واقعہ ان کے سننے میں بھی آیا ہے لیکن جو کچھ ہوا ہے لڑکی کے شوہر کی جانب سے ہوا ہے۔ سبھا کے آدمیوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ باقی واقعات کا یہ حال ہے کہ جن آدمیوں پر گزرے ہیں خود انھوں نے میرے سامنے بیان کیا۔ مجھے اتنی مہلت نہ ملی کہ موقع پر جا کر تحقیقات کرتا۔ ان کا انداز بیان، حالات کا توافق اور میری جرحی سوالات کے جوابات ایسے تھے کہ میں سمجھتا ہوں وہ اپنی شہادت میں جھوٹے نہیں ہیں ان کے علاوہ ناجائز ترغیب اور دباؤ کے واقعات بھی بیان کئے جاتے ہیں، لیکن مجھے ذاتی طور پر ان کے سننے کا موقع نہیں ملا۔ میں ان کی نسبت بطور تحقیق و شہادت کے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کانگرس کے نائب صدر کی شہادت

جس دن میں آگرہ پہنچا اسی دن سوامی شردھانند وہاں سے جا رہے تھے باوجود میرے اصرار کے وہ ٹھہر نہ سکے۔ میں نے مسٹر چاندمل سے جو آگرہ کانگرس کمیٹی کے وائس پریزیڈنٹ اور شدھی سبھا کے خزانچی ہیں، پوچھا کہ ان کی سبھا نے آج تک کوئی کوشش ایسے واقعات کے انسداد کی کی ہے؟ انھوں نے تسلیم کیا کہ نہیں کی۔ البتہ وہ معترف تھے کہ ایسا کرنا چاہئے اور آئندہ کیا جائے گا۔

بلا شبہہ معاملہ کا یہ پہلو ملک کے ہندو رہنماؤں کے لئے خاص طور پر قابل توجہ ہے ان کا فرض ہے کہ اس کے انسداد کی کوشش کریں یہ فرض آریا سماج اور شدھی سبھا کا تھا وہ اگر اس میں پوری نہ اتری تو ہندو پریس اور ہندو لیڈروں کا فرض ہے کہ جہاں تک از روئے حق و انصاف ضروری سمجھیں اپنا فرض انجام دیں مجھے یقین ہے کہ کوئی انصاف پسند ہندو اسے پسند نہ کرے گا کہ غریب اور بے زبان ملکانہ راجپوتوں میں سے کسی ایک آدمی پر بھی اس لئے سختی ہو کہ وہ اپنی پسند اور مرضی سے اپنا اعتقاد بدلنا نہیں چاہتا۔

ابوالکلام

مسئلہ خلافت اور جمہوریہ ترکیہ

النباء العظیم

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ ۔

یہ مقالہ النباء العظیم کے عنوان سے مولاناؒ نے ۱۹۲۳ء میں مرتب فرمایا تھا اور زمیندار کی
سات قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد پاک و ہند کی وسیع سرزمین
میں جس میں عوامی تحریک کا ظہور ہوا، وہ اپنے مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے یگانہ حیثیت
کی مالک تھی۔ اس تحریک کو تحریک ترک موالات یا تحریک لاتعاون بھی کہا جاتا ہے۔ اس
کے تین مقاصد تھے سوراج یعنی ملک کے لئے خودمختار آزاد حکومت بحالی خلافت و
آزادی جزیرۃ العرب اور پنجاب میں حکومت کے کارندوں نے جو ظلم کئے تھے ان کی تلافی
تحریک بحالی خلافت کی مختصر سی کیفیت یہ ہے کہ پہلی عالمی جنگ میں ترکوں نے جو اس وقت
خلافت عامہ کے بھی حامل تھے، انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف حصہ لیا تھا، جرمنی
اور آسٹریا کی طرح ترکوں نے بھی مسٹر ولسن صدر جمہوریہ امریکہ کے چودہ نکات کی بنا پر
جنگ بند کی تھی صلح کے لئے گفت و شنید جاری ہوئی تو امریکہ اپنے اتحادیوں خصوصاً
برطانیہ اور فرانس کے طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر علیحدہ ہو گیا۔ برطانیہ و فرانس جنگ
میں عربوں کے ساتھ آزادی کا وعدہ کر کے انہیں ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر چکے تھے
صلح کے وقت ان دونوں نے عربوں سے بھی بدعہدی کی اور ان کے مختلف علاقے اپنے زیر
اثر لے لئے۔ اس طرح جزیرۃ العرب کی آزادی اور تقدیس قائم نہ رہ سکی۔ ترکوں سے بھی
بدعہدی کی اور ان کے قومی علاقے یونان و اٹلی کے درمیان بانٹ دیئے قسطنطنیہ
(استنبول) پر قبضہ جما لیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے خلافت کی بحالی اور جزیرۃ العرب کی تطہیر

کے لئے جدوجہد شروع کی۔ کانگریس نے مسلمانوں کی اس تحریک کو اپنا لیا۔ پہلے ہجرت کی تحریک جاری ہوئی۔ پھر قید و بند کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ لاکھوں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے اسیری کی مصیبتیں بہ طیب خاطر برداشت کر لیں۔ یہ پہلی کاری ضرب تھی، جو انگریزی اقتدار پر لگی۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی دو جماعتیں پوری قومی تحریک کی کفیل تھیں، اوّل جمعیۃ خلافت دوم جمعیۃ العلماء۔ ترکوں نے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں یونانیوں کو شکست فاش دیکر اناطولیہ سے نکال دیا۔ اٹلی نے لڑے بھڑے بغیر صلح کر لی۔ فرانس کو بھی مصالحت ہی میں عافیت نظر آئی۔ برطانیہ کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے مجاہد ترکوں کی مزاحمت کا فیصلہ کیا، مگر انگریزی نو آبادیوں کی حکومتوں اور برطانیہ کے عوام نے ساتھ نہ دیا اور لائڈ جارج کو استعفیٰ دینا پڑا۔ ترک کامیاب ہوئے انھوں نے جمہوری حکومت قائم کر لی۔ انگورہ (موجودہ انقرہ) کو مرکز بنایا اور غازی مصطفیٰ کمال پاشا صدر جمہوریت قرار پائے۔

جنگ کے آخری دور میں وحید الدین سلطان ترکی تھا، وہ انگریزوں کے زیر اثر تھا مجاہد ترکوں کی کامیابی پر وہ قسطنطنیہ چھوڑ کر چلا گیا اس کی جگہ عبد المجید خاں کو سلطان اور خلیفہ بنا دیا گیا۔ اہل بصیرت کے نزدیک مناصب کی یہ تقسیم درست نہ تھی جب مجاہد ترکوں پر اس فیصلہ کی خامیاں واضح ہوئیں تو انھوں نے خلافت کا منصب ختم کر دیا۔ سلطان عبد المجید خاں کو شاہی خاندان کے دوسرے افراد کو ملک سے نکال دیا۔ اس پر مسلمانان ہند میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، جس کی تفصیلات یہاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ مولانا نے اپنے طویل مقالے میں تمام ضروری چیزیں خود واضح فرما دی ہیں۔

افسوس کہ یہ سلسلہ مکمل نہ ہو سکا اور اس کے باقی پہلو زیر بحث نہ آسکے ہیں

نے مختلف مقالے کے مختلف حصوں کو نمبروں کی ترتیب میں یہاں مرتب کردیا ہے ابتدائی دو نمبروں میں مولانا نے اپنے انٹرویو کی کیفیت بیان فرمائی ہے باقی پانچ نمبروں میں بعض ضروری پہلوؤں پر گفتگو کی ہے مطالعہ سے خود بخود واضح ہو جائے گا کہ یہ مقالہ علمی نقطہ نگاہ سے کس درجہ اہم ہے۔

(۱)

خبروں کی کیفیت | جمہوریہ ترکیہ کے جدید فیصلۂ خلافت کی سب سے پہلی خبر یہاں ۲ مارچ ۱۹۲۴ء کو شائع ہوئی۔ اخبار کے مطالعے کے دو گھنٹہ کے بعد مقامی اخبارات کے نامہ نگار میرے پاس آئے۔ میں نے جو کچھ اس وقت کہا تھا، پھر اس کے بعد ۳ اور ۴ مارچ کو کہا وہ یک جا صورت میں حسب ذیل ہے۔

"موجودہ حالت میں کسی قطعی رائے کا اظہار مشکل ہے مسئلہ اسقدر نازک اور غیر معمولی نوعیت کا ہے کہ محض رائٹر ایجنسی کی ترجمانی اس کی وضاحت کیلئے کافی نہیں ہو سکتی۔ تاہم اس قدر کہہ دینے میں مجھے تامل نہیں کہ جن الفاظ اور جس شکل میں یہ خبر بھیجی گئی ہے اور جو اثر اس کا پڑھنے والے پر پڑتا ہے، اصلیت ضرور اس سے مختلف ہے خبر میں متعدد تغیرات کا ذکر کیا گیا ہے، خلیفہ کا عزل، حکومت کی موقوفی، عثمانی شاہی خاندان کی حکماً جلاوطنی وزارت اوقاف، وزارت امور دینیہ اور چیف آف جنرل شاف کی موقوفی اور قدیم دینی مدارس کے بند کر دینے کا فیصلہ۔ میں پہلے آخری تعبیرات کی نسبت کہوں گا۔ رائٹر ایجنسی ہمیں صرف اس قدر سنا کر خاموش ہو جاتی ہے کہ مندرجہ صدر وزارتیں موقوف کر دیگئی ہیں، لیکن یہ نہیں بتلاتی کہ جن امور کا ان وزارتوں سے تعلق تھا، آئندہ ان کا انصرام کیونکر ہوگا؟ قدرتی طور پر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترکی حکومت آئندہ دین اور مذہب کا اہتمام کرنا نہیں چاہتی اور اسی لئے اس نے دینی مدارس کے بند کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن میں پورے وثوق اور بصیرت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تغیرات صحیح طور پر ہوئے ہوں یا غلط طور پر، ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔

امور دینیہ، اوقاف اور تعلیم! یہ صحیح ہے کہ نیشنل اسمبلی میں ایک بل منظور ہو گیا ہے جس کا کئی ہفتہ سے ترکی اخبارات میں چرچا تھا اور اب آئندہ سے دینی معاملات اور اوقاف کی وزارتیں موقوف کر دی گئی ہیں مگر اس لئے نہیں کہ آئندہ سے حکومت ان امور کا اہتمام کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ اس لئے کہ ایک نئے طریقے پر انتظام مقصود ہے یہ دراصل موقوفی نہیں بلکہ (جیسا کہ عصمت پاشا نے گزشتہ ماہ ظاہر کیا تھا) ایک طرح کی اداری (ڈپارٹمنٹل) تبدیلی ہے۔ اس وقت تک ترکی میں دینی و تعلیمی انتظامات کیلئے ایک طرح کی غیر منطقی تقسیم قائم تھی۔ یعنی ایک طرف تو ملک کے تمام قانونی، داخلی اور مالی انتظامات کیلئے مستقل وزارتیں اور صیغے قائم تھے، دوسری طرف دینی امور کے انصرام کے لئے ایک الگ صیغے اور بعد کو ایک علیحدہ وزارت قائم ہو گئی تھی۔ حالانکہ جب حکومت کا سرکاری دین اسلام تھا اور تمام قانونی اور انتظامی معاملات ایک مسلمان حکومت کی حیثیت سے انجام دیئے جاتے تھے تو پھر اس کی کیا ضرورت تھی کہ ایک الگ وزارت امور دینیہ کے نام سے قائم رکھی جائے اور ایک طرح کی دوعملی انتظامات میں پیدا کی جائے؟ اسی طرح جب ملک کی عام تعلیم کیلئے، جس میں دینی تعلیم بھی داخل ہے، ایک وزارت موجود تھی تو پھر دینی تعلیم کے لئے ایک خاص الگ صیغہ قائم رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اب حکومت نے اس جدید تجویز کے ذریعہ اس دوعملی انتظام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اوقاف کا صیغہ وزارتِ مال کے ماتحت کر دیا ہے دینی امور کا تعلق عملی طور پر جن جن صیغوں سے تھا ان کی نگرانی انہی صیغوں اور وزارتوں سے متعلق کر دی گئی ہے۔ دینی تعلیم کا انتظام براہِ راست وزارت تعلیم کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ وزراء جس طرح علم و عمل کی ہر شاخ کیلئے ماہرین فن سے مدد لیتے ہیں، اسی طرح دینی امور اور دینی تعلیم کے لئے علماء سے مدد لیں گے۔ باقی رہا قدیم دینی مدارس کی موقوفی کا معاملہ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ قسطنطنیہ اور دیگر ترکی شہروں کی مسجدوں میں عربی مدارس قدیم روش کے قائم تھے جن میں تعلیم کا کوئی خاص انتظام و معیار نہ تھا، نیز باقاعدہ نصاب اور امتحان کی جو کتابیں پڑھائی جاتی

تھیں وہ بھی مفید اور موزوں نہ تھیں! وعرصے سے محسوس کیا جا رہا تھا کہ وہاں کے تعلیم یافتہ ملک کیلئے بیکار اور ناقابل قبول ہیں۔ یا تو ان کی اصلاح کی جائے یا علوم دینیہ کی نئی درسگاہیں قائم کی جائیں۔ اب اس جدید قانون کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ اس دیرینہ احساس کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ چنانچہ اب یہ تمام مدرسے بند کر دیئے جائیں گے۔ ان کی جگہ قسطنطنیہ یونیورسٹی میں میں ایک خاص شعبہ علوم دینیہ کا جاری کیا جائے گا۔ پچھلی ڈاک کے ترکی اخبارات میں ایک ممبر اسمبلی کا بیان چھپا تھا کہ اس شعبہ کے قیام کے لئے شیخ اسماعیل حقی آفندی ازمیری کا تقرر عمل میں آئیگا جو اس وقت قسطنطنیہ میں تاریخ اسلام کے پروفیسر ہیں۔

اصلاحات سے ناامیدی! میں اسوقت اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ جو کچھ ہوا ہے بہتر طریقہ پر ہوا ہے یا نہیں؟ جہاں تک میری ذاتی معلومات و آراء ہیں میں ترکی کی برسر اقتدار جماعت سے اس میں کچھ زیادہ خوش آئند توقعات نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں اگرچہ وہ اصلاح کے لئے مضطرب و مستعجل ہے لیکن اصلاح کی صحیح اور معتدل راہ اس کے سامنے نہیں ہے، نہ بدقسمتی سے اس میں ایسے لوگ ہیں جو مذہبی اصلاح کی نزاکتوں اور مشکلوں پر عبور رکھتے ہوں، لیکن جو بات میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ان تغیرات سے مقصود بہر حال اصلاح و درستگی اور ایک طریق چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کرنا ہی ہے نہیں کہ سرے سے دینی تعلیم بند کر دی جائے یا حکومت دین و مذہب کے اہتمام سے دستبردار ہو جائے۔ ایسا خیال کرنا صریح واقعات کی تکذیب کرنا ہے اگر موجودہ حکمران جماعت کے چند افراد ایسا کرنا بھی چاہیں جب بھی وہ ایسا کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ مسلمانان عالم سے قطع نظر کر لو، خود ترکی میں اسوقت دس ملین مسلمان آباد ہیں جن میں پچانوے فیصد قطعاً آرتھوڈکس مسلمان ہیں اور ترکی فوج تو تمام تر ایسے ہی اناطولی مسلمانوں سے بنی ہے کیونکر عقل باور کر سکتی ہے کہ حکومت دین و مذہب کے اہتمام سے دست بردار ہو جائے اور وہ خاموش بیٹھے تماشا دیکھتے رہیں؟

جنرل فوزی پاشا چیف آف جنرل اسٹاف پچھلی وزارت کے ایک رکن بھی ظاہر ہے

کہ وزارت جنگ کی موجودگی میں اس وزارت کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ ممکن تھا کہ ملکی سیاسیات وانتظام میں فوجی عناصر کی شرکت آگے چل کر فسادات کا باعث ہوتی۔ اس لئے اب آئندہ سے یہ وزارت بھی موقوف کردی گئی ہے اور یقیناً یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔

مسئلہ خلافت ۔ اب آیئے اسی روشنی میں اس معاملہ پر بھی غور کریں جو خلافت کی نسبت بیان کیا گیا ہے۔ خبر کا مفادیہ ہے کہ خلیفہ عبدالمجید معزول کردیئے گئے ہیں اور منصب خلافت موقوف۔ آپ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اب آئندہ سے ترکی حکومت میں اسلامی خلافت باقی نہیں رہی، کیونکہ خلیفہ کا منصب موقوف کردیا گیا ہے لیکن مجھے اس بات کے تسلیم کرنے سے انکار ہے یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ اسلامی حکومت کی حقیقت پر آپ کی نظر نہیں۔ چوں کہ رومن کیتھولک چرچ میں ایک دینی و روحانی منصب "پوپ" کا موجود ہے اس لئے ہمیشہ اسلامی خلافت کا لفظ بولتے ہوئے لوگوں کا ذہن پوپ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے پوپ کا ایک خاص روحانی منصب اور دینی اقتدار ہے اگر وہ موقوف کردیا جائے، وٹیکال (روم) میں پوپ کا نظام باقی نہیں رہیگا آپ سمجھتے ہیں اسلامی خلافت کا بھی یہی حال ہے وہ ایک خاص روحانی منصب ہے اگر کسی تجویز اور حاکمانہ اقتدار کے ذریعے اس کی موقوفی کا اعلان نافذ کردیا جائے تو پھر گو اسلامی حکومت بدستور باقی رہیگی، لیکن خلافت قسطنطنیہ میں باقی نہیں رہے گی۔ میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ ایسا سمجھنا نہایت سخت غلطی ہے اسلامی خلافت کی حقیقت پوپ کے منصب سے اتنی ہی مختلف ہے جس قدر اسلام کا عقیدۂ توحید مسیحی تثلیث سے (مختلف ہے)۔

اسلامی خلافت کی حقیقت ۔ اسلامی خلافت سے مقصود دراصل حکومت ہی ہو خلیفہ وہ ہے جو اس حکومت کا رئیس ہو جس معنی کے لئے عام طور پر حکومت اور سلیٹ کا لفظ بولا جاتا ہے چند خصوصیات کی بناپر اسلامی بول چال میں اسی کا نام خلافت ہے پس اگر "اسلامی حکومت" موجود ہے تو اسلامی خلافت بھی موجود ہے ان میں باہم تعدد کی نسبت

نہیں ہے کہ ایک کی موجودگی دوسرے کے لئے مستلزم نہ ہو، ترادف ہے جس کی وجہ سے ایک کی موجودگی دوسرے کی موجودگی کے ہم معنی ہوگی۔ باقی رہی یہ بات کہ اس کا نظام کیا ہو؟ تو یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے اگر وہ صحیح نظام پر ہے تو صحیح خلافت مقصود ہوگی، اگر غلط نظام پر ہے تو ناقص اور محتاجِ اصلاح سمجھی جائے گی لیکن نظام کی صحت و غلطی اس کی موجودگی کے مسئلے پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔"

موقوفی سے مقصود کیا ہے؟ "اب غور کرنا چاہیئے کہ خلافت کی موقوفی سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ آئندہ سے ترکی حکومت موقوف کردی گئی؟ یا آئندہ سے ترکی حکومت ایک مسلمان حکومت نہیں رہیگی؟ کیونکہ یہی دو صورتیں خلافت کی موقوفی کی ہو سکتی ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کوئی صحیح العقل انسان اسے باور کرسکے۔ یہ واقعہ ہے کہ ترکی کی مسلمان حکومت اب بھی موجود ہے"۔

عجب نہیں اس کا مطلب دوسرا ہو۔ اٹھارہ مہینے ہوئے ٹرکش اسمبلی نے سلطنت اور خلافت کی علیحدگی کا اعلان کیا تھا اور اس کے بعد بہ یک وقت دو منصب قرار دیئے تھے ایک خلیفہ کا، ایک جمہوریت کے صدر کا۔ فی الحقیقت یہ تفریق اور مناصب کا تعدد قطعاً احکام اسلامی کے خلاف تھا۔ اس میں وہی غلطی کارفرما تھی جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے ترکی حکومت کو جمہوریت کے نظام میں بدل دیا تھا تو اسلامی نقطۂ خیال سے یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی، بلکہ ان مطلوبات میں سے تھی جن کا صدیوں سے مصلحین اسلام کو انتظار تھا، لیکن اس کے بعد یہ نہیں ہونا تھا کہ حکومت سے الگ خلیفہ کا منصب قرار دیا جائے۔ خلیفہ حکومت کے اعلیٰ رئیس کا نام ہے جب تک حکومت شخصی و شہنشاہی تھی سلطان اس کا رئیس تھا اور وہی خلیفہ تھا۔ اب جمہوریت ہو گئی تو اس کا اعلیٰ رئیس صدر جمہوریت ہے اور یہی کو خلیفہ ہونا چاہئے۔ اگر اسمبلی عثمانی خاندان کے خلاف نہ تھی تو چاہیئے تھا کہ جمہوریت کے صدر عبدالمجید ہوتے۔ اگر وہ اس کے خلاف تھی تو چاہیئے تھا کہ جو صدر منتخب ہوتا

وہی خلیفہ ہوتا، اس کے کوئی معنی نہ تھے کہ اسلام میں بھی پوپ کے روحانی تاج وتخت کا ایک نیا ہیکل طیار کیا جائے (۱۱ مئی ۲۴ ۱۹ء)

(۲)

اصحاب بصیرت کی ناپسندیدگی | یامر واقعہ ہے کہ اسمبلی کے اس فیصلہ کو تمام اصحاب بصیرت مسلمانوں نے سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا جب گزشتہ سال جنوری میں میں جیل سے رہا ہوا ہوں اور ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندہ نے اس بارے میں دریافت کیا ہے تو میں نے کہا تھا "اسلام میں پوپ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور ضروری ہے کہ اس معاملہ پر نظر ثانی کی جائے۔" البتہ یہ ضروری ہے کہ مسلمانان ہند نے اس کے خلاف کوئی علانیہ نہیں کیا کیونکہ ترک ابھی ابھی جنگ سے نکلے تھے۔ صلح کی گفت وشنید مکمل نہیں ہوئی تھی مخالفین ان کی ہر مخالفت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے تھے اس لئے مصلحت کے خلاف تھا کہ ان کے خلاف عام لوگوں میں ایجی ٹیشن پھیلایا جاتا۔ ضرورت تھی کہ اندرونی طور پر اصلاح حال کی کوشش کی جائے اور آئندہ کے لئے ایک صحیح اسلامی نظام قرار پائے۔ چنانچہ اسی غرض سے طے پایا تھا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا وفد انگورہ جائے انکے اغراض ومقاصد میں اولین مقصد یہی غلطی کی اصلاح تھی۔ علاوہ بریں پرائیویٹ طور پر بھی اعیان انگورہ کو ان کی غلطی پر برابر تنبیہ کیا گیا چنانچہ جنوری ۲۳ ۱۹ء سے اس وقت میں متعدد مراسلات بعض اعیان حکومت کے نام بھیج چکا ہوں اور ان کے عذرات وتوجیہات معلوم کرچکا ہوں۔

دو خلیفہ ہوگئے تھے | "فی الحقیقت اس تفریق کے بعد بہ یک وقت دو خلیفے ہوگئے تھے ایک حقیقی اور ایک رسمی۔ حقیقی انگورہ میں تھا جس کے قبضہ میں حکومت کی اعلیٰ ریاست تھی، رسمی اور خود ساختہ قسطنطنیہ کے قصر دولمہ باغچہ سرائے میں تھا، جسے صرف جلوس سلاملق کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ جس وقت ٹرکش اسمبلی اپنے لئے ایک صدر منتخب کررہی تھی تو اسے معلوم نہ تھا کہ وہ در اصل خلیفہ منتخب کررہی ہے کیونکہ اسلامی خلیفہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ

کہ اسلامی حکومت کا رئیس ہے۔ اسلامی جمہوریت کے پریذیڈنٹ کو پریزیڈنٹ کہنا اور خلیفہ نہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم ری پبلک کے پریذیڈنٹ کو پریذیڈنٹ تو کہیں جو انگریزی لفظ ہے مگر صدر یا رئیس کہنے سے انکار کردیں جو عربی الفاظ ہیں۔ حالانکہ مدلول دونوں کا ایک ہے، فرق صرف زبان کا ہے۔

یہ یاد رہے کہ اسلام "بادشاہ" کے منصب اور اقتدار سے قطعاً منکر ہے۔ صدر اول کے مسلمان ایسے اقتدار کو ایک بدعت اور معصیت سمجھتے تھے۔ وہ صرف امیر اور خلیفہ کا منصب تسلیم کرتے تھے۔ امیر کی جگہ نظام خلافت میں تقریباً وہی ہے جو آج کل ایک صدر جمہوریت کی ہوتی ہے۔ میں نے تقریباً اس لئے کہا کہ اسلامی خلیفہ کو صدر اول میں اس سے بھی کم ذاتی تسلط و اختیار قوم نے دیا تھا جس قدر آج امریکہ یا فرانس کے پریذیڈنٹ کو حاصل ہے"۔

موقوفی کی حقیقت "میں خیال کرتا ہوں شاید اب اعیان انگورہ اپنی اس شدید اور اصولی غلطی پر متنبہ ہوگئے ہیں اور اس لئے انھوں نے اٹھارہ ماہ کا خود ساختہ منصب خلافت موقوف کردیا ہے تاکہ صرف حکومت ترکی اور اس کے صدر کا منصب (جو فی الحقیقت خلیفہ کا منصب ہے) باقی رہ جائے۔ اگر حقیقت حال یہی ہے تو در حقیقت "خلافت کی موقوفی" سے مقصود ایک نئے خود ساختہ منصب کی موقوفی ہے نہ کہ نفس خلافت کی اور اس صورت میں یہ انقلاب قابل اعتراض نہیں۔ نہ صرف یہ کہ قابل اعتراض نہیں بلکہ میں کہوں گا، ہمارے مطالبہ کی تعمیل و تکمیل ہے۔

عثمانی شاہی خاندان "البتہ ہم مسلمانان عالم کے لئے جو ترکی سے باہر بستے ہیں، یہ بات نہایت مسرت کی ہوتی، اگر عثمانی شاہی خاندان کے ساتھ یہ درد انگیز سلوک نہ کیا جاتا اور اسلامی جمہوریت کے اولین صدر عبدالمجید خاں ہوتے، جنہیں خود ہی اسمبلی نے وحیدالدین خاں کے بعد خلیفہ منتخب کیا تھا۔ تاہم ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ واقعات کی دنیا جذبات کے عالم سے مختلف ہوتی ہے در اصل جمہوریت کے قیام کے بعد قدیم شاہی خاندان کی موجودگی سے ایک ایسی غیر طبعی حالت ہوگئی تھی جو کسی طرح نبھ نہیں سکتی تھی۔ کسی نہ کسی وقت

ترکی کو اس افسوسناک مرحلے سے گذرنا تھا۔ جواب پیش آگیا ہے۔"

خبروں کا ایک دوسرا مطلب | نامہ نگار نے سوال کیا :

"انقلاب کی خبروں کا جو کچھ مطلب آپ نے بیان کیا ہے یہ آپکا ریڈنگ (مطالعہ) ہے، لیکن کیا آپ کے خیال میں خبروں کا یہ مطلب کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتا کہ ٹرکش اسمبلی نے نفس خلافت موقوف کردی ہو؟"

میں نے جواب میں کہا :

"ہاں میں تسلیم کرتا ہوں، ایک مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اس نے فیصلہ کرلیا ہو آئندہ وہ ترکی میں کسی فرد کو خلیفہ کے لقب سے نہیں پکارے گی۔ یعنی گو اسلامی نظام کے مطابق صدر جمہوریہ ہی خلیفہ ہے، مگر وہ اسے صرف صدر کہے گی، خلیفہ نہیں کہے گی۔ اس سے اس کا مقصود یہ ہو کہ جو تاریخی اور روایتی شخصی اقتدار لفظ "خلیفہ" کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے، وہ صدر جمہوریت کی شکل میں دوبارہ مراجعت نہ کرے یا یہ مقصود ہو کہ بالفعل ترکی صرف اپنی اندرونی ترقی و فلاح ہی کے لئے وقف ہو جانا چاہتی ہے اور اس لئے نہیں چاہتی کہ ایک خاص فرد اس عالم گیر لقب سے ملقب ہو کر اپنے گرد عام اسلامی قیادت و رہنمائی کی توقعات جمع کرے اگر اسمبلی کے فیصلہ کا یہی مطلب ہے تو مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ بڑی سے بڑی غلطی ہوگی، جو ترکی حکومت کر سکتی ہے۔ تمام عالم اسلامی کی متفقہ ناراضی اور عالم گیر اسلامی احتجاج اس فیصلے کے منحوس نتائج میں سے پہلا نتیجہ ہوگا۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہوگا کہ لیڈران انگورہ نے نئی ترکی کے پیدا کرنے میں کتنی ہی عظیم الشان شجاعت و حکمت کا ثبوت دیا ہو لیکن وہ قدیم "اسلامی اصلاح" کے مسئلے کی مشکلات پر غالب آنے کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے وہ ایسا کر کے نہ صرف ترکی حکومت کو نقصان پہنچائیں گے بلکہ عالم اسلامی کے لئے ایک نئے فتنۂ عظیم کا دروازہ کھول دیں گے۔"

خلافت بہر حال ترکی میں ہے | "اچھا اگر اس خبر کا یہی مطلب ہو تو اس صورت میں تو

آپ تسلیم کرلیں گے کہ اب اسلامی خلافت ٹرکی میں باقی نہیں رہی؟ نامہ نگار نے سوال کیا۔

" قطعاً نہیں مجھے تعجب ہے میرا اتنا لمبا چوڑا بیان سُن کر بھی آپ اسلامی خلافت کا صحیح تخیل پیدا نہ کرسکے۔ خلافت سے مقصود اسلامی حکومت ہے جس وقت تک ٹرکی میں خود مختار حکومت باقی ہے اور ایسے مسلمان حکومت ہونے سے انکار نہیں، اس وقت تک اسلامی خلافت بھی وہیں ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسری خود مختار طاقت ور مسلمان حکومت یعنی خلافت دنیا میں موجود نہیں۔ خلافت کوئی مجرد منصب نہیں کہ معزول یا موقوف کردینے سے موقوف ہو جائے وہ ایک واقعہ ہے، یعنی اسلامی حکومت کی موجودگی جس وقت تک یہ واقعہ غیر واقع نہ ہو جائے ہم اس سے کیونکر انکار کرسکتے ہیں؟ البتہ اس صورت میں ہمارا اعتقاد یہ ہوگا کہ موجودہ خلافت ایسے لوگوں کے قبضہ میں آگئی ہے جو ایک سخت غلطی اور گمراہی کے مرتکب ہوئے ہیں اور خلافت کا نظام صحیح نہیں رہا اور اس لئے تمام مسلمانانِ عالم کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح و درستگی کے لئے کوشش کریں۔ اسی طرح کوشش کریں جس طرح اس غلطی سے پہلے دوسری قسم کی غلطیوں کیلئے اعتراف خلافت کے ساتھ اصلاح حال کی سعی ان پر فرض تھی۔

جامدین اور مفرطین

نامہ نگار نے میرے بیان کے ابتدائی حصہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا " آپ نے کہا موجودہ برسرِ اقتدار جماعت سے میں کچھ زیادہ بہتر توقعات نہیں رکھتا آپ اس کی مزید تشریح کریں گے؟ "

میں نے جواب دیا:

" اس کی تشریح سردست ملتوی رکھئے یہ بہت طول طویل داستان ہے مختصراً یوں سمجھئے کہ مغربی تمدن کی اشاعت نے مشرق میں ایک سخت کشمکش پیدا کردی ہے ایک طرف قدیم افکار ہیں، دوسری طرف جدید اصول۔ یہی کشمکش عالم اسلامی میں بھی جاری ہے اور تین جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک جماعت قدیم سکول کی ہے جو اپنے تمام تقلیدی رسوم و خیالات میں سختی کیساتھ

جمی ہوئی ہے، کسی طرح کی لچک اور حرکت اس میں نہیں پائی جاتی۔ دوسری جماعت نئی نسل کی ہے۔ اس نے مغربی تمدن کی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے، لیکن اسلامی تعلیم اور آداب سے بے بہرہ ہے۔ وہ متعصب اور جامد علماء اور عوام الناس کے عقائد و رسوم ہی کو اسلام سمجھتی ہے اور انھیں ترقی میں مانع دیکھ کر متوحش اور مضطرب ہو گئی ہے۔ تیسری جماعت معتدل فکر و نظر کی ہے۔ یہ ان دونوں کناروں کے بیچ وسط ہے۔ یہ نہ پہلی جماعت کی طرح قدیم تقلید میں جمی ہوئی ہے۔ نہ دوسری کی طرح مغربی تہذیب کے سیلاب میں بہہ گئی ہے۔ اس کا اعتقاد یہ ہے کہ مغربی تمدن کی تمام خوبیاں حاصل کی جا سکتی ہیں، بغیر اس کے اسلام کی حقیقی اور خالص روح کو نقصان پہنچایا جائے۔ بد قسمتی سے ٹرکی میں صرف پہلی دو جماعتیں پائی جاتی ہیں، تیسری جماعت تقریباً مفقود ہے میرے خیال میں ساری دقتیں اور مشکلیں اسی واقعہ کا نتیجہ ہیں۔"

یہاں آرا کا خلاصہ ہے جو ابتدائی خبروں کے وصول کے بعد میں نے ظاہر کی تھیں میں چاہتا ہوں کہ میرے آئندہ بیانات سے پہلے لوگ اس پر نظر ڈال لیں۔ (۱۲ مئی ۱۹۲۴ء)

(۳)

خاموشی اور انتظار اس ابتدائی اظہار رائے کے بعد جہاں تک اخبارات کا تعلق ہے، میں بالکل خاموش رہا، کیوں کہ میرے خیال میں صورت حال اسی کی مقتضی تھی۔ میں محسوس کرتا تھا کہ معاملہ نہایت اہم اور نازک ہے، اتنا نازک کہ شاید ہی اس سے زیادہ کوئی نازک معاملہ ہمارے سامنے آیا ہو۔ ایک طرف مسلمانان عالم کے اعلیٰ مقاصد حیات اس سے وابستہ، دوسری طرف مسلمانوں کی آخری حکومت کی ہستی اور مستقبل اس سے دست و گریباں۔ اگر ذرا سی غلطی ہو جائے یا جوش و ہیجان میں ایک بات بے محل زبان سے نکل جائے تو بہت ممکن ہے اس کے نتائج سے کوئی مہلک اور لا علاج صورت حال پیدا ہو جائے۔ ہم ایک غلط بات کہہ کر واپس لے سکتے ہیں، لیکن عوام کی سائیکالوجی دوسری ہے۔ ہیجے در مارع اتباع کا ناطق ہے۔ ان کا دماغ ایک مرتبہ غلط یا صحیح اثر قبول کر لیتا ہے تو پھر مانگنے سے واپس نہیں دے دیتا

۹ ۔ اپریل کو پھر علی گڑھ گیا۔ جمعیت اور خلافت کمیٹی کی مشترک مجلس شوریٰ کی جانب سے ایک عرضداشت انگورہ بھیجی گئی۔ میری آرزو تھی کہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھے اور لوگ خاموشی اور صبر کے ساتھ نتائج کا انتظار کریں۔ یہ بہ آسانی ممکن تھا اگر مسلمانوں میں حقیقتہً کوئی ذہنی و اجتماعی نظم موجود ہوتا اور کم سے کم طبقہ خواص میں قیادت امت کی ابتدائی قابلیت پیدا ہوگئی ہوتی کہ نازک اور اضطراب انگیز وقتوں میں کیوں کر اپنی زبانوں کی نگرانی کرنی چاہیئے ۔

افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ علی گڑھ کے اجتماع سے پہلے تیر کمان سے نکل چکے تھے اور اب واپس نہیں بلائے جاسکتے تھے !

دماغی ردِ فعل ادھر فیصلہ خلافت کی پہلی خبر رپیٹر ایجنسی نے بھیجی اور اتنی بات کان میں پڑ گئی کہ خلیفہ معزول اور خلافت موقوف۔ ادھر دماغی ردِ فعل (ری ایکشن) کی ایک طوفانی لہر سب کے دماغوں میں دوڑ گئی۔ جوش و ہیجان کے عالم میں سب کے دماغ سن اور سب کی زبانیں چھوٹ گئیں۔ اچھے سے اچھے دماغ نے بھی چار پانچ دن کا انتظار ایسے معاملے کے لئے ضروری نہ سمجھا جس سے صدیوں کے نتائج وابستہ ہیں۔ ہر شخص نے فوراً رائے قائم کی اور بے دھڑک اعلان بھی کر دیا۔ اگر صرف عوام کا یہ حال ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ان سے ایسے وقتوں میں یہی توقع ہو سکتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ خواص بھی اپنی دماغی حالت عوام سے بلند تر ثابت نہ کر سکے، بلکہ کہنا چاہیئے عوام کی بدحواسی وغیرہ دماغی کی رہنمائی انہی نے کی۔ جس طرح اب سے پہلے دنیا کی ہر خوبی انگورہ والوں میں سمٹ آئی تھی، اسی طرح ایک لمحہ کے اندر دنیا جہان کی برائیاں ان میں سمٹ آئیں۔ شاید ہی کوئی بے محل اور بد حواسانہ بات ایسی ہوگی، جو نہ کہی گئی ہو۔ لطف یہ ہے کہ اصلی صورت حال کے سمجھنے کی کسی نے پروا نہیں کی۔ خواص تک کا یہ حال ہوا کہ خلافت کے باب میں جو عامیانہ خیالات پھیلے ہوئے ہیں، انہی پر اپنی تمام تعبیرات شروع کر دیں۔ خلافت اسلامی کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ ٹرکی میں اس کا کیا حال تھا۔ قومی مجلس کے فیصلے نے جو کچھ تبدیلی پیدا کی ہے وہ کیا ہے اور اس سے اس کا مقصود کیا ہے؟ اگر مسلمانان ہند معترض اور

شاکی ہیں تو کیوں؟ اور صحیح اسلامی نقطۂ خیال سے فی الحقیقت کیا کیا امور قابل اعتراض ہیں؟ یہ سوالات جو مسئلہ کے اصلی اجزا ہیں، کسی کے سامنے نہ تھے۔ بس ایک مجہول، غیر معین، نا ملکوں التعبیر جوش تھا جو مصطفیٰ کمال پاشا اور اعیان انگورہ کے خلاف امڈ رہا تھا۔ کافر، بے دین، دشمن خلافت، یزید، چنگیزی، بدتر از ہلاکو وغیر ذالک من السب والشتم و نخز عبلات و ترہات، ظلمات بعضہا فوق بعض۔ جب ارباب فہم و دانش کا یہ حال تھا تو ظاہر ہے عوام کی چھوٹ زبانوں اور بے مہار قلموں کو پکڑنے والا کون تھا؟ عربی میں کہتے ہیں باپ طبلہ لے کر بیٹھ جائے تو بچوں کی شکایت فضول ہے کہ کیوں ناچتے ہو؟

اذا کان ربّ البیت بالطبل ضاربا

فلا تلم الا ولاد فیہ علی الرقص

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ابھی خلافت کمیٹی کا کیل بیہ مشکل بحر متوسط سے گزرا ہوگا کہ یہاں خلافت کا از سر نو انتظام بھی شروع ہو گیا۔ ازاں جملہ نئے نئے خلیفوں کا انتخاب اور ان کے کوائف (اوصاف و خصائص) پر طبع آزمائیاں بقیہ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ہم مسلمانان ہند نے پانچ سال سے قومی زندگی کی نئی کروٹ لی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے دماغی قوت اور قومی نظام کیلئے ایک آزمائش پیش آئی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم آزمائش میں فیل ہو گئے۔ گزشتہ دو ماہ نے ثابت کر دیا کہ ہم میں اب تک کوئی نظام و جمعیت نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہم میں نازک وقتوں کے لئے حالات پر قابو پانے والے دماغ مفقود ہیں۔

خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء اس وقت ہندوستان میں دو بڑی جمعیتیں قائم ہیں خلافت کمیٹی کا موضوع عمل مسئلہ خلافت ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس اہم اور نازک موقع پر ان جمعیتوں کی وجہ سے مسلمانوں کے افکار و اصوات میں کوئی تنظیم پیدا ہو سکا؟ گزشتہ ایک ماہ نے ثابت کر دیا ہے کہ جواب نفی میں ہے۔

لوگوں نے نہ تو خلافت کے اجتماع و اعلان کا انتظار کیا، نہ جمعیت کا۔ جس کے جی میں

جو آیا بے دھڑک اعلان کر دیا ، لیکن اگر با وجود ان جمعیتوں کے شور و شغب کے ہماری دماغی طوائف الملوکی اور فوضویت (انارکی) کا یہی حال ہے تو پھر ان جمعیتوں کی موجودگی سے کیوں ملک کو پریشان و مشغول کیا جاتا ہے ؛ فرض کرو مسلمانان ہند میں آج خلافت کیلئے کوئی نظام موجود نہ ہوتا اور یہ معاملہ پیش آ جاتا ۔ جب بھی خود رائی اور طوائف الملوکی ایسی ہی ہوتی جیسی اب ہے ۔ اس سے زیادہ کیا ہوتی ؟

قیادت امت کی آزمائش کار فرما دماغوں کیلئے نازک گھڑیاں روز نہیں آتیں ، لیکن جب آتی ہیں تو انہی میں اصلی آزمائش ہوتی ہے ۔ ایسی ہی ایک گھڑی تھی جب پہلے پہل انقلاب خلافت کی خبریں ہمارے دماغوں سے ٹکرائیں ۔ یہ اسی بات کی آزمائش کا وقت تھا کہ کہاں تک ہم میں قوت فعال پیدا ہوئی ہے ۔ کہاں تک ہم نے ایسے معاملات کو سوچنا ، سمجھنا اور ان کی نزاکتوں سے عہدہ برآ ہونا سیکھا ہے ؟ کہاں تک ہم میں یہ طاقت پیدا ہوئی ہے کہ دوستوں کی غلطی اور دشمنوں کی شماتت میں پھنس کر راہ عمل گم نہ کریں ؟ ضرورت تھی کہ ہم میں جو لوگ صاحب عمل تھے ، کامل تدبر و احتیاط سے کام لیتے ۔ دل اور زبان دونوں کی لگام کھینچے رہتے ۔ فوری تاثر ، ہیجانی جذبات ، انفعالی انفجار اور بدحواسانہ جلد بازی کی جگہ تدبر و دانشمندی اور ضبط فکر و اعتدال رائے کا سنجیدہ مظاہرہ کیا جاتا ۔ ایک ایسے اہم معاملہ پر طبع آزمائی کرنے میں اگر تھوڑی سی دیر ہو جائے تو کوئی قیامت ٹوٹ نہیں پڑتی لیکن جلد بازی اور بے تکانی سے خطرناک اور لاعلاج ٹھوکریں لگ سکتی ہیں ۔ فرانسیسی ضرب المثل ہے : "جو گولی چل چکی وہ آدھے راستے سے واپس نہیں آئے گی ۔ اگرچہ اس کے لئے تم کتنے ہی بلا وے بھیجو ۔" افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ گولی چل گئی اور آزمائش کے نتیجہ پر ہمارے لیے کوئی مبارکباد نہیں ہے :

عوام اور خواص عوام کے احساسات فکر و دماغ پر مبنی نہیں ہوتے ، جس میں فہم و مصلحت شناسی کی گنجائش ہو ۔ وہ تو جذبات و عواطف کی مخلوق ہیں مدد کرنے کی جگہ گر جاتے ہیں ۔ محبت و عقیدت پر آئیں گے تو پوجنے لگیں گے ،

بے میل ہوں گے۔ نفرت اپنے لگیں گے اعتدال اور میانہ روی اس مخلوق میں نہیں ہوتی۔
مشہور فرانسیسی کاتب وکٹر ہیوگو کے لفظوں میں یہ مخلوق آگ کی طرح بھڑکتی ہے۔ راکھ کی طرح
ڈھیر ہو جاتی ہے " یہ خواص اور قائدین امت کا کام ہے کہ اس کے نبض شناس ہوں
اور ہمیشہ اس کی لگام مضبوطی سے تھامے رہیں۔ اگر کوئی ایسی بات پیش آ جائے جس
سے عام جذبات میں ہیجان و انفجار کا اندیشہ ہو تو چاہیئے کہ پوری طرح حزم و احتیاط
سے کام لیں۔ ہر لفظ تول کر اور ہر خیال پیمانے میں ناپ کر زبان سے نکالیں۔ سب سے
بڑھ کر یہ کہ خود بدحواس نہ ہو جائیں۔ اگر وہ بدحواس ہو کر چیخ اٹھیں گے تو پھر عوام کے
لئے یہی رہ جائے گا کہ پاگل ہو کر کپڑے پھاڑنے لگیں!

ملکوں کا امن اور قوموں کی قسمت! ہماری زندگی میں روزمرہ چھوٹے چھوٹے
کاروباری معاملات پیش آتے رہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ جلد بازی اور بے صبری مضر
ہوتی ہے پھر کیا ایک ایسے معاملے میں جس سے ملکوں کا امن اور قوموں کی قسمت کی
گرہ بندھی ہوئی ہو، عیر؟ احتیاط کی ضرورت نہ تھی؟ ممکن ہے ہم جلد بازی میں کوئی سخت غلطی
کر بیٹھیں بہت ممکن ہے کوئی ایسی بات کہہ بیٹھیں جس پر بعد کو پشیمانی ہو اور سررشتۂ کار ہاتھ سے
نکل جائے۔

تخریب کیلئے مجنونانہ بے صبری | میں حیران ہوں، آخر لوگوں نے جو کچھ کیا اس سے ان کا
مقصود کیا تھا؟ محض بدحواسی اور مجہول اضطراب یا ذی ہوش دماغوں کے لئے کوئی
معین مقصد؟ اگر مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی آخری خود مختار حکومت کے ساتھ روابط و علائق
کا جو رشتہ قائم ہے، وہ بیک دفعہ پارہ پارہ ہو جائے اور آئندہ سے ترکی حکومت، مصطفےٰ کمال
پاشا اور اعیانِ انگورہ مسلمانوں کی نظروں میں محبوب ہونے کی جگہ مبغوض و مردود ہو جائیں تو
یہ شریفانہ اور مبارک کام جس طرح اس وقت کر سکتے تھے، اسی طرح چند دنوں کے بعد بھی کر
سکتے تھے۔ چار دن ٹھہر جاتے تو ان کا مقصد فوت نہ ہو جاتا۔ پھر اتنی جلدی اور گھبراہٹ

کیوں نہیں؟ ہم جب چاہیں ایک لمحہ کے اندر لوگوں کو مبغوض بنا دے سکتے ہیں لیکن پھر نصف صدی میں بھی محبوب نہیں بنا سکتے۔ مشکل جس قدر پیش آتی ہے، تعمیر میں، تخریب تو ایک سیکنڈ کا کام ہے، معاملہ افراد کا نہیں، لاکھوں کروڑوں افراد کے قلوب کا ہے۔ کچھ خدا ہی کی مرضی تھی کہ چند در چند اسباب فراہم ہو گئے اور اسلامی ارتباط و اجتماع کی ایک عمارت باوجود اعداء و مخالفین کی سرزنشوں کے کھڑی ہو گئی، لیکن یہ کیسی بدبختی کی بات ہے کہ ایک طرف مصلحت ناشناس اور غلط کار ترک، دوسری طرف تم، دونوں مل کر بے دریغ ڈھا رہے ہو۔ جو عمارت قرنوں میں نہیں بن سکتی اسے چند دنوں کے اندر ڈھا دینے میں تم بالکل بے باک ہو گئے! آخر اتنی بدحواسی اور خیرہ دماغی کیوں ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ترکوں نے غلطی کی، لیکن بتلاؤ۔

مرہم یا نشتر

اس سے پہلے وہاں کون سی تمام تر دانشمندیاں اور شریعت پروریاں ہو رہی تھیں؟ کون سے سرائے یلدز یا قصر چراغاں میں ابوبکرؓ بن ابی قحافہ اور عمرؓ بن الخطاب حکمران تھے؟ رضی اللہ عنہما پہلے وہاں عبدالحمید اور ابوالہدیٰ تھے، اب مصطفیٰ کمال اور سید بک ہیں۔ پہلے بھی نظام بگڑا ہوا تھا، مان لو کہ اب بھی بگڑا ہوا ہے۔ پہلے ایک طرح کا نقص تھا، اب دوسری طرح کا نقص سہی۔ کون نہیں جانتا کہ صدیوں سے مسلمان صرف غلطیوں اور گمراہیوں ہی کے لئے وقف ہیں۔ معہذا پہلے جو کچھ تھا، غفلت تھی اور جمود تھا جس کا نتیجہ بجز ہلاکت کے اور کچھ نہ تھا۔ اب یہ بہر حال بیداری ہے اور حرکت اور اگر راہ اصلاح و ترقی میں ٹھوکریں لگیں تو اس سے بہتر ہے کہ موت کا سکون ہو۔ پس وقت کا سوال یہ نہیں ہے کہ ترکوں نے غلطی کی یا نہیں کی؟ سوال یہ ہے کہ تم کس لیے ہو اصلاح کیلئے یا غلطی کو اور مہلک اور لاعلاج بنا دینے کے لئے؟ تم علاج کا مرہم ہو یا زخم کا نشتر؟ افسوس تم نے لمحوں کے اندر برسوں کا سرمایہ ضائع کر دیا۔ تم صرف چند وقتوں کے لئے اپنی زبانوں کی نگہبانی نہ کر سکے۔ تم اپنوں کے خلاف غیروں کے لئے آلہ کار بن گئے۔ تم نے اسلام و امت کیلئے وسیلہ خدمت ہونے کی جگہ پسند کیا کہ فتنہ عظیم ہو جاؤ۔ اگر اسلام شریعت اور خلافت کی محبت و حمایت کے یہی معنی ہیں تو میں بلا تامل کہوں گا خدا اس

شریعت پرستی سے مسلمانوں کو بچائیے (۱۴ مئی ۱۹۲۴ء)

(۴)

کارکن دماغوں کا فرض کہا جاتا ہے ہم کیا کریں خلافت کی موقوفی کی خبر پڑھ کر اپنے آپے میں نہیں رہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر قوم کے کارکن دماغوں کا بھی یہ حال ہو کہ محض ایک خبر سن کر ہوش وحواس کھو بیٹھیں تو پھر ان میں اور ہندوستانی ضرب المثل کے اس راہگیر میں کیا فرق ہے جو یہ سن کر بے تحاشا بھاگنے لگا ہے کہ اس کے کان چیل لے گئی؟ مانا کہ تم سے کہا گیا، خلافت موقوف کر دی گئی، لیکن سوال یہ نہیں کہ تم سے کیا کہا گیا، سوال یہ ہے کہ تمہیں کیا سمجھنا چاہیے؟ تمہیں غور کرنا تھا کہ اسلامی خلافت پوپ کے منصب کی طرح کسی الٰہی منصب کا نام نہیں، نہ کسی عبدالمجید خاں یا کسی خاص خاندان کا۔ آخر کیا چیز موقوف کر دی گئی ہے؟

خلافت اور نظامِ خلافت :۔ اصل یہ ہے کہ اس موقع پر مخالفین نے شماتت اور طعنہ زنی میں کوئی کمی نہیں کی اور ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتے تھے۔ کہا گیا کہ کل تک برطانیہ کو دشمن خلافت کہا جا رہا تھا اب اس کا کیا جواب ہے کہ خود ترکوں نے خلافت مٹا دی ہے کیا اب ان کے خلاف بھی خلافت ایجی ٹیٹرز اعلانِ جہاد کر دیں گے؟ بعض اینگلو انڈین اخبارات نے تو صراحت کے ساتھ خلافت ایجی ٹیشن کے لیڈروں کی طرف اشارہ بھی کیا کہ دیکھیں اب اس موقع پر ان کے وہ قواعد اور دعاوی کہاں تک کام دیتے ہیں، جو کل تک انگریزی حکومت کے خلاف استعمال کیے جاتے تھے۔ شماتت وعناد کی یہ ایسی ہی لغو اور بے معنی باتیں تھیں، جو ہمیشہ کہی جاتی ہیں۔

چاہیے تھا کہ ہم اپنی دانش وفہم کی باگ خود اپنے ہاتھوں میں رکھتے اور مخالفوں کی معاندانہ باتوں میں آکر بھڑک نہ اٹھتے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا۔ ایک طرف تو بے سوچے سمجھے خلافت کی موقوفی کا اعتراف کر لیا گیا، دوسری طرف مخالفوں پر اپنی سچائی اور بااصولی ثابت کرنے کے لئے اعیانِ انگورہ کو دشمنِ خلافت کہنا شروع کر دیا۔ اینگلو انڈین اخبارات نے شہ دی تھی کہ برطانیہ کی طرح اب ترکوں کے خلاف بھی صدا بلند کرنی چاہیے۔ اس کی یوں تعمیل کی گئی کہ

فوراً اعلان کر دیا گیا ہم ہر اس طاقت کے مخالف ہیں جو خلافت کے ڈھانے والی ہو۔ برطانیہ ہو یا مصطفیٰ کمال۔ گویا اس بارے میں دونوں کا معاملہ یکساں ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اعیان انگورہ کے کفر و اسلام کا بھی آخری فیصلہ کر دیا گیا۔ فتوے کی منطقی شکل یہ تھی کہ اسلام اور خلافت ایک ہی چیز ہیں۔ خلافت نہیں تو اسلام بھی نہیں۔ مصطفیٰ کمال وغیرہ خلافت کے دشمن ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کتنے صحیح اور فقیہانہ مقدمات ہیں اور کتنا صاف اور قطعی نتیجہ! اول تو خلافت اور اسلام ایک ہی چیز ہیں پھر اگر موجودہ اعیان انگورہ نے نظام حکومت کی اصلاح میں غلطی کی تو یہ مثل محاربین دولت کے خلافت کی دشمنی ہو گئی۔ ظلمات بعضہا فوق بعض۔ اگر اسلام کے مترادفات کی بے قید وسعت کا یہی حال رہا تو آج خلافت نفس اسلام ہو گئی، کل نہیں معلوم کیا چیز ہو گی۔ مشکل اب بھی ہے۔ لیکن پرسوں تک تو قطعاً ناممکن ہو جائے گا کہ کوئی فرد بشر دنیا میں مسلمان رہ سکے۔ سچ ہے ان اللہ لا ینزع العلم بعد ان اعطاکموہ انتزاعاً ولکن ینتزعہ منہم مع قبض العلماء بعلمہم فیبقی ناس جہال یستفتون فیفتون برایہم فیضلون ویضلون او کما قال (اخرجہ الشیخان)[۱]

کیسی بدبختی کی بات ہے کہ لوگ مخالفین کے معاندانہ پروپیگنڈا کے شکار ہو گئے۔ یہ کہنا کہ جس خلافت کی دشمنی اور مٹانے کا الزام کل تک برطانوی حکومت پر تھا وہ اب خود ترکوں کے ہاتھ مٹ گئی ہے اور اس لئے برطانیہ اور اعیان انگورہ دونوں ایک ہی صف میں آگئے ایک ایسی صریح کذب بیانی اور استدلال کی کھلی گمراہی ہے جو ہم میں سے ہر شخص کو خود بخود سمجھ لینی تھی، چہ جائیکہ اس سے کورانہ متاثر ہو جانا اور ہاں میں ہاں ملانے لگنا۔

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عطا کردہ علم کو یوں نہ اٹھائے گا، بلکہ عالموں کو اٹھائے گا اور علم بھی باقی نہ رہے گا جاہل باقی رہ جائیں گے۔ ان سے فتویٰ پوچھا جائے گا تو وہ علم کی بنا پر نہیں، بلکہ اپنی رائے سے فتویٰ دیں گے۔ پس خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

نفسِ خلافت اور نظامِ خلافت

دو چیزیں ہیں، دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ ایک معاملہ نفسِ خلافت کا ہے، ایک خلافت کے نظام۔ خلافت سے مقصود اسلامی حکومت ہے۔ نظام سے یہ مقصود ہے کہ اس حکومت کا ڈھنگ اور طور طریقہ کیا ہو؟ حکومت اچھے اور صحیح نظام پر بھی ہو سکتی ہے، غلط اور خراب نظام پر بھی ہو سکتی ہے۔ اگر صحیح نظام پر ہے تو اچھی قومی حکومت ہے، غلط نظام پر ہے تو قوم کا فرض ہے اس کی اصلاح کرے۔ یہ نہیں کہ خلافت دشمنوں اور لڑنے والوں کے حوالے کر دے۔ پہلا مسئلہ نفسِ حکومت اور اس کی حفاظت و بقا کا ہے۔ دوسرا اندرونی تنظیم و اصلاح کا۔

کل تک مسلمانانِ ہند برطانیہ سے جو کچھ مطالبہ کر رہے تھے، وہ خلافت کے نظام کا معاملہ نہ تھا، نفسِ خلافت کی حفاظت کا معاملہ تھا۔ برطانیہ نے خلافت کا نظام نہیں بدلا تھا، نہ ایک غیر قوم اور حکومت کو اس میں کچھ دخل ہو سکتا ہے۔ وہ تو خلافت یعنی ٹرکی کی حکومت، اس کی اراضی و مقبوضات اور اس کی خود مختاری سلب کرنا چاہتی تھی اور اس کے خلاف لڑ رہی تھی۔ اس کی کامیابی کا نتیجہ خلافت یعنی حکومت اسلامیہ کا خاتمہ تھا۔ پس مسلمانانِ ہند نے اس کی حفاظت کے لئے جد و جہد کی اور خدا کی حکمت نے مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں کو فتح و اقبال کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

لیکن اب جو مسئلہ پیش ہے وہ خلافت یعنی حکومت کے نظام کا مسئلہ ہے۔ سابق سے جو نظام چلا آتا تھا، وہ صحیح نہ تھا۔ اس کی اصلاح ناگزیر تھی۔ موجودہ برسرِ اقتدار جماعت نے اصلاح و تغیر کے لئے ایک خاص مسلک اختیار کیا ہے۔ اگر وہ غلط ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کا نظام صحیح نہیں ہے۔ ان تمام انسانوں کا، جن کا اس سے تعلق ہے، فرض ہے کہ اس کی اصلاح کی کوشش کریں، لیکن اس سے یہ بات کیوں کر نکلی کہ موجودہ اعیانِ حکومت مثل ان اعداء اور محاربین کے ہو گئے، جو اسلامی حکومت مٹا کر اس کی جگہ انگریزی یا فرانسیسی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں؟ کجا نفسِ حکومت کے سلب و نہب کی کوشش، کجا حفظِ حکومت کے بعد اس کے نظام کے

تعین و تشخص کی غلطی ؛ فنفایین ہذا من ذالک ؟

ترکی کی حکمران جماعت | میرا صحیح مطلب سمجھنے میں غلطی نہ کیجئے میں یہ نہیں کہہ رہا کہ جو کچھ اعیانِ انگورہ نے کیا ہے صحیح ہے۔ ابھی یہ مسئلہ درپیش ہی نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کیا نظامِ حکومت کے تقرر کی غلطی اور نفسِ حکومت سے محاربہ اور سعی استیلا دونوں ایک ہیں ؟ یا اتنا دونوں میں کوئی ادنیٰ وجہ مماثلت اور اشتراک کی ہے ؟ آج لوگ ترکی میں برسرِ حکومت ہیں، یہ وہی ہیں جنھوں نے اپنے زخموں کے خون سے خلافت از سرِ نو تعمیر کی۔ اگر اب اس کے نظام کے تعین میں ان سے غلطی ہو گئی ہے تو یہ ایک اندرونی اصلاح کا مسئلہ ہے۔ بلاشبہ ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں کسی کا پاس اور لحاظ نہ رکھنا چاہیئے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہونے چاہئیں کہ انھیں مثل محاربین حکومت کہنا شروع کر دیں۔ ایسا سمجھنا نادانی و جہالت کی انتہا ہوگی۔

اسلام کا حکم | اسلام نے اس بارے میں مسلمانوں کو وہی حکم دیا ہے جو دنیا میں ہر قوم کا قومی و وطنی احساس اور عمل ہے، یعنی دشمنوں اور غیروں کے مقابلے میں حفاظت و حمایت، اپنوں کے مقابلے میں سعی اصلاح۔ اگر حکومت کا نظام صحیح نہیں ہے اور اس پر غلط کار افراد کا قبضہ ہے تو اس کی اصلاح کے لیے حسبِ استطاعت کوشش کرو، لیکن اگر اس پر غیر حملہ کر دیں اور اس کی حفاظت کا سوال سامنے آ جائے تو خواہ وہ اچھے لوگوں کے ہاتھ میں ہو خواہ بُرے آدمیوں کے قبضہ میں، اس کی حفاظت کیلئے سربکف ہو جاؤ۔ ناقص و غیر صحیح النظام مگر اسلامی حکومت کا محفوظ رہنا اس سے بہتر ہے کہ اس کا خاتمہ ہو جائے۔ مسلمانانِ ہند نے ٹھیک ٹھیک یہی مسلک اختیار کیا۔ جب اس کی حفاظت خطرے میں تھی، حفاظت کے لئے سعی کی، اب اس کی اصلاح کا سامنا آ گیا ہے تو بہ قدرِ استطاعت اس میں کوشاں ہوں گے۔ ایسے صاف، بے داغ، سہل منطقی مسلک پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے ؛ کیوں مسلمان مضطرب الحال ہوں ؟ کیوں اپنے مسلک کی نسبت شبہ میں پڑیں ؟

ناکام سعی تفہیم | یہ بات نہیں کہ لوگوں کو سمجھنے اور غور کرنے کے بعد غور کرنے کیلئے تنبیہ

نہیں کی گئی۔ میری ہماء کا خلاصہ متعدد اخبارات میں چھپ چکا تھا۔ میں نے زبانی بھی بارہا کوشش کی کہ لوگ بے اعتدالی اور افراط و تفریط سے بچیں اور سنجیدگی کے ساتھ صورت حالات پر غور کریں۔ اولاً مسئلہ خلافت کی حقیقت اور موقوفی خلافت کے معاملے میں جو چند در چند پیچ پڑ گئے ہیں، انھیں سلجھا لیا جائے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہیجانی تاثرات کا دماغی بحران اس درجہ مستولی ہو گیا ہے کہ جوش اور غیظ و غضب کے سوا کوئی دماغی موثر کام نہیں دے سکتا۔ ہر دماغ کو سننے اور سمجھنے سے قطعاً انکار تھا۔

اس موقع پر میں نے جو دماغی حالت لوگوں کی دیکھی، وہ فی الحقیقت ایک عجیب حالت تھی۔ میں محسوس کرتا تھا کہ دماغی انفعالات نفسیہ کا ایک علمی مطالعہ کر رہا ہوں۔ اکثر لوگوں کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے کوئی عصبی المزاج آدمی سخت غصے میں آ جائے اور جب اس سے باتیں کی جائیں تو بے تکان گالیاں دینا شروع کر دے۔ اس سے پہلے لوگ مصطفےٰ کمال پاشا وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ اب اس کا رد فعل (ری ایکشن) شروع ہو گیا تھا، اس لئے کہ جب کبھی معاملہ پر سنجیدگی کے ساتھ کوئی بات کہی جاتی تو دماغ اس طرف تو متوجہ نہ ہوتا، فوراً مصطفےٰ کمال کے خلاف غیظ و غضب کا جوش امڈ آتا۔ بعض اوقات اس غضب میں دھمکیوں کی بھی آمیزش ہوتی اور یہ امتزاج اس عصبی حالت کو اور زیادہ بے معنی بنا دیتا۔ خواہ کچھ ہو ہم غصے، جوش اور محض جذبات کے ہیجان سے عملی دنیا کے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ غصے میں سب سے پہلی بات جو انسان بھول جاتا ہے، یہی ہے۔

دماغی مد و جزر: بہرحال مجھے معلوم تھا یہ دماغی بحران عارضی ہے۔ بہت جلد اس چڑھاؤ کا اتار شروع ہو جائے گا۔ پھر لوگ اپنے عقل و ہوش میں واپس آ کر معاملہ فہمی کی استعداد پیدا کر لیں گے اور عجب نہیں وہی کہنے لگیں جو اس وقت میں کہہ رہا ہوں۔ برسوں سے لوگوں کا یہی طرز عمل میرے ساتھ رہا ہے۔ پس میں نے خاموشی اختیار کی اور وقت کا منتظر رہا۔ مجھے اپنے بعض خطوط کے جواب کا بھی انتظار تھا، جو قسطنطنیہ کے احباب کو لکھے گئے۔

اب چند دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ بحران اترنا شروع ہوگیا ہے قریب ہے کہ فضا اپنی معمولی رفتار پر آجائے۔ چنانچہ اب "موقوفی خلافت" کو "نام نہاد موقوفی خلافت" سے تعبیر کیا جارہا ہے بعض اخبارات متاسف ہیں کہ ترکوں کو گالیاں دینے میں جلدی کی۔ بعضوں کو صاف صاف اقرار ہے کہ رائٹر ایجنسی کی تعبیرات صحیح نہ تھیں اور اصلیت ـــــ بہ ہر حال اس سے مختلف ہے جو سمجھ لی گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ حالات اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ اب طبیعتیں سکون پذیر ہونے لگی ہیں اور وقت آگیا ہے کہ لوگ جوش و ہیجان کی بجائے عقل و فہم سے کام لیں۔

تنقیح طلب مسائل | جوش و اضطراب اور غیظ و غضب کی نمائش جس قدر کی جا سکتی تھی، کی جا چکی۔ اب وقت آگیا ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ وقت کے مسائل پر غور و خوض کیا جائے اس سلسلے میں ضروری تھا کہ جو افکار میں نے ۲ مارچ کو ظاہر کیے تھے، لوگوں کے سامنے آجائیں۔ ۲ مارچ سے ۲ مئی تک کامل دو ماہ کا زمانہ گزر چکا ہے۔ لیکن حقیقت ابھی وہیں ہے جہاں ساٹھ دن پہلے تھی۔

اب اس کے بعد حسب ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ جس قدر موثوق اطلاعات اس وقت تک حاصل ہو چکی ہیں ان کی روشنی میں حکومت ترکیہ کے فیصلے کی حقیقت تاکہ یہ مسئلہ قطعی طور پر صاف ہو جائے کہ جو کچھ انگورہ کی قومی مجلس نے فیصلہ کیا ہے، کن لفظوں میں اسے صحیح طور پر تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ اسلامی خلافت کی حقیقت، اس کا نظام اور اس کے مقاصد کی تحقیق نیز اس مسئلے کی تحقیق کہ صدیوں سے جو اسلامی خلافت قائم تھی اس کی نوعیت کیا تھی اور ترکی کی حکومت میں جو سیاسی و اجتماعی تغیرات ہوئے۔ ان سے عثمانی خلافت کے منصب پر کیا کیا اثرات طاری ہوئے؟

۳۔ مسئلہ اصلاح امت اسلامیہ کی حقیقت، جس کی ایک اہم فرع حکومت اسلامیہ ہے۔ اس سلسلے میں اس کی تحقیق کہ موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانان عالم مختلف خود مختار

تیم خود مختار اور محکوم جماعتوں میں متفرق ہو گئے ہیں اور ہر جماعت و ملک کے ذمے اس کی وطنی
و مقامی آزادی و استقلال کا فریضہ عائد ہے۔ مرکزی خلافت کے قیام سے مقصود کس طرح
کی مرکزیت ہے اور عملی نقطۂ نظر سے اس کی صورت کیا ہے؟ نیز موجودہ حالات میں جس طرح
کا نظام خلافت مسلمانوں کے لئے موزوں و مناسب ہے، وہ کیا ہے اور اس کے مقاصد و
مطالب کیا ہیں۔

۴۔ مباحث مندرجہ صدر کی روشنی میں انگورہ کی قومی مجلس کے موجودہ فیصلۂ خلافت
پر نظر اور اس کی اسلامی طبیعت نیز ٹرکی کی موجودہ برسر اقتدار جماعت کی ذہنیت (مینٹلیٹی)
میں جو اختلاف ہے اور فعلاً جو مسائل ابرا لنزاع میں ان کی تحقیق و تنقیح۔

چونکہ یہ مطالب تفصیل طلب ہیں۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ متعدد نمبروں میں بحث
جاری ہے (۱۵ مئی ۱۹۲۴ء)

(۵)

صحیح معلومات کی ضرورت مقدم بات یہ ہے کہ موجودہ حکومت ترکیا، اس کی تجاویز،
قرارات اور اس کے اعمال کی نسبت صحیح اور بے کم و کاست معلومات ہمارے سامنے
موجود ہوں۔ جو کچھ وہاں ہوا ہے کیا ہے؟ کیسا ہے اور کتنا ہے؟ یہ ہمیں اس طرح صاف
صاف معلوم ہو جانا چاہیئے کہ کسی طرح کے ظن اور تخمین کی رنگ آمیزی نہ ہو۔

جو کچھ ہوا ہے۔ ظاہر ہے ایک دو دن کی پیداوار نہیں ہے۔ ان احوال و ظروف کا نتیجہ
ہے جو عرصے سے نشو و نما پا رہے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ پہلے اس کی تشریح کی جاتی۔ مثلاً
نوجوان ترکوں کی مختلف جماعتوں کا حال، موجودہ برسر اقتدار جماعت کی حقیقت، اس کی تعلیمی اور
اجتماعی نوعیت، اس کی تعلیمی و سیاسی ذہنیت کی تشریح، اصلاح معاشرت و حکومت کے
باب میں ان کا نقطۂ خیال اور اس بارے میں اس کے مقررہ اصول و قواعد، لیکن بالفعل میں ان
مطالب کو نہیں چھیڑتا۔ ان پر آئندہ نظر ڈالنے کا زیادہ موزوں موقع ملے گا۔ سر دست صرف تاریخ

کے فیصلے اور اس کے قرب وجوار کے بعض حوادث کو اس طرح نقل کر دیتا ہوں کہ وہاں جو کچھ ہوا ہے، ٹھیک ٹھیک سامنے آجائے۔

یہ بیان ترکی اور عربی اخبارات کے علاوہ ان مکاتیب سے بھی ماخوذ ہے، جو وہاں کے بعض احباب نے لکھے ہیں۔ یہ پیش نظر رہے کہ یہ مکاتیب ان لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جن میں بجز ایک کے اور سب برسر اقتدار جماعت کے مخالف ہیں۔

خلق فرقہ سی اور مسئلہ خلافت اس وقت جس جماعت کی قومی مجلس انگورہ میں اکثریت ہے وہ "خلق فرقہ سی" کے نام سے مشہور ہیں جو "پیپلز پارٹی" کا ترجمہ ہے یعنی عوام الناس کی جماعت۔ اس جماعت کا خیال یہ ہے کہ صدیوں سے "خلیفہ" کا منصب شخصی استبداد و جبروت، حاکمیت مطلقہ وغیرہ مسئولیت اور ذاتی تقدیس و اجلال کا مقام بن گیا ہے۔ اس کی شخصیت ہر طرح کا حکم و اختیار رکھتی ہے۔ اس کی ذات قدرت و حکومت ہے۔ وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں۔ سب اس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ وہ اعتراض و انکار کی سطح سے بالاتر ہے اس کے حقوق پیدائشی اور نسلی ہیں، جو اس کا مرتبہ گھٹاتا ہے، وہ ایک مقدس حق کے ساتھ گستاخی کرتا ہے یہی بالاتر از انسانیت اوصاف ہیں جو قدیم شاہی و شہنشاہی کے لوازم تھے لیکن اب خلیفہ کا منصب بھی انہی سے متصف ہوگیا ہے، بلکہ ان سے بھی زیادہ مقدس حقوق رکھتا ہے کیوں کہ اس میں مستبدانہ حکمرانی کے ساتھ ایک طرح کی پاپائی (پوپ ڈم) کا روحانی عنصر بھی شامل ہوگیا ہے۔ اس منصب کو اب کتنا ہی گھٹایا جائے لیکن یہ ایک بادشاہ کی مقدس اور غیر مسئول جگہ سے نیچے نہیں اتر سکتا۔

وہ کہتے ہیں کہ ترکی حکومت کی تباہی کا اصلی باعث یہی شخصی اقتدار ہوا۔ یورپ کی بیداری کے ترکی کے لئے بھی بیداری و ترقی کی راہیں کھلی تھیں، لیکن یہی تخت استبداد و جبروت ہے جو اس میں ترقی میں حائل ہوگیا۔ تعلیم، اصلاح، مساوات، حریت سب کی راہیں بند ہوگئیں خواہ کچھ ہو اب کہ ساری ہلاکتوں اور بربادیوں کے بعد قوم نے کامل آزادی حاصل کرلی ہے،

جمہوری دورِ حکومت کے ساتھ یہ تخت سلطانی قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر رکھا جائے گا تو ہر وقت اصلاح و آزادی خطرہ میں رہے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کامل آزادی و اصلاح وجود پذیر ہی نہ ہوگی وہ کہتے ہیں اس منصب کو دستوری قوانین کے ساتھ مقید کرنا بے فائدہ ہے جن جن ملکوں میں جمہوری یا مشروط حکومتیں قائم ہوئیں وہاں ابتدا میں شاہی تاج و تخت کے ساتھ پوری رواداری برتی گئی، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ یہ نکلا کہ سلاطین اور ان کے متعلقین کا حلقہ (. . . . .) اس رواداری پر قانع نہیں ہوا۔ برابر سازشیں جاری رہیں اور بالآخر ملک کو ایک آخری خونریز انقلاب سے گزرنا پڑا۔

خلیفہ کا ذاتی اقتدار | یورپ کے تاج و تخت محض روایتی اور نسلی حقوق پر قائم تھے لیکن اس منصب میں دینی و روحانی جبروت و تقدیس کا نمایاں عنصر بھی شامل ہو گیا، یعنی عوام سمجھتے ہیں کہ خلیفہ کو شریعت نے ذاتی اقتدار حکومت و تصرف کا بخش دیا ہے بالفعل یا بالشارہ یحکم ما یرید۔ اس لئے یہ منصب عام شاہی مناصب سے کہیں زیادہ خطرناک ہے اگر اسے مقید و مشروط طور پر رہنے دیا جائے گا تو لوگ اس پر قانع نہ ہوں گے۔ ہمیشہ یہ بات دلوں میں کھٹکتی رہے گی کہ خلیفہ بے اختیار کر دیا گیا، پھر جب کبھی موقع ملے گا حکومت کے خلاف سازشوں کا بازار گرم ہو جائے گا۔

مدحت پاشا اور مصطفےٰ فاضل کی تخم ریزی تیس برس کے بعد بار آور ہوئی اور جولائی ۱۹۰۸ء کا ترکی انقلاب ظہور میں آیا، لیکن وہ بھی اس مقدس تاج و تخت کے حقوق کو چھونے کی جرأت نہ کر سکا۔ دستور اساسی میں پانچویں دفعہ رکھنی پڑی جو اس کا اعتراف کرتی ہے کہ "ذات حضرت سلطانی مقدس اور غیر مسئول ہے"

فرانس کے لوئس چہاردہم نے کہا تھا کہ "گورنمنٹ میں ہوں" عام مسلمانوں کا بھی یہی خیال ہے کہ خلافت خلیفہ کی ذات ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم ایک ہزار برس سے زیادہ کا روایتی اثر کروڑوں دلوں پر سے مٹا نہیں دے سکتے۔

ترکی کے خلفاء: اس سلسلے میں ترکی کے سابق خلفاء اور ان کے مفسدانہ اعمال کی قطار

سامنے ماتی ہے اور وہ غیض و غضب اور نفرت کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ سلطان محمود مصلح کی سست رفتاری، عبدالمجید کا تذبذب، عبدالعزیز کا اسراف، عبدالحمید کی اصلاح دشمنی اور وحیدالدین کی خیانت یاد دلاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے ان کی بدولت سب کچھ کھو دیا۔ اب اب جو کچھ باقی رہ گیا، وہ ہمارے آخری قطرۂ خون سے خریدا گیا ہے، ہم اسے خلیفہ کے زرین تاج و تخت پر نثار نہیں کر سکتے۔

وہ عثمانی خاندان کی طرف سے نہایت مایوس اور سرد دل رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس خاندان کا تباہ کن بوجھ اب ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ اس میں کبھی محمد فاتح اور سلیمان صاحبقران پیدا ہوتے تھے، مگر اب صرف عبدالحمید اور وحیدالدین ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ترکی قوم نے چھ صدیوں تک اپنا خون بہا کر جو عظیم الشان مملکت قائم کی تھی وہ محض اس خاندان کی خود پرستیوں کی وجہ سے پارہ پارہ ہو گئی۔ شاہی خون ہمیشہ چند نسلوں کے بعد بگڑ جاتا ہے۔ اس خاندان سے بھی اب صلاحیت مفقود ہو گئی ہے۔ اس میں تاریخ کے صفحات کیلئے داستان عظمت ہے، مگر قوم کیلئے کوئی برکت نہیں۔

دینی اقتدار اور ترقی و تقدم ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو اس مسئلے کو ایک دوسری ہی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ترکی حکومت کی اصلاح و ترقی کی راہ میں قدامت پسند اور جامد علما و مشائخ کا وجود اول دن سے مانع عظیم رہا۔ وہ ہمیشہ اصلاح، انتظام، تعلیم، حریت اور ہر طرح کے تقدم کے خلاف مذہب کا نام استعمال کرتے رہے۔ سب کو معلوم ہے کہ سلطان عبدالحمید کے ہاتھ میں اصلاح کے خلاف سب سے بڑا بے پناہ حربہ علما و مشائخ کی تعلیمات تھیں۔ شیخ ابوالہدیٰ رفاعی، احمد اسعد مدنی، سید فضل مکی، شیخ ظافر مغربی وغیرہم جیسے مشائخ ملیدز ہمیشہ سلطان کو تلقین کرتے رہتے کہ وہ اسلام کا حکمران مطلق اور پیغمبر اسلام کا نائب ہے اور اس کا دینی فرض یہی ہے کہ تمام طالبین اصلاح کو باسفورس میں غرق کرتا رہے۔ پس اگر اب قوم چاہتی ہے کہ خرافات و خیالات کی حکمرانی سے پوری طرح نجات حاصل کرے

اور راہ ترقی تمام رکاوٹوں سے پاک صاف ہو جائے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس طرح کا
بے بنیاد مذہبی اقتدار ہمیشہ کیلئے ختم کردیا جائے خلیفہ کا مقام اگر قائم رکھا جائے گا تو اس
طرح کے مذہبی اقتدار کا مرکز بن جائے گا اور علما و مشائخ اس کے گرد حلقہ باندھ لیں گے۔

عالمگیر خلافت اور یورپ | ایک دوسرا سیاسی خیال بھی ان خیالات کی تہ میں موجود ہے وہ
کہتے ہیں ترکی قوم اور ترکی حکومت کے خلاف جو تعصب و عناد یورپ میں صدیوں سے
چلا آتا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ ترکی حکومت تمام مسلمانان عالم ایک بین الاقوامی
مذہبی مرکز سمجھی جاتی ہے۔ یورپ خیال کرتا ہے کہ یہ یورپ اور مسیحیت کے خلاف ایک دائمی
چیلنج ہے۔ اگر اب ترکی حکومت اپنی تمام ہمت صرف داخلی اصلاح و ترقی کے لئے وقف کردے
اور بیرونی اسلامی تعلقات زیادہ نمایاں نہ رہیں تو یورپ کا بھی سیاسی تعصب کم ہو جائے گا
اور ترکوں کو ترقی و استحکام کی مہلت مل جائے گی۔

نقطۂ خیال کی بنیادی غلطی | یہ مختصراً اس نقطۂ خیال کی تشریح ہے جو یہ جماعت خلیفہ
کے منصب کے باب میں رکھتی ہے۔ یہ خیالات جن مقدمات پر مبنی ہیں دراصل وہی سرے
سے غلط ہیں اور یہی نقطہ ہے جہاں بنیاد کی اینٹ ٹیڑھی ہوگئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ صدیوں
سے خلیفہ کا منصب شخصی حکمرانی اور غیر مسئولیت کا بت بن گیا ہے۔ ابتدا کے تیس
برس اور عمرؓ بن عبدالعزیز کے دو تین سال کے سوا اسلامی حکمرانی کی پوری تاریخ شخصی حکمرانی
کی تاریخ ہے۔ لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ خلیفہ کا منصب موقوف کردیا جائے، علاج یہ ہے
کہ صحیح اسلامی خلیفہ پیدا کیا جائے۔ اسلامی خلیفہ کی موجودگی قومی آزادی اور جمہوریت کے
منافی نہیں، بلکہ سچی جمہوریت کی روح اسی منصب و مقام میں مضمر ہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا

فصل حکومت و خلافت | چونکہ خلافت کے باب میں اس جماعت کے سامنے کوئی
صحیح اور روشن مسلک موجود نہ تھا، مضطرب خیالات و نظریات تھے اس لئے پیچھے بعد دیگرے
جس قدر قدم اٹھے وہ نہ صرف غلط پڑے بلکہ باہم دگر مخالف و متضاد بھی واقع ہوئے۔

لوزانیہ کانفرنس کے بعد جب قسطنطنیہ پر نئی قومی حکومت کا قبضہ ہوا تو اس نے "فصل حکومت و خلافت" کا اعلان کیا، جسے دنیوی اقتدار اور خلافت کے فصل سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی سلطنت و خلافت دو الگ چیزیں ہیں، ایک محل میں اکٹھی نہیں ہونی چاہئیں پس آئندہ سے خلافت کا منصب الگ رہے گا۔ اسے حکومت میں کوئی دخل نہ ہوگا۔ اسی طرح ترکی حکومت بھی الگ رہے گی۔ وہ خلافت میں دخیل نہ ہوگی۔

اس کے بعد قومی مجلس نے فیصلہ کیا کہ اب کامل نظام جمہوریت کا اعلان کر دیا جائے چنانچہ اس کا اعلان ہوا۔ پھر بیک وقت دو منصب الگ الگ قرار دیے گئے۔ ایک صدر جمہوریت کا ایک خلیفہ کا۔ صدر غازی مصطفےٰ کمال پاشا منتخب ہوئے، خلیفہ عبدالمجید خان تھے

پہلی غلطی دراصل یہی وہ پہلی غلطی ہے جو معاملۂ خلافت میں اس جماعت نے کی اور آگے چل کر جس قدر الجھاؤ پڑے، سب اسی کے برگ و بار ہیں۔ اسلامی خلافت حکومت ہی کا نام ہے اور ایک خاص طرح کے نظام و مقصد کی بنا پر اسے "خلافت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اصلی نظام خلافت ایسا تھا جیسا آجکل کی جمہوری حکومتوں کا نظام ہوتا ہے، الا یہ کہ یورپ اور امریکہ کی جمہوری حکومتوں سے کہیں زیادہ جمہوریت کی کامل روح اس میں موجود تھی۔ پس جس منصب کے لیے آج کل "پریزیڈنٹ" کا لفظ بولا جاتا ہے اسی کے لیے پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں نے خلیفہ، امیر اور امام کا لقب اختیار کیا تھا۔ بعد کو ایشیائی استبداد اور افریقی استعباد کے اثرات سے اس منصب نے بھی شہنشاہی کی صورت اختیار کرلی۔ پس اصلاح کی صحیح صورت یہ تھی کہ شاہی خلیفہ کی جگہ اسلامی خلیفہ کے منصب کی تجدید کی جاتی اور اس کی جگہ وہی ہوتا جو جمہوریت کے پریزیڈنٹ کی ہوتی ہے نہ کہ پریزیڈنٹ کا منصب قائم کر کے ایک الگ منصب خلافت کا بنا دیا جس کی نہ تو اسلام میں کوئی اصلیت ہے اور نہ فعلاً کوئی عملی مقام رکھتا ہے۔

چرچ اور اسٹیٹ اس تفریق حکومت و خلافت کے فیصلے سے گویا انھوں نے اس مخلوط اور معاوضہ کا معاملہ ختم کر دینا چاہا ہے جو خلیفہ کی شخصیت اور اس کا روحانی تقدیس

قومی حکومت و جمہوریت کے خلاف کر سکتا تھا۔ نیز ان کے خیال میں ملکی ریاست کی یکجائی سے جو خلل پیدا ہوتا تھا۔ اس کا بھی علاج ہو گیا۔

عجب نہیں اس کی تہ میں غلط قیاس بھی کام کر رہا ہو کہ مسیحیت کی طرح مسلمانوں کی اصلاح کیلئے بھی ٹمپرل پاور (دنیاوی اقتدار) اور سپرچول پاور (روحانی اقتدار) کی علیحدگی ضروری ہے، یعنی چرچ اور اسٹیٹ کی۔ اسلامی خلافت کو پوپ اور کلیسا کے اقتدار پر قیاس کیا ہو اور سلطنت کو اسٹیٹ پر۔ یورپ میں انسانی آزادی اور تمدنی ترقی اس وقت تک ظہور میں نہ آسکی جس وقت تک لوتھر کی تحریک نے کلیسا کے تسلط سے قوموں اور حکومتوں کی آزادی نہیں کرا لیا۔ ممکن ہے انھوں نے قیاس کیا ہو، ہمارے لئے بھی اس مرحلہ سے گزرنا ضروری ہے حالانکہ اس بارے میں اسلام کا نظام مسیحیت سے نہ صرف مختلف ہے، بلکہ قطعاً متضاد ہے۔ اسلام میں پوپ اور کلیسا کی طرح روحانی اقتدار کی کوئی جگہ نہیں۔ نہ اس طرح کا کوئی دینی اقتدار ہے، جو انسانی آزادی اور علم و تمدن کا مخالف ہو اور اس طرح کے اقتدار کو تو وہ ایک بہت بڑی انسانی معصیت اور شرک باللہ قرار دیتا ہے۔ اتخذوا احبارہم ورہبانہم ارباباً من دون اللہ۔ البتہ جو چیز مسلمانوں کی اصلاح میں حارج ہے، وہ مذہب کا غلط اور جاہلانہ استعمال ہے جس کی وجہ سے اسلام کی روح آزادی، وسعت پذیری، متحرک، متقدم اور موافق احوال و ظروف کی خصوصیت یک قلم مٹ گئی۔ اسی چیز کو راہ سے ہٹانا چاہئے مگر یہ ہٹ نہیں سکتا، جب تک صحیح خلافت قائم نہ ہو اور مسلمانوں کی دینی، اجتماعی اور تعلیمی اصلاح و تجدید کا باب مسدود ہو، از سر نو نہ کھلے۔ لیکن ساری بدبختی یہی ہے کہ اسی دروازے کا قفل نہیں ٹوٹتا۔ (۵ جون سنہ ۱۹۲۲ء)

(۶)

تفریق کی تائید میں توجیہات لیکن جہاں تک اس جماعت کے سربرآوردہ ارکان کی تصریحات کا تعلق ہے اس تفریق کی تائید میں یہ بات صاف صاف کبھی نہیں کہی گئی۔

صرف اتنا کہا گیا کہ اب ملکداری کی دینی اقتدار سے الگ رکھنا چاہیئے۔ ایک رسالہ بعض ترک علماء نے اس کی تائید میں حکومت کے ایما سے لکھا تھا۔ اب اس کا عربی ترجمہ بھی قاہرہ کے ایک ترک اہل قلم عبدالغنی سنی بک نے شائع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ معاملے کو ایک دوسری ہی وادی میں لے جاتا ہے اور خلافت و سلطنت کی تفریق کو حقوق کی "تقلید" سے تعبیر کرتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اوائل اسلام میں خلافت کا نظام مشورت اور عدالت و مساوات پر مبنی تھا۔ بعد کو شخصی اور مستبدانہ حکومت قائم ہو گئی۔ عدل و دیانت کی جگہ ظلم و خیانت نے لے لی۔ یہ خلافت حقیقی خلافت نہ تھی، محض جابرانہ حکومت تھی، جسے فقہاء و متکلمین نے خلافت ناقصہ یا خلافت صوریہ سے تعبیر کیا ہے۔ اب چونکہ خلفاء راشدین کے سے اشخاص ناپید ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ حکومت کے تمام اختیارات امت اور اہل حل وعقد کے ہاتھ میں رہیں اور منصب خلافت شروط و حدود کے ساتھ مقید کر دیا جائے۔ ایسی تقلید کسی طرح بھی احکام شرع کے خلاف نہیں کہی جا سکتی۔ پھر اس مزعومہ تقلید کو یکایک "تفریق السلطنۃ عن الخلافۃ" سے تعبیر کرتا ہے اور اس کے لئے گئے ہیں کہ سلطنت اختیارات خلیفہ سے لیکر اس کی مطلق العنانی مقید اور محدود کر دی گئی ہے۔

حقیقت حال حالانکہ کجا خلیفہ کی مطلق العنانی کو شرطوں اور حدود کے ساتھ مقید کر دینا اور کجا سلطنت اور خلافت کی تفریق، بینہما مفاوز تنقطع فیہا اعناق المطی! اگر مقصود صرف خلیفہ کی بے قیدی اور شخصی مطلق العنانی کو مقید کر دینا ہے تو یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ضرور اسے مقید ہونا چاہیے، لیکن یہ خلیفہ کے اختیارات کی تحدید و تقیید ہے، خلافت اور سلطنت کی تفریق نہیں ہے۔ پھر یہ کیسا غلط مبحث ہے کہ خلفائے راشدین کی نظیر عام خلفا کے استبداد و مظالم کے خلاف پیش کی جاتی ہے، لیکن بجائے اس کے کہ اس نظیر کے مطابق اب مشورت اور عدالت و مساوات پر خلافت کا نظام متعین کیا جائے، سلطنت سے خلافت کو الگ کر کے ایک بے معنی و بے حقیقت سا منصب اسلام میں ایجاد کیا جاتا ہے؟

باقی رہا یہ خیال کہ اب خلفائے راشدین جیسے آدمی ناپید ہیں۔ اس لئے ویسی خلافت قائم نہیں ہو سکتی تو یہ بھی صحیح ہے بلاشبہ ایسے افراد ناپید ہیں لیکن نظام موجود ہے کچھ ضروری نہیں کہ جس وجہ دخل اس وقت ان کی ذاتی اور انفرادی قابلیت اور دیانت کو تھا، اس قدر اب بھی خلفا کا دخل باقی ہے۔ جمہوری نظام حکومت قائم کر کے خلفاء کے اختیارات بالکل محدود و منضبط کر دیے جا سکتے ہیں اور حکومت و امت خلفاء کے ذاتی استبداد سے محفوظ ہو جا سکتی ہے۔

مقدمات استدلال کی غلطیاں | بعض ترکی اخبارات نے اس کی تائید میں ایک دوسری بات کہی۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اوائل اسلام میں تمام مناصب ایک ہی وجود میں جمع تھے خلیفہ حکومت کا بھی رئیس تھا اور دین و شرع کے نفاذ و نگرانی کا بھی مرکز تھا۔ بعد ایسے لوگ آئے جن میں جامعیت نہ تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ اب چونکہ خلافت راشدہ جیسی خلافت قائم نہیں کی جا سکتی، اس لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ خلیفہ کا مقام الگ کر دیا جائے۔ حکومت الگ ہو اور ہر جز اپنی اپنی جگہ صحت و کمال کے ساتھ کام کرے۔

لیکن اس استدلال کے مقدمات میں بھی چند در چند غلطیاں ہیں، جو محتاج بیان نہیں۔ اسلامی حکومتوں کے مفاسد کا اصلی باعث یہ امر نہ تھا کہ مناصب ایک وجود میں جمع تھے حکومت سے الگ تو دینی ریاست کا کوئی منصب اسلام میں ہے ہی نہیں۔ مفاسد کا اصلی باعث یہ تھا کہ اسلامی خلافت کی جگہ (جس کا بنیاد کامل جمہوریت (ڈیموکریسی) پر رکھی گئی تھی)، ایشیائی پادشاہی اور افریقی فرعونیت قائم ہو گئی اور دین میں نظر و فکر اور اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ آج اگر یہ دو فساد دور ہو جائیں تو مسلمانوں کے تمام دماغی و عملی مفاسد دور ہو جا سکتے ہیں اور ایک ایسی بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ حکومت اور ہیئت اجتماعیہ قائم ہو جا سکتی ہے جو دینی و دنیوی دونوں کے محاسن پر مشتمل ہو اور مدینہ فاضلہ و عالیہ کے قدیم حکیمانہ خواب کی کامل تعبیر

دنیا کے آگے پیش کر دے۔

یہ بات بھی اس کی تائید میں کہی گئی کہ ترکی کی حکومت صرف ترکیا کے لیے، لیکن خلیفہ تمام مسلمانوں کے لیے، پس چاہیے اس کا مقام ترکی حکومت سے الگ ہو، جس طرح دنیا میں مختلف اسلامی حکومتیں الگ الگ موجود ہیں، اسی طرح ترکی کی حکومت بھی ہے۔ خلیفہ اگر صرف ترکی حکومت کا نہیں، تمام مسلمانوں کا ہے تو کیوں ترکی حکومت کا ملکی حکمران یا صدر ہو؟ اسے تو ملکی حکومتوں کی سطح سے ایک بلند تر مقام ملنا چاہیے اگر وہ ایسا نہ ہوگا تو اس کے منصب کی وسعت محدود ہو جائے گی اور اس کے احکام و اعمال ہمیشہ ترکی سیاست کی طرف منسوب کئے جائیں گے غیر حکومتیں اعتراض کریں گی کہ ترکی حکومت کو اپنے رقبہ سے باہر کے معاملات سے کیا دخل؟

لیکن یہ بھی محض ایک دل خوش کن توجیہہ تھی اور قطع نظر اس کے کہ موجودہ حالات میں عالمگیر اسلامی خلافت سے مقصود کیا ہے؟ عملاً بھی کسی ایسی خلافت کا قیام و نفاذ چند در چند موانع و مشکلات کے باعث تقریباً ناممکن ہے جیسا کہ اب خود یہی جماعت اپنے جدید فیصلہ کی تائید میں کہہ رہی ہے۔

جدید منصب خلافت کی عملی صورت | یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سلطنت اور خلافت کی تفریق کی تائید میں یہ جس قدر توجیہات کی جا رہی تھیں اور وظائف و اعمال کی تقسیم کے رنگ میں اسے دکھلایا جا رہا تھا، محض کاغذی نمائش تھی۔ عملی طور پر کسی ایسی تقسیم کا وجود نہ تھا اور نہ وجود میں آ سکتی تھی۔ یورپ سے جب سلطنت علیحدہ کر لی گئی تو پھر بھی اس کے لئے کاروبار کے بہت سے صیغے باقی رہ گئے، مثلاً گناہوں کی معافی، پروانہ ہائے نجات کی تقسیم احکام شرع میں ترمیم و تنسیخ، رومن کیتھولک چرچ کی پادشاہت۔ کلیسائی اعمال اور جمعیات کی نگرانی وغیرہ لیکن اس نئے منصب پر متمکن ہو کر خلیفہ عبدالمجید خاں کیلئے کوئی کام باقی نہیں رہا تھا گناہوں کی معافی اور جنت و دوزخ کی تقسیم کا کاروبار تو یہاں ہے ہی نہیں،

البتہ دینی احکام واعمال کے بہت سے صیغے اور انکے نفاذ و اجرا کی بہت سی صورتیں ہو سکتی تھیں، لیکن جہاں تک یہ انتظامات بالفعل حکومت کے اندر موجود تھے سب کے سب حکومت کے تابع تھے اور حکومت سے الگ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ پہلے ان کی رسمی نگرانی شیخ الاسلام کے متعلق تھی اب شخصیت اسلامیہ کی جگہ امور دینیہ کی وزارت قائم ہو گئی تھی۔

پس فی الحقیقت عملی طور پر وظائف واعمال کی تقسیم کا کوئی وجود نہ تھا۔ خلیفہ قطعی بے کار تھا۔ وہ قسطنطینہ کے ایک قصر میں رہتا تھا۔ دس ہزار پونڈ کا وظیفہ تھا اور اگر کوئی مشغولیت تھی تو صرف یہ کہ جمعہ کے دن جلوس سلاطین کے ساتھ ادائے نماز کے لئے مسجد چلا جائے گویا یہ خلافت محض نام اور تنخواہ کی خلافت تھی جس کو دس ہزار پاؤنڈ ملیں اور جمعہ کے دن سلاطین کے ساتھ نکلنے وہی خلیفہ ہے۔

غلط تقسیم مناصب | یاد رہے کہ یہ نتیجہ اس بات کا نہ تھا کہ خلیفہ کے اختیارات چھین لئے گئے تھے۔ مشغولیت کیلئے اختیارات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کام کی ضرورت ہوتی ہے اختیارات تو جمہوریت کے پریزیڈنٹ کے بھی زیادہ سے زیادہ مقید ہوتے ہیں مگر بے کار نہیں رہتا۔ یہ دراصل نتیجہ اس غلط تقسیم مناصب کا تھا یعنی سلطنت اور خلافت کی علیحدگی کا۔ چونکہ سلطنت کی علیحدگی کے بعد کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جسے ایک خاص دینی منصب سے تعبیر کیا جائے اس لئے قدرتی طور پر اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا کہ دینی و دنیوی جس قدر بھی اشغال تھے حکومت کے حصے میں آگئے، مزید بر خود ساختہ خلیفہ کے لئے بجز اسم و رسم کے کوئی کام باقی نہ رہا۔ البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ آئندہ اس پر غور کیا جائے گا، مقام خلافت کے زیر نگرانی مسلمانان عالم کی دینی و اخلاقی ترقیات کے لئے مختلف انسٹی ٹیوشنز (ادارے) قائم کیے جائیں اور اسی لئے ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کا بھی اعلان کیا گیا تھا

مجوزہ اسلامی کانفرنس | اس کانفرنس کا اعلان غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے خود کیا تھا۔ پھر خلیفہ عبدالمجید خان کی جانب سے ایک بیان شائع کیا گیا۔ یہ تجویز بھی ایک عجیب طرح کی

تجویز تھی، ہر شخص اور ہر جماعت اپنے اپنے ذوق اور خواہش کے مطابق اس سے امیدیں لگائے ہوئے تھی، لیکن میرے بہت سے دوستوں کو یاد ہوگا کہ گذشتہ سال جب کانفرنس کیلئے ہندوستانی مندوبین انتخاب کا نا کرہ چھیڑتے تو میں صاف کہہ دیتا تھا کہ مجھے اس کانفرنس کے انعقاد ہی میں شک ہے، مندوبین کے انتخاب کا مسئلہ ابھی کہاں؟ اصل یہ ہے کہ تجویز واقعیت سے خالی نہ تھی۔ اعیانِ انگورہ نے واقعی ارادہ کیا تھا کہ ایک ایسی کانفرنس ہو اور خلیفہ کا جو نیا مقام بنایا گیا ہے اسکے ماتحت عام اسلامی اغراض کیلئے ایسا انسٹی ٹیوشن قائم کئے جائیں، جن سے مسلمانانِ عالم کے روابط بھی ٹرکی کے ساتھ قوی ہوں اور اصلاح و ترقی کے نتائج بھی پیدا ہوں، لیکن بعد کو جب خیالات میں انقلاب ہوا تو انھوں نے محسوس کیا کہ جب کبھی ایسی کانفرنس کی جائے گی وہ خلیفہ کے اختیارات کا مسئلہ چھیڑ دے گی اور عجب نہیں ایک نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔ ساتھ ہی اس طرح کا بین الاقوامی اسلامی اجتماع ان کے اس پروگرام کی سپرٹ کے بھی خلاف تھا جس کا منشا یہ ہے کہ موجودہ حکومت صرف اندرونی اصلاح و ترقی میں مشغول رہے۔ اپنے تئیں مسلمانانِ عالم کے ساتھ زیادہ مشغول نہ دکھلائے۔ پس حالات نے دوسری ہی شکل اختیار کرلی اور کانفرنس کا خواب بہت جلد فراموش کر دیا گیا۔

اعیانِ انگورہ کا عارضی اطمینان] بہر حال اس جماعت کا خیال تھا۔ اس انتظام کے بعد انھوں نے دونوں پہلو سنبھال لئے ہیں۔ ایک طرف تو حکومت خلافت سے الگ ہو گئی اور اس بات کا کوئی کھٹکا نہ رہا کہ خلیفہ کا شخصی استبداد یا دینی اقتدار حکومت کی آزادی اور تمدنی ترقیات میں حارج ہوگا۔ دوسری طرف خلافت بھی بدستور قائم رہی اور مسلمانوں کے لئے بھی کوئی وجہ اعتراض و اضطراب کی پیدا نہ ہوئی۔

حالانکہ انھوں نے دونوں پہلو سنبھالے نہیں تھے۔ دونوں ناقص کر دیے تھے جس چیز کو انھوں نے حکومت کے نام سے الگ کیا تھا وہی دراصل خلافت تھی اور جس منصب کو انھوں نے خلافت کے نام سے قائم کیا تھا وہ خلافت نہ تھی پوپ کا ایک بے کار مگر خطرناک تخت تھا جو اسلام میں بھی پیدا کر دیا گیا تھا وہ نہیں سمجھے کہ جس تفریق سلطنت و خلافت کو وہ اصلاح سمجھ

رہے ہیں، اصلاح نہیں ہے ایک ناقابل قبول قیام منصب کا احداث ہے۔ آگے چل کر وہ خود بھی اسے گوارا نہ کر سکیں گے۔ انھیں دکھائی دیگا کہ یہ حکومت کے مقابلے میں ایک نئی حریف قوت پیدا ہوگئی ہے۔

غلطی پر تنبیہ | چنانچہ ابھی اس انتظام پر تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ ان پر تفریق کی غلطی واضح ہوگئی۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو عالم اسلام بھی اس صورت حال پر مطمئن نہیں، دوسری طرف خود ترکی حکومت کے لیے بھی اس کا وجود ایک خطرہ ہے۔ یہ صریح دو عملی اور دو طرفہ حکومت قائم کر دینا ہے یا یوں کہا جائے کہ ایک حکومت کے اندر دوسری حکومت کا تخت بچھا دینا ہے۔ جب کبھی موافق حالات جمع ہوں، ایک نئی شورش خلیفہ کے دینی اقتدار کے نام سے پیدا کر دی جا سکتی ہے اور قومی حکومت کو خطرہ میں ڈال دیا جا سکتا ہے۔

عالم اسلامی کا اعتراض | عالم اسلامی کا اعتراض دو مختلف نوعیتوں کا تھا۔ اصحاب تطرو فہم سرے سے اس تفریق پر معترض تھے وہ اسے خلیفہ کے اختیارات کا مسئلہ نہیں سمجھتے تھے وہ کہتے تھے کہ خلیفہ کے اختیارات قطعاً محدود اور مقید ہونے چاہئیں، لیکن خلافت کی ریاست کے سوا کوئی علیحدہ منصب نہیں، نہ موجودہ زمانے کے مقتضیات کیلئے کسی ایسی علیحدگی کی ضرورت ہے جس وقت تک ترکی حکومت میں شخصی فرمانروائی تھی اس کا رئیس سلطان تھا اور دینی خلیفہ تھا۔ اب جمہوریت قائم ہوگئی ہے تو اس کا رئیس سلطان نہیں ہوتا پریزیڈنٹ ہوتا ہے اور اسی منصب خلیفہ کا منصب ہے پس یہ صورت جو پیدا ہوگئی ہے کہ بیک وقت دو منصب بنا دئے ہیں، یہ قطعاً غلط ہے صرف ایک منصب ہونا چاہیئے۔ یا عبدالمجید خاں بہ حیثیت پریزیڈنٹ منتخب کئے جائیں یا جو پریزیڈنٹ ہے اسی کا خلیفہ تصور کیا جائے۔ باقی رہا یہ اشکال کہ پریزیڈنٹ کے غیر مسلم ہونے کا بھی امکان ہے تو یہ دراصل دستور اساسی کا مسئلہ ہے جب جدید ترکی کے دستور میں پہلی دفعہ یہ موجود ہے کہ حکومت کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا تو یہ صراحت بھی

جا سکتی ہے کہ پریزیڈنٹ کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔

لیکن ایسے معترضین کی تعداد بہت کم تھی۔ زیادہ معترضین وہ تھے جو اصل حقیقت سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے ہی عالم میں جا پڑے تھے۔ وہ سمجھتے تھے یہ جو کچھ ہوا ہے صرف خلیفہ کو مسلوب الاختیارات کر دینے کا معاملہ ہے یعنی اس کے مقدس اختیارات و حقوق چھین لیے گئے ہیں اس لئے وہ کہتے تھے۔ خلیفہ کو اختیارات ملنے چاہئیں۔ یہ صدائیں ترکی کے اندر بھی بلند ہوئیں، یا باہر سے بھی اُٹھتی رہیں۔

(۷)

امیر علی اور آغا خاں کی چٹھی اس اثنا میں ایک دوسرا واقعہ ہوا جو فی نفسہٖ اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن حالات نے اسے غیر معمولی اہمیت دے دی۔ یہ سید امیر علی اور سر آغا خاں کی مشہور چٹھی ہے جو انھوں نے عصمت پاشا کے نام لندن کو بھیجی تھی اور بعض ترکی اخبارات میں چھپ گئی تھی۔

یہ حقیقت قطعی طور پر معلوم ہے کہ اس چٹھی کے لکھنے کا باعث صرف یہ امر تھا کہ سر آغا خاں، سید امیر علی اور بعض دیگر مسلمانانِ لندن نے ذاتی طور پر محسوس کیا کہ ترکی حکومت کو خیر خواہانہ مشورہ دینا چاہیئے۔ یہ بات نہ تھی کہ برطانیہ کی اس میں کوئی سازش ہو یا ترکی کی کسی ارتجاعی جماعت (ری ایکشنریز) کا اس میں در پردہ ہاتھ ہو۔ لیکن انگورہ کی برسر اقتدار جماعت، جو پہلے ہی سے مضطرب ہو رہی تھی اچانک چونک اٹھی اور طرح طرح کے دور دراز اندیشوں کے خواب دیکھنے لگی۔ اس نے خیال کیا کہ یہ اس خطرے کا لازمہ ہے جو اس خود ساختہ منصب خلافت کی وجہ سے عنقریب ظہور میں آنے والا ہے۔

یہ چٹھی اگرچہ واقعی اخلاص سے لکھی گئی تھی لیکن ساتھ ہی افسوس ہے کہ اس کے اعتراض کی بنیاد وہی عام غلطی تھی جو صورت حال کے سمجھنے میں تمام لوگ کر رہے تھے۔ بلاشبہ موجودہ صورت حال قابل اعتراض تھی مگر اس لئے نہیں کہ خلیفہ کے شخصی اختیارات سلب کر لیے گئے

تھے بلکہ اس لئے کہ سرے سے حکومت اور خلافت کی تفریق ہی غلط تھی . خط میں اس پر زور دیا گیا تھا کہ کم سے کم خلیفہ کو اتنا اختیار ملنا چاہیئے جس قدر پوپ کو ہے ، حالانکہ اس بارے میں پوپ کی تمثیل ہی ظلمات بعضہا فوق کی مصداق ہے ، کجا مسیحیت کا پوپ جو شریعت کے نسخ و اضافہ کا مالک اور جنت و دوزخ کا ٹھیکیدار ہے اور کجا اسلامی خلیفہ جو زیادہ سے زیادہ اسلامی جمہوریت کا صدر اور غیر منصوص مسائل و حوادث میں بہ مشورہ اہل علم اجتہاد کر سکتا ہے :

تسالن بین مشرق و مغرب اعتراضات کی غلط بنیاد

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صورت حال کے سمجھنے میں یہ غلطی محض رائٹ آنریبل سید امیر علی اور سر آغا خان ہی کو نہیں ہوئی ، ہندوستان مصر وغیرہ میں جس کسی نے اعتراض کیا ، اس غلط بنیاد پر کیا سب یہی کہتے رہے کہ خلیفہ عبدالمجید خان مسلوب الاختیارات کر دیئے گئے . لیکن اتنی صاف اور موٹی سی بات کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئی کہ سلب اختیارات دوسری چیز ہے سلطنت و خلافت کی علیحدگی دوسری چیز ہے . چنانچہ ابھی حال ہی میں شیخ جامع الازہر قاہرہ کے ماتحت علمائے مصر کا جو جلسہ ہوا تھا جدید فیصلہ انگورہ کے خلاف تجویز منظور ہوئی تھی اس میں یہ غلط فہمی موجود ہے . تجویز میں ظاہر کیا ہے کہ قومی مجلس انگورہ نے خلیفہ عبدالمجید خاں کے تمام اختیارات سلب کر لئے تھے . اس لئے ان کی خلافت محض نام کی خلافت تھی ، حالانکہ سلب نہیں کیئے تھے ایک نیا منصب احداث کیا تھا . اعتراض اس پر ہونا چاہیئے تھا نہ کہ سلب اختیار پر

دراصل اس معاملے میں اول دن سے جو بل پڑ گیا ہے وہ یہی بنیادی غلطی ہے . بات کچھ ہے ، لوگ سمجھتے کچھ ہیں اور اعتراض ہوتا ہے کچھ . پھر معاملہ سلجھے تو کیوں کر سلجھے ؟ خود ترکی کے اندر بھی جو لوگ برسر اقتدار جماعت کے مخالف ہیں ، ان کا بھی یہی حال ہے

۲ ۔ مارچ کو انگورہ کی اسمبلی میں تجویز کے مخالفین نے جو کچھ کہا اور اس بنا پر اعتراض کیا ، اس میں بھی یہی بنیادی غلط فہمی اور الجھاؤ کام کر رہا ہے . جب ایک معاملہ میں مخالف اور موافق دونوں اس طرح پر خود غلط ہو جائیں اور کھوئے جائیں تو ظاہر ہے اس کا حشر کیا ہوگا .

ناگہانی اضطراب بہ ہر حال اس چٹھی کو اعیانِ انگورہ نے ایک دوسری ہی نظر سے دیکھا انھیں یقین ہو گیا کہ خلیفہ کا معاملہ یہیں تک پہنچ کر رکنے والا نہیں ہے۔ اب ترکی کے اندر اور باہر شور مچایا جائے گا کہ خلیفہ کے مقدس اختیارات واپس ملنے چاہئیں۔ جب سید امیر علی اور سر آغا خاں جیسے مغربی خیال اور اب ٹو ڈیٹ مسلمانوں کا یہ خیال ہے تو عوام تو یقیناً یہی کہیں گے کہ خلیفہ کو زار روس اور عبدالحمید خاں کی طرح بالکل مطلق العنان چھوڑ دیا جائے

ما شئت لا ما شائت الاقدار
فاحکم، فانت الواحد القہار

۳۔ مارچ کا فیصلہ غرض اب وہ اپنی غلطی پر پوری طرح متنبہ ہوئے۔ انھوں نے وہ بات معلوم کر لی، جو اول روز ہی معلوم کر لینی تھی، یعنی مناصب کی یہ تقسیم نہ صرف غلط ہے بلکہ نا قابلِ عمل و اجرا ہے۔ جو چیز حقیقی ہے، وہ صرف حکومت ہے اس کے سوا جو کچھ بنایا گیا ہے۔ محض نام اور بناوٹ ہے۔

چنانچہ اب صورتحال یکلخت منقلب ہو گئی۔ کل تک وہ اس تفریق کی تائید میں جتنی باتیں کہتے تھے اب خود ہی ان میں سے ہر بات کا رد کرنے لگے اور تمام مذہبی دلائل ان کی زبانوں پر آ گئے جو کل تک ان کے مقابلے میں ہمارے دلائل تھے۔

اسی احساس اور تنبیہ کا نتیجہ وہ فیصلہ ہے جو ۳ر مارچ کو اسمبلی نے کثرتِ رائے سے کیا اور جو کئی ہفتے پہلے سے پیپل پارٹی میں نشو و بلوغ حاصل کر چکا تھا۔ اس فیصلے سے انھوں نے منصبِ خلافت کی وہ نئی دیوار ڈھا دی، جو خود ہی دو سال پہلے چنی تھی۔

اسمبلی میں جو تجویز منظور ہوئی۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ منصبِ خلافت حکومتِ ترکیا میں اصلاً موجود ہے، اس لئے خلیفہ معزول اور منصبِ خلیفہ موقوف کیا جاتا ہے۔

افکار و نظر کا الجھاؤ اس تجویز کی تائید میں ذمہ دار ارکان نے جو خیالات ظاہر کیے اور بعض ارکان نے شرعی نقطۂ خیال سے جو تقریریں کیں، ان میں وہی الجھاؤ اور خیالات کا اضطراب

موجود ہے جو اوّل سے آخر تک بے ربطی سے پُر ہو گیا ہے۔ شرعی بحث و استدلال بھی تمام تر عامیانہ اور ملّایانہ ہے۔ نظر و تحقیق کی کوئی بلند بات نظر نہیں آتی۔ آج کل اس جماعت کے سب سے زیادہ معتمد عالم سید بک ہیں، جو پہلے وکیلِ حقانیہ تھے۔ یہ دراصل قسطنطنیہ کے دستار بندوں میں سے ہیں۔ لیکن جبہ کو طربوش اوڑھ لی۔ تھوڑے دن گزرے میں نے ان کے دو نوٹس پڑھے تھے جو انہوں نے قانون العائلہ کا بل (مسودہ قانون) ترتیب دیتے ہوئے رکھے تھے۔ ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص علومِ اسلامیہ میں عام مقلدانہ اور ملّایانہ سطح سے کچھ بلند درجہ رکھتا ہے، لیکن جب میں نے اس کی تقریر اس مبحث میں پڑھی تو حد درجہ مایوسی ہوئی۔ خلافت کے باب میں اسلامی نقطۂ خیال واضح کرنے کے لئے کس قدر بلند، پاکیزہ اور مقتضیاتِ وقت کے عین مطابق مباحث موجود ہیں لیکن اس شخص کا تمام تر مبلغِ علم محض چند متونِ فقہ و کلام کی ورق گردانی اور نقلِ عبارت تک محدود ہے اور وہ بھی بہ اعتبارِ استشہاد و استنباط محلِ نظر، جیسا کہ آئندہ نمبروں میں بہ تفصیل عرض کروں گا۔

فیصلہ کی تشریح بہرحال اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی خلافت سے مقصود اسلامی حکومت۔ جب اسلامی حکومت ٹرکی میں موجود ہے تو کسی دوسرے منصب کا قائم رکھنا ضروری نہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ پہلے طریقہ تھا کہ کوئی فرد خلیفہ قرار دیا جاتا تھا تو یہ بھی شرعاً ضروری نہیں ہے۔ شرع کی جو چیز مطلوب ہے وہ حکومت ہے تاکہ اسلامی احکام نافذ ہوں اور عدل دامن قائم رہے۔ پہلے ایک فرد کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات رہتے تھے اب تجربے سے ثابت ہو گیا کہ اس طرح اختیارات کا دے دینا طرح طرح کے مفاسد کا باعث ہوتا ہے۔ پس اہلِ حل و عقد یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آئندہ کسی ایک شخص کو خلیفہ نہ بنایا جائے۔ خلافت کے تمام اختیارات قوم کے نمائندوں کے ہاتھ میں رہیں۔ چنانچہ اس تجربے کا یہی منشا ہے کہ آئندہ جمہوریت ترکیا بہ حیثیت

لہ افسوس کہ آئندہ نمبر نکلنے کی نوبت ہی نہ آئی اور مسئلہ خلافت کی جگہ دوسرے مسائل معاصر نے لے لی۔

خلافت اسلامی تمام فرائض انجام دے گی، لیکن کوئی ایک شخص خلیفہ نہ ہوگا۔

عالمگیر خلافت کا الجھاؤ اس تمام مباحثے میں کوئی کوشش اس امر کی نہیں کی گئی کہ جو الجھاؤ خلافت کی حیثیت و نوعیت کے بارے میں حکومت کے پُرپیچ طرزِ عمل اور صدیوں کی غفلت و اہمال سے پڑ گیا ہے، اسے دور کر دیا جائے۔ ایک بنیادی غلط فہمی اس بارے میں پھیلی ہوئی کہ عالمگیر اسلامی خلافت سے بہ حالتِ موجودہ مقصود کیا ہے۔ عالمِ اسلامی کی موجودہ حالت یہ ہے کہ صدیوں سے مختلف حکومتوں اور متفرق محکوم جماعتوں میں بٹ گیا ہے اور مثل دوسری حکومتوں کے ایک محدود دائرے میں ترکی حکومت بھی رہ گئی ہے۔ اب ترکی حکومت میں اسلامی خلافت ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور تمام مسلمانانِ عالم سے اس کے روابط کی شرعی نوعیت کیا ہو؟

اس سوال کے حل کرنے میں اول دن سے سب کھوئے گئے اور اس موقع پر بھی صاف کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔ ایک طرف تو صریح تجویز کہہ رہی ہے کہ ترکی میں اسلامی خلافت موجود ہے، کیونکہ حکومت ہی خلافت ہے۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے۔ عالمگیر اسلامی خلافت کا خیال محض ایک ناکام نظریہ اور ناقابلِ عمل متکورہ ہو (ترکی میں آئیڈیا کے معنوں میں متکورہ بولنے لگے ہیں، یعنی فکر کا اسم مفعول حالانکہ عربی قاعدے کے رو سے غلط ہے) عصمت پاشا نے اسمبلی میں جو تقریر کی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے، وہ عالمگیر اسلامی خلافت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ مختلف اسلامی حکومتوں کی جگہ ایک اسلامی حکومت قائم ہو جائے اور اسے بہ حالتِ موجودہ ناممکن بتلاتے ہیں، حالانکہ عالمگیر اسلامی خلافت کا یہ مطلب سمجھنا غلط ہے مسئلہ کی صورت دوسری ہے اور مرکز خلافت کے قیام سے شرعاً و عقلاً دوسرا ہی مطلب ہے چنانچہ اس کی تشریح آگے آئے گی۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا جو تار خلافت کمیٹی کے نام آیا تھا اس میں بھی ایسے جملے موجود ہیں جن میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔

مسئلہ کی صورت | دو باتیں قطعی اور صاف ہیں :۔

۱۔ جس منصب خلافت کو انھوں نے اب موقوف کیا ہے، یہ اسلامی خلافت نہ تھی۔ یہ ایک خود ساختہ منصب تھا، جو خود انہی نے غلطی سے قرار دیا تھا۔ اسلامی خلافت وہی چیز تھی، جسے انھوں نے حکومت کے نام الگ کر لیا تھا، جس دن اس حکومت نے اپنا صدر منتخب کیا، اسی دن خلیفہ بھی منتخب ہو گیا کیونکہ خلیفہ اور رئیس حکومت دو الگ منصب نہیں ہیں۔ ایک ہی منصب کے دو مختلف نام ہیں۔ پس اگر اب انھوں نے اس خود ساختہ منصب کو موقوف کر دیا اور کہتے ہیں کہ حکومت کی موجودگی میں یہ غیر ضروری ہے تو جہاں تک اسلامی نظام خلافت کا تعلق ہے، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہم نہ اس کے خواہشمند تھے، نہ ہم نے اسے صحیح سمجھا تھا۔ خود ہی انھوں نے غلط دیوار چنی تھی اور خود ہی ڈھا دی۔

۲۔ یہ مسئلہ کا منفی پہلو تھا۔ اب مثبت پہلو سامنے آتا ہے یعنی اس نئے اور خود ساختہ منصب کے موقوف کر دینے کے بعد جو چیز رہ گئی ہے، وہ کیا ہے اور کس شکل میں ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت ہی اسلامی خلافت ہے۔ اس سے ہم متفق ہیں۔ اب ہونا یہ چاہیئے کہ جب حکومت خلافت ہے، تو جو شخص اس کا رئیس ہے وہی خلیفہ سمجھا جائے جیسا کہ ترکی حکومت شخصی حکمرانی کے نظام پر تھی اس کا رئیس سلطان تھا اور وہی خلیفہ تھا۔ اب جمہوری نظام ہے تو اس کا رئیس سلطان نہیں ہو سکتا، پریزیڈنٹ ہوگا۔ چاہیئے کہ وہی خلیفہ ہو، لیکن اس سے ان کو اختلاف ہے وہ کہتے ہیں اگرچہ حکومت کی ریاست کا منصب موجود ہے لیکن ہم اسے اب خلیفہ نہیں کہیں گے۔ ہم دودھ کو دودھ کہیں گے مگر شیر نہیں کہیں گے۔ زیادہ صاف لفظوں میں ان کا یہ فیصلہ ہے کہ آئندہ حکومت ترکیا میں کوئی ایک فرد لقب خلیفہ سے ملقب نہ ہوگا جس طرح شخصی حکومت جمہوری نظام میں مبدل ہو گئی ہے۔ اسی طرح شخصی خلافت کی جگہ گویا جمہوری خلافت قائم ہو گئی ہے۔

نقطۂ اختلاف فی الحقیقت ہم میں اور ان میں یہی نقطۂ اختلاف ہے۔ اختلاف اس میں

نہیں ہے کہ جو اسلامی خلافت ۳ مارچ سے پہلے وہاں موجود تھی، وہ اب باقی رہی یا نہیں؟
اس لئے کہ وہ قطعاً اب بھی موجود ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ اس خلافت کا نظام کیا
ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ آئندہ کوئی فرد لقب خلیفہ سے ملقب نہ ہوگا یا بہ الفاظ دیگر کوئی ایک فرد
خلیفہ نہیں بنایا جائے گا۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اسلامی حکومت
کا جو رئیس ہو، وہ خلیفۃ المسلمین کے لقب سے ملقب کیا جائے۔

اپنے اس خیال کی تائید میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیفہ کے
قیام سے مقصود یہ نہ تھا کہ کوئی خاص شخص خلیفہ کے نام سے اجلاس کرے [illegible] یہ تھا
کہ اسلامی حکومت قائم ہو اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی انتظامات کی کفیل ہو۔ یعنی سرحدوں کی
حفاظت کرے، ملک میں امن بحال رکھے، مقدمات کا فیصلہ کرے۔ مجرموں کو سزائیں دے۔
مساجد و اجتماعات کا انتظام کرے۔ قوم کی تعلیم و تربیت اور نظم و قوام کا ذریعہ ہو اور وہ سب
کچھ کرے جو علل الٰہی کے قیام و دوام کے لئے ضروری ہے۔ یہ تمام مقاصد آج حکومت
کے قیام سے حاصل ہیں، کوئی کام ایسا نہیں ہے جو خلیفہ کی ذات خاص پر موقوف ہو پھر
کیوں شرعاً ضروری ہے کہ ایک خاص انسان خلیفہ کے نام سے ضروری رکھا جائے؟ پہلے
حالات دوسرے تھے۔ آج کل کے احوال و ظروف دوسرے ہیں۔ اب دنیا اس کے لئے تیار نہیں
کہ افراد و ذوات کے قبضے میں اپنی وکالت دیدے، جس کا ہزاروں برس تک غلط اور مجرمانہ
استعمال ہو چکا ہے۔ بلاشبہ اہل حل و عقد کیلئے جائز ہے کہ وہ بجائے ایک فرد کے نائبین امت
و اہل شوریٰ کے ہاتھ میں تمام اختیارات و انتظامات دے دیں۔

<u>ہمارا نقطۂ نگاہ</u> | ہم کہتے ہیں یہ سچ ہے کہ مقصود خلافت کے قیام سے حکومت عادلہ و حقہ
کا قیام ہے اور اس سے بھی ہمیں اختلاف نہیں کہ افراد و ذوات کے قبضے میں اختیارات
نہیں ہونے چاہئیں، لیکن قومی و جمہوری حکومت کا بہر حال کوئی رئیس ہونا چاہیے یا نہیں؟ اور آج
بھی حکومت ترکیہ ایک رئیس و صدر کا منصب قرار دے چکی ہے یا نہیں؟ اگر قرار دے چکی ہے،

تو اسی منصب کا نام اسلام کی بول چال میں "خلیفہ" اور امیر المومنین "ہے۔ پھر یہ کیسی مصیبت کی بات ہے کہ ایک حقیقت کے اعتراف و قبول سے تو انکار نہیں، لیکن اس کے نام سے انکار و توحش ہے؟ ہم یہ کب چاہتے ہیں کہ خلیفہ بمعنی بادشاہ یا بمعنی فرعون و نمرود ہو۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ ایک جمہوریت کے رئیس سے زیادہ اختیار نہ رکھے۔ اس سے زیادہ اختیار قطعاً غیر شرعی اختیار ہوگا پس کیوں نہ یہ صاف کر دیا جائے کہ اسلامی خلیفہ بجز رئیس حکومت کے اور کچھ نہیں ہے؟ اور چونکہ رئیس کا منصب موجود ہے لہٰذا خلیفہ بھی موجود ہے۔ اس کے لئے موجودہ دستور اساسی میں اس قدر صراحت بڑھا دینی پڑے گی کہ جمہوریت ترکیا کا رئیس صرف مسلمان ہو سکتا ہے لیکن وہ کہتے ہیں: نہیں ہم اسے صرف رئیس کہیں گے خلیفہ نہ کہیں گے

نزاع کی حیثیت بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نزاع محض لفظی ہے معنوی نہیں۔ مسمیٰ میں نہیں ہے، تسمیہ میں ہے۔ وہ منصب موجود ہے جو اسلامی خلافت کا منصب ہے اس کا نام بھی وہی ہے جو لفظ "امیر" کے منطوق اور لفظ خلیفہ کے مفہوم کا قائم مقام ہے۔ لیکن ایک خاص لقب یعنی خلیفہ یا امیر کے تسمیہ سے انہیں انکار ہے۔

لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ بلاشبہ جہاں تک نفس مسئلہ کی وضع و صورت کا تعلق ہے نزاع لفظی ہے مگر اس کی تہ میں معنوی اختلافِ فکر پوشیدہ ہے وہ خلیفہ کے ملقب سے اس لئے اختلاف نہیں کرتے کہ انہیں محض اس لفظ سے کوئی ضد ہے۔ وہ دراصل ان اثرات کو دیکھتے ہیں جو صدیوں کی روایات و تعامل سے اس لفظ کے اندر خمیر یا چکے ہیں اور اب کسی طرح اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے نصف اثرات ایسے ہیں جن سے ان کو توحش ہے نصف سے انہیں انکار ہے۔

انکار و توحش کی علت جن اثرات سے انہیں توحش ہے وہ اسلامی خلیفہ کی وہ شاہانہ و مستبدانہ تصویر ہے جو ایک ہزار سال سے دنیا کے دل و دماغ پر نقش ہو چکی ہے۔ وہ کہتے ہیں کاغذ پر ایک ایسے خلیفہ کا نقشہ کھینچا جا سکتا ہے جو مقید، جوابدہ اور شخصی نہیں

حکومت ہو، لیکن ہمارا واسطہ عملی دنیا سے ہے جو صدیوں سے صرف مستبد اور ملکی خلفا ہی
کو پہچانتی ہے۔ جب کبھی خلیفہ کا لفظ بولا جائے گا، معاً وہ تمام روایات و جذبات اس کے گرد
اکٹھے ہو جائیں گے جو صدیوں سے لوگوں کے دل و دماغ میں خمیر پا چکے ہیں۔ پھر قدرتی طور پر
یہ خواہش پیدا ہو جائے گی کہ شخصی فرمانروائی اور دینی سلطانی کا وہ ہیکل از سرِ نو آراستہ
کیا جائے، جسے ان مشکلوں سے ہم ڈھا چکے ہیں۔

وہ اس دینی اقتدار و حکومت سے بھی خائف ہیں جو ان کے خیال میں لفظ "خلیفہ"
کی ذہنیت (مینٹیلٹی) ہوگئی ہے، اگرچہ فی الاصل نہ تھی۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ یہ اقتدار
ترقی و تقدم کی راہ میں مانعِ عظیم ہے۔ گزشتہ سو برس کے اندر دولتِ عثمانیہ کے تنزل کا
بڑا باعث یہی اقتدار ہوا۔

جن اثرات سے انہیں انکار ہے وہ عالمگیر اسلامی توقعات و جذبات ہیں، جو لفظِ
خلیفہ سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ یہ توقعات عملاً کبھی وجود میں نہیں آئیں لیکن مختلف صورتوں اور
نوعیتوں میں دلنشیں ہو چکی ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان اثرات کا نمایاں ہونا ان کی موجودہ
ترقی پروگرام کے خلاف ہے۔ اس پروگرام کا ماحصل یہ ہے کہ ترکی حکومت کو بالفعل صرف
اپنی داخلی اصلاح و ترقی ہی میں مشغول ہو جانا چاہیئے۔ اس کی قوت اور ترقی ہی سے تمام مسلمانانِ عالم
کو اخلاقی تقویت پہنچ سکتی ہے۔ غیر عملی مرکزیت کے نظریوں سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

ہمارے خیال میں ان کے یہ انکار غلط مبادیات پر مبنی ہیں۔ ہم علیٰ وجہ البصیرت ایسے
حقائق اپنے سامنے رکھتے ہیں، جو ان خیالات میں سے ہر خیال کی غلطی پر دلیل قاطع ہے،
لیکن چونکہ بالفعل مقصود معرضِ نظر نہیں ہے۔ صرف ان کا نقطۂ خیال ظاہر کر دینا ہے۔
اس لیے اس پر آئندہ نمبر میں بحث کی جائے گی۔

عصمت پاشا کی تقریر] رائٹر ایجنسی نے عصمت پاشا کی ایک تقریر
کا خلاصہ شائع کیا تھا جس کا ماحصل یہ تھا

کہ اگر عالم اسلامی نے ہماری مدد کی ہے تو اس لیے نہیں کی ہے کہ ہم میں اسلامی خلیفہ ہے بلکہ صرف اس لئے کہ ہم طاقتور ہیں۔

لوگوں نے یہ بیان سخت انکار اور تعجب کے ساتھ سنا، کیونکہ اس میں حقیقتِ حال کی صریح تکذیب و تحریف کی گئی تھی۔

لیکن ٹرکی اور مصر کے اخبارات میں عصمت پاشا کی جو مفصل تقریر چھپی ہے اس میں قطعاً یہ بیان نہیں ہے۔ ایک دوسری بات ہے جو کہی گئی ہے۔ میں تقریر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ یہاں درج کر دیتا ہوں۔ یہ اس رپورٹ سے ماخوذ ہے جو توحید افکار، اقسام "الاخبار" اور "وادی النیل" میں چھپی ہے۔

"اس مسئلے کے دو پہلو ہیں، سیاسی اور دینی۔ دینی حیثیت سے واضح رہے کہ اس منصب خلافت کے موقوف کر دینے سے کوئی ادنیٰ نقص بھی احکام اسلامیہ کے اجرا و نفاذ میں پیدا نہ ہو گا کیونکہ حکومت ترکیا بدستور تمام معاملات و احکام اسلامیہ نافذ کرتی رہے گی، کامل سے کامل اور بہتر سے بہتر شکل میں اگرچہ کوئی خاص منصب بہ لقب خلیفہ کے ساتھ باقی نہیں رہے گا۔ قطع نظر اس کے ظاہر ہے کہ ہم اس قومی مجلس کے ذریعے چار برس سے تمام احکام اسلامیہ نافذ کر رہے ہیں، حالانکہ مجلس کے اندر منصب خلافت کا کوئی اثر نہیں ہے۔ پھر اب کیوں ایسا نہ ہو سکے گا؟ ضرور ہو گا اور اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک اللہ تعالےٰ کی مشیت ہے۔

باقی رہا سیاسی پہلو تو جو لوگ خلافت کی سیاسی قوت کا اظہار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں، قسطنطنیہ اس لئے ترکی حکومت کے قبضہ میں چھوڑا گیا کہ وہ خلیفہ کا مستقر ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ قسطنطنیہ اس لئے ترکی حکومت کے لئے چھوڑ دیا گیا کہ ترکی قوم نے یونانی افواج اور خلیفہ دیالیین

کی افواج کا مقابلہ کیا اور اس میں کامیاب ہوئی اور جب تک یہ قوت قوم میں رہے گی قسطنطینیہ اور تمام بلاد ترکیا اس کے قبضہ میں رہیں گے ملک اور شہر لیے اور دیے نہیں جاتے، طاقت کے ذریعے قبضے میں لائے جاتے ہیں۔

مسلمانان عالم جو احترام و محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں وہ مقام اور منصب پر منحصر نہیں ہے۔ وہ دراصل شعب ترکی کی اسلامی غیرت اور اسلامی خدمات کی وجہ سے ہے۔ بے شک تمام سچے اور باشرف مسلمان ترکوں کا احترام کرتے ہیں، لیکن اس لئے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی راہ میں مجاہد ہیں اور جب تک ہم ایسے رہیں گے مسلمانوں کے یہ جذبات بھی ہماری نسبت قائم رہیں گے۔

آخری مضمون عربی میں یوں ہے:

اجل ان جمیع المسلمین الحقیقین الابرار یحترمون الاتراک الذین یجاھدون فی الاسلام والمسلمین

یہاں اس سے مجھے بحث نہیں کہ جو خیالات اس تقریر میں ظاہر کئے گئے ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں؛ مقصود یہ ہے کہ رائٹرایجنسی نے جو خلاصہ بھیجا تھا وہ کس درجہ محرف اور مسخ تھا؛ کہاں عصمت پاشا کا یہ بیان کہ مسلمانانِ عالم کے جذبات ترکوں کی اسلامی خدمات کی وجہ سے ہیں؛ نہ کہ مجرد خلیفہ کے منصب کی وجہ سے اور کہاں رائٹر کی یہ رنگ آمیزی کہ مسلمانانِ عالم خلافت کی وجہ سے نہیں ترکی حکومت کی طاقت کی وجہ سے اس کی مدد کرتے۔ دونوں کی اسپرٹ میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ کیا ایسی حالت میں ضروری نہ تھا کہ لوگ محض ایجنسی کی خبروں کی بناء پر آخری رائیں قائم نہ کرتے؟[1] (۱۱ جون ۱۹۲۳ء)

[1] یہاں پہنچ کر سلسلہ رک گیا اور میرے علم کی حد تک مولانا نے اس موضوع پر اور کچھ نہ لکھا۔

امیر ابن سعود اور حرمین شریفین

گنبدوں کے انہدام کا حادثہ

شریف حسین کو انگریزوں نے حجاز کا بادشاہ بنایا تھا مسلمان دو وجوہ سے اس کے خلاف تھے۔ اوّل اس لئے کہ اس نے دوران جنگ سلطنت عثمانیہ ترکیا سے غداری کی، جو منصب خلافت کی بھی حامل تھی۔ دوم محض حجاز ہی نہیں بلکہ عرب کے بعض دوسرے حصوں مثلاً شام فلسطین، عراق میں بھی انگریزوں اور فرانسیسیوں کے لئے مداخلت بلکہ تصرف کا دروازہ کھولا۔
اکتوبر ۱۹۲۴ء میں سلطان عبدالعزیز آل سعود والی نجد و ملحقات شریف حسین کی مسلسل مخاصمانہ کارروائیوں کے باعث میدان جنگ میں اترنے پر مجبور رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے ایک جرنیل خالد بن لوی کو پیش قدمی کا حکم دیا تھا۔ اچانک طائف فتح ہو گیا اور مکہ معظمہ کا راستہ کھل گیا۔
شریف حسین نے حکومت سے دستبرداری اختیار کر لی اور اس کا بیٹا امیر علی، شاہ حجاز بنا۔
اس اثناء میں سلطان عبدالعزیز کے عساکر نے حجاز کے باقی حصے بھی مسخر کر لیے۔ آخر امیر علی جدّہ کو چھوڑ جانے پر مجبور رہا۔ البتہ اس انقلاب میں انگریزوں نے عقبہ اور معان کو حجاز سے الگ کر لیا۔ بعد ازاں انہیں اردن میں شامل کر دیا۔

نجدی جرنیل نے طائف میں نیز مکہ معظمہ میں قبّے منہدم کرا دیے جس پر مسلمانوں میں بڑا شور مچا۔ یہ مضمون مولانا نے اس وقت مرتب فرمایا تھا جب سلطان عبدالعزیز نجد سے حجاز پہنچ کر مکہ معظمہ میں امور نظم کا کفیل بن چکا تھا۔ امیر علی جدّہ پر قابض تھا۔ جدہ حاجیوں کے اترنے کے لئے عام بندرگاہ تھا۔ امیر علی نے حاجیوں کو روک دیا۔ اس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ حاجی مکہ معظمہ نہ پہنچیں گے تو اہل مکہ میں بے چینی پیدا ہوگی حاجی ان کے لئے معاش کا واحد ذریعہ تھے۔ سلطان عبدالعزیز نے فوراً قنفذہ، لیث اور رابغ کی بندرگاہوں میں حاجیوں کے اترنے کا انتظام کر دیا اور حاجی بدستور حجاز گئے اگرچہ ان کی تعداد کسی قدر کم تھی

یہ مضمون حجاز کا آخری فیصلہ ہو جانے اور سلطان عبدالعزیز کے ملک الحجاز و النجد بن جانے کے بعد شائع ہو چکا تھا یعنی اکتوبر ۱۹۲۶ء میں۔

یہ بھی عرض کردوں کہ اس مضمون کے دو مقصد تھے اول یہ کہ جمعیۃ خلافت ہند نے جو مسلک اختیار کیا تھا، وہ ہر لحاظ سے درست اور نظر بہ حالات عمومی بہترین تھا، دوم مسلمانوں کو تمام حالات کا موازنہ کرنے اور صحیح راہ عمل پر پہونچنے میں سہولت ہو۔

(۱)

اس خبر کی اشاعت سے کہ مکہ معظمہ کے بعض مقابر و مشاہد کے گنبد گرا دیے گئے ہیں، لوگوں میں تشویش و پریشانی پیدا ہو گئی۔

اس میں شک نہیں خبر کی اہمیت اور خلاف توقع استماع کا یہ قدرتی نتیجہ تھا۔ حرمین شریفین کے ہر حادثہ میں مسلمانوں کے لئے اہمیت ہے اور یہ حادثہ تو ایسے پیچ در پیچ حالات و اثرات سے دست بگریباں ہے کہ اگر تشویش و اضطراب کا باعث نہ ہوتا تو موجب تعجب تھا۔ پس تشویش ہوئی اور اس کا ہونا قدرتی تھا۔ اس پر نہ تو تعجب ہے اور نہ افسوس، البتہ افسوس اس پر ہے کہ مسلمانوں میں فتنہ و فساد اور تفرقہ و انتشار کا ہنگامہ گرم کرنا ضروری نہ تھا، جو پوری جدوجہد کے ساتھ گرم کیا گیا اور ایسی صورتحال پیدا کر دی گئی جس سے بجز نقصان مقاصد و شماتت مخالفین کوئی مفید نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا و لیست باول قارورۃ کسرت فی البند

کج اندیشی اور باطل آرائی

بعض حلقوں کی تقریر و تحریر میں جو خیالات و جذبات ظاہر کئے جا رہے ہیں، انکی کج اندیشی و باطل آرائی کا عجیب حال ہے۔ پیشتر سے منتشر عناصر اور گوشے میں پیش رفت کار کے منتظر تھے۔ اس مہلت نے لطیفہ غیبی کا کام دیا۔ اب سب یکجا و ہم آہنگ ہو گئے۔ علم و تحقیق کے فقدان اور افراط و تفریط کے ذوق فریقانہ تعصب کی دلدادگی اور اس اغراض دنیا کی فتنہ پردازیوں نے ایک ہنگامۂ حقیقت آشوب پا کر دیا۔

ایک طرف امیر علی کے ایجنٹ ہیں، انھوں نے مرکزی خلافت کمیٹی کے عہدہ داروں کی جو صلح جویانہ طبیعت سے فائدہ اٹھا کر بمبئی میں قدم جما لئے تھے۔ یہاں ایسے لوگوں کی کہاں کمی تھی جو ایمان و ضمیر سے کہیں زیادہ معیشت کا معاملہ اہم سمجھتے تھے۔ فوراً ایک حلقہ فراہم ہو گیا

وہ دو چار ورق کے پرچے اخبار کے نام سے نکال دیے گئے۔ جدہ سے بھی حسب ضرورت تاروں کی روانگی شروع ہوگئی۔ یہ پرچے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیجے گئے۔ ان میں اول سے لیکر آخر تک نجدیوں کے خلاف وہ تمام کذابیاں اور افترا پردازیاں شائع کی جاتی تھیں جنہیں ان کی کذب بیانی گڑھ سکتی تھی۔ "نجدیوں نے مکہ میں قتل عام کردیا۔" "تمام عورتوں کو کنیز بنا لیا۔ ان کی عصمت دری کی۔" "ان لوگوں کا دین دوسرا ہے، کلمہ دوسرا ہے۔" "مولد نبی (صلعم) میں بول براز کرتے ہیں۔" "آنحضرت (صلعم) پر درود بھیجنا ان کے نزدیک حرام ہے۔" "تمام شہر لوٹ کر تباہ کردیا ہے۔" "جو اسلام ترک کرکے ان کا دین قبول نہیں کرتا، اسے بے دریغ قتل کردیتے ہیں۔" وغیر ذالک من الاکاذیب والاباطیل۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہیں مرکزی خلافت کمیٹی یا اس کے بعض ارکان سے ذاتی مخالفتیں تھیں۔ ان کی فرصت طلبی بھلا یہ موقع کیوں جانے دیتی؟ وہ بھی پوری سرگرمی سے شریک کار ہوگئے۔

فرقہ بندیوں کا فتنہ | تیسری طرف جسم امت کا مرض مزمن ہے یعنی مذہبی فرقہ بندیوں کا فتنہ خوابیدہ۔ اسے بھی چیخ چیخ کر بیدار کیا جارہا ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ باہمی خلاف و نزاع سے تعصب پیدا ہوتا ہے اور تعصب سے بے شمار جھوٹی باتیں ایکدوسرے کی نسبت پھیل جاتی ہیں۔ نجدیوں کی نسبت بھی ایسی بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ اہل علم و انصاف حقیقت حال سے واقف تھے۔ اب وہ سب باتیں دہرائی جارہی ہیں۔ ان کی اصلی کمزوری اور غلطی تو کوئی بیان نہیں کرتا۔ اتہام و افترا اور سب و شتم پر اتر آئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اصلی معاملہ پر اعتدال کے ساتھ رائے قائم کی جائے، کوشش کی جارہی ہے کہ عامۃ الناس میں کسی نہ کسی طرح مذہبی فرقہ بندی کے تعصب کی آگ بھڑک اٹھے۔

عوام کی حالت | مصیبت ہر طرح عوام کے لیے ہے۔ وہ صرف جذبہ و جوش کی مخلوق ہیں۔ نہ ان میں دماغ ہے نہ ارادہ و اختیار۔ فوری تاثر و انفعال ان کا خاصۂ مزاج ہے۔

جب چاہیئے تھوڑی دیر کے لئے برانگیختہ کردیجئے، خصوصاً ایسی حالت میں کہ بآسانی مذہبی جذبات ہیجان میں لائے جاسکیں. حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھیڑ دیکھ کر فرمایا تھا: "یہ رعاع اتباع کل ناعق: ایک بھیڑ جو ہر چیخنے والے کے پیچھے دوڑنے لگتی ہے." عوام کی ذہنیت کی یہ تعریف جو باب مدینۃ العلم کی زبان حق ترجمان پر طاری ہوئی اس سے کہیں زیادہ بلیغ و جامع ہے جو روسو نے سوشل کنٹراکٹ میں کی ہے. ایک اندھی ہیئت اجتماعیہ جو نہیں جانتی اسے کیا کرنا چاہیئے بلاشبہ یہ حالت افسوسناک ہے، لیکن میری انگلیاں زمانے کی نبض پر ہیں. میں مطمئن ہوں کہ یہ عارضہ زیادہ دیر تک ٹکنے والا نہیں. اس فتنہ آرائی میں نہ تو اخلاص ہے، نہ سچائی. جھوٹ کا کارخانہ کتنا ہی مضبوط بنالیا جائے. آخر اسے ٹوٹنا اور نابود ہونا ہے. دوام و ثبات صرف حقیقت ہی کے لئے ہیں، وتلک الدار الآخرۃ نجعلہا للذین لا یریدون فی الارض علواً ولا فساداً والعاقبۃ للمتقین [1]

اتباع حق اور اعتدال فکر میں سب سے پہلے مسلمانوں کو اتباع حق اور اعتدال فکر کی دعوت دوں گا ہمارا فرض ہے کہ جو مسلک ہم نے اول دن سے ان معاملات میں اختیار کیا ہے. سنجیدگی و استقامت کے ساتھ اس پر قائم رہیں. ہم مسلمانان ہند کو اشخاص اور جماعتوں سے کوئی تعلق نہیں. ہمارے پیش نظر صرف مقاصد اور اصول ہیں. ہمیں نہ امیر ابن سعود سے کوئی تعلق ہے، نہ شریف حسین اور امیر علی سے کوئی ذاتی مخالفت. جو کچھ ہے اسلام کے لئے ہے، مسلمانوں کے لئے ہے. ہم جس شخص اور جماعت کے کام مقاصد کے موافق پاتے ہیں، تائید کرتے ہیں جس کو مخالف دیکھتے ہیں، مخالفت کرتے ہیں. اگر ہم حرمین شریفین کی حفاظت کے لئے بھی اپنے اندر بطرز فدایانہ اور مخلصانہ روح عمل پیدا نہیں کرسکتے تو ہمیں

---

[1] یہ آخرت کا گھر ہے اور اسے ہم ان لوگوں کے لئے بناتے ہیں جو نہ تو زمین میں بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد اور عاقبت متقیوں کے لئے ہے. (القصص)

یقین کر لینا چاہیے کہ ہم اسلام کے اہم ترین مقاصد کیلئے کچھ نہیں کر سکتے "ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل"

(۲)

مرکزی خلافت کمیٹی کا مسلک قبل اس کے کہ آگے بڑھوں، لوگوں کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس باب میں مرکزی خلافت کمیٹی اور اس کے تمام ذمہ دار ارکان کا مسلک اوّل دن سے کیا رہا ہے؟ اس کی ضرورت نہ تھی لیکن مشکل یہ ہے کہ عوام کی ذہنیت میں سب سے زیادہ کمزور خانہ حافظہ کا ہے۔ ممکن ہے بہت سی حقیقتوں کی طرح یہ مشہور و معلوم بات بھی لوگوں کو یاد نہ رہی ہو۔

جنگ عظیم سے جو مصیبتیں اسلامی دنیا پر طاری ہوئیں۔ ان کا احساس مسلمانان ہند کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ ادائے فرض کے لئے آگے بڑھے اور کارکن حلقہ کی بنیاد پڑی جو مرکزی خلافت کمیٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس جماعت نے اول دن سے جو مقصد اور مسلک عمل اختیار کیا وہ حسب ذیل ہے۔

حفاظت حرمین اور اتحاد ۱۔ موجودہ وقت کی سب سے بڑی اور سب سے مقدم اسلامی ضرورت یہ ہے کہ بلاد عربیہ خصوصاً حرمین شریفین کی حفاظت و استقلال کے لئے ایک عالمگیر جدوجہد جاری کی جائے۔

۲۔ یہ مقصد عظیم مسلمانوں کے تمام فرقوں اور ہر خیال و مشرب کے لوگوں کے لئے یکساں طور پر اہم و مطلوب ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ سب متفق ہو کر کوشش کریں اپنے باہمی اختلافات و نزاع فراموش کر دیں۔

۳۔ چونکہ ایسا عام اتفاق وجود میں نہیں آسکتا۔ جب تک ہم باہمی خلاف و نزاع جاری ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں ایک قاعدہ کار بطور اساس و اصل کے ٹھہرا لیا جائے، جسے انگریزی میں فارمولا کہتے ہیں۔ وہ قاعدہ یہ ہے

کہ اجماع کل اور ترک ما بہ النزاع یعنی تمام مسلمان وقت کے بڑے اور مشترک
مقصد کے لئے متفق ہو جائیں اور جس وقت تک یہ مقصد حاصل نہ ہو ان تمام
باتوں سے احتراز کریں، جن میں باہمی خلاف نزاع پیدا ہو اور عام اتفاق میں انتشار
واقع ہو۔ صدیوں سے جو بات مسلمانوں کو کمزور کر رہی ہے، یہی ہے کہ اتحاد و سعی
کے وقت باہمی اختلافات چھڑ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کے مشترک
مقصد کے لئے متحد محاذ قائم نہیں رہتا اور شیرازۂ امت بکھر جاتا ہے۔

دو مقصد یا مہم۔ دو چیزیں ہیں۔ دونوں کے محل الگ ہیں اور وقت مختلف۔
ایک امت کی باہر سے حفاظت ہے، ایک اندر کی اصلاح۔ اسلام اور
مسلمانوں کی موجودہ حالت یہ ہو رہی ہے کہ باہر سے دشمنوں کا احاطہ ہے اور
اندر کا بھی ہر گوشہ محتاج اصلاح ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کرنا چاہیئے؟
مقدم بیرونی حفاظت ہے یا اندرونی اصلاح؟ ہر صاحب علم و فہم تسلیم کرے
گا کہ مقدم حفاظت ہے، نہ کہ اصلاح۔ پہلے تدابیر امور کے لئے سعی کرنی چاہیئے
اس کے بعد اصلاح کا وقت آئے گا یعنی گھروں کی حفاظت کیجئے۔ جب
حفاظت کی طرف سے اطمینان ہو جائے، پھر اس کی دیکھ بھال کیجئے کہ در و دیوار
کا کیا حال ہے؟ سیدھی ہیں یا ٹیڑھی؟ خوشنما ہیں یا بدنما؟ یہ نہیں ہونا
چاہیئے کہ ابھی گھر تو باہر کے حملوں سے محفوظ ہوا نہیں اور دیواریں شروع
کر دیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ سخت غلطی اور بے دانشی ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ نہ تو
حفاظت ہو سکے گی جو مقدم ہے، نہ اصلاح ہی ہوگی جو مطلوب ہے۔ گزشتہ
صدیوں میں کتنے ہی مصلحین کی کوششیں رائگاں گئیں کہ اس اصل عظیم پر
نظر نہ تھی۔ یہ اصل فی الحقیقت حکمت شرعیہ اور اسوۂ حسنہ نبوت ہی کا ماخوذ
ہے، جیسا کہ اپنے مقام پر واضح ہوگا۔

مسئلہ اصلاح | ۵۔ مسلمانوں کی اندرونی اصلاح کے معاملے میں جیسا کہ قاعدہ ہے متعدد حلقے بن گئے ہیں۔ عوام کلیۃً مخالف ہیں اور ایک گروہ خواندہ اور علوم رسمیہ سے آشنا لوگوں کا بوجہ تقلید رسوم و تعلق مالوف ان کے ساتھ ہے اہل علم نفس اصلاح میں متفق ہیں لیکن تفصیلات میں اختلاف عظیم حائل ہے اور معاملہ اصلاح کے حقیقی مطالب و مہمات پر ہیچ۔ ایک جماعت قلیل مصلحین کے "قلیل من عبادی الشکور" خود عامہ اہل علم کی سعی نظر نہیں، حتیٰ کہ بعض کے نزدیک جو کام داخل اصلاح ہے، وہی دوسروں کے لئے داخل افساد ہے عام دماغی و عملی حالت امت کی یہ ہو رہی ہے کہ صدیوں سے علوم کتاب و سنت مہجور ہیں۔ خلافت صحیحہ مفقود ہے۔ علم و عمل حق کے قیام و نفاذ کے لئے کوئی مرکز موجود نہیں، جو خلاف و نزاع میں حاکم و سلطان ہو۔ ٹھیک ٹھیک غربت اولیٰ کی طرح غربت ثانیہ پیش آ گئی ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ اگر کسی ایک جماعت نے اپنے نقطۂ خیال سے اصلاح کا قدم اٹھایا تو تمام دوسری جماعتوں کو اختلاف ہو گا اور معاً اندرونی تفرقہ و انتشار کا فتنہ عظیم عین اس وقت جاگ اٹھے گا جبکہ حفظ بلاد اور دفع اعدا کیلئے عام اتحاد و ہم آہنگی مطلوب ہے۔ پس چاہیئے کہ تمام اصحاب عزم و عمل کی ہمت صرف ایک ہی کام میں مصروف رہے۔ دفع اعداء اور حفظ و استقلال بلاد۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے گا اور ایک مرکز ارشاد قائم ہو جائے گا تو پھر بغیر کسی نزاع و انتشار کے خود بخود اصلاح کا باب مسدود بھی کھل جائے گا۔ اس سے واضح ہوا کہ مندرجہ صدر مسلک صرف اس لئے ہی ضروری نہیں ہے کہ بلاد عربیہ کی حفاظت کا معاملہ درپیش ہے۔ بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اصلاح کا قیام و نفاذ بھی بغیر اس طریق عمل کے ممکن نہیں۔

مسلک کی بنیاد | خلافت کمیٹی نے یہ مسلک محض کسی وقتی مصلحت اندیشی کی بناء پر اختیار نہیں کیا تھا، اس کی بنیاد علم و یقین کو مضبوط بنیادوں پر رکھی۔ اس کے ارکان میں بعض ایسے اصحاب نظر موجود ہیں جنھوں نے گزشتہ پندرہ سال سے مسئلہ اصلاح اسلامی کے غوامض و حقائق کا بطور ایک موضوع علمی کے مطالعہ کیا ہے اور علم و بصیرت کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے لئے صحیح مسلک عمل یہی ہے

چنانچہ اسی مسلک کا نتیجہ ہے کہ اس کی کوششوں نے مسلمانانِ ہند میں متحدہ حرکت پیدا کی۔ ان تمام مذہبی جھگڑوں اور تفرقہ بندیوں کی لڑائیوں کا بازار سرد پڑ گیا جو ہمیشہ مسلمانوں کی آبادیوں میں گرم رہا کرتا تھا۔ اس کے کارکن حلقے میں ہر فرقے اور ہر مشرب کے مسلمان یکساں استحقاق کے ساتھ شریک ہوئے۔ سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد، وہابی، صوفی، متبع سلف و مقلد خلف سب کے لئے وہ مشترک میدان عمل تھی، البتہ اس میں کثرت سنی اور مقلد مسلمانوں کی رہی کیونکہ ملک میں کثرت بھی انہی کی ہے۔

(۳)

انہدام قباب | ابھی اس بحث میں نہ جاؤ کہ اس بارے میں شرعاً و عقلاً حکم کیا ہے؟ اگر مقابر و مشاہد پر عمارات بنانا ممنوع ہے تو جو عمارتیں بن چکی ہیں، انھیں فوراً گرا دینا چاہیئے یا نہیں؟ میں مضبوطی کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ نہیں گرانا چاہیئے، صرف وہاں کے رسوم غیر مشروعہ کا ازالہ کافی ہے۔ سردست صرف اس لحاظ سے غور کرو کہ جہاں تک خلافت کمیٹی کے مندرجہ صدر مسلک کا تعلق ہے، صورت حال کیا ہے؟

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ گنبد گرانے کا معاملہ اس کے مسلک کے صریح خلاف ہے وہ یقیناً اس سے متفق نہیں ہو سکتی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے مسلک کی صریح نفی ہے اس کے مسلک کی بنیاد اجتماع کلمہ پر ہے اور اس حادثہ کا نتیجہ اختلاف و نزاع ہے۔ وہ تمام مسلمانوں کو ایک مشترک مقصد کی طرف دعوت دیتی اور ان تمام باتوں کو ہٹانا چاہتی ہے جو آپس میں

مابہ النزاع ہو گئے ہیں، لیکن یہ معاملہ بالکل اس سے متضاد سمت پر چل کر ایک نزاع انگیز سوال چھیڑتا اور اس طرح مسلمانوں کی توجہ اور دلچسپی میں انتشار پیدا کرتا ہے۔

اصلاح سے پہلے تدبیر پس اس واقعہ کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ قطعی ہے کہ ہم اس سے متفق نہ تھے، نہ متفق ہو سکتے ہیں۔ امیر ابن سعود ہوں یا کوئی ہوں ہم گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے خاص نقطۂ خیال سے حجاز میں کوئی ایسی بات کریں جس سے وقت کے اصلی کام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا تجدید و احیائے امت کا کام غلط طریق عمل کی وجہ سے اور زیادہ دور جا پڑے۔ اگر وہ شرعی نقطۂ خیال سے اصلاح کرنی چاہتے ہیں تو سبحان اللہ، اس سے بڑھ کر عالم اسلامی کے لیے مژدۂ حیات بخش کیا ہو سکتا ہے۔ صدیوں سے امت مرحومہ کا مطلوب و مقصود و حید یہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا اعلان ہوگا کہ اس وقت حجاز اور بلاد عربیہ کو مصلح سے پہلے ایک مدبر کی ضرورت ہے۔ پہلے تدبیر امور کی منزل طے کیجیے، اس کے بعد اصلاح داخلی کا مرحلہ پیش آئے گا۔

مفاسد کی وسعت ابھی تو اس مرحلہ کے آثار و علائم بھی نمودار نہیں ہوئے پھر جب اصلاح کا صحیح وقت آ جائے تو ناگزیر ہے کہ اس کے لیے بھی کوئی خاص طریق عمل اختیار کیا جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اور تمام پہلوؤں سے قطع نظر کر کے صرف گنبدوں کے ڈھانے پر آ تر آئیں۔ کاش امت کے مفاسد کی عمارتیں صرف زمینوں اور آبادیوں ہی میں بنی ہوتیں اور انھیں ڈھا کر ہم فارغ البال ہو جاتے، لیکن انھوں نے تو دلوں اور روحوں میں اپنی بستیاں بسا لی ہیں اور جب تک وہ نہیں اجڑتیں۔ اینٹ اور چونے کی دیواریں گرا کر ہم کیا بنا لیں گے؟ یہ صرف ایک جماعت یا کسی محدود آبادی کی اصلاح کا معاملہ نہیں ہے ایک پوری امت کی اصلاح درپیش ہے جو کروڑوں افراد سے مرکب ہے، اور صدیوں سے مفاسد کے توارث و تعامل اور کاروبار علم و دعوت کی برہمی نے قلب ماہیت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہاں نہ صرف ایک ہی گوشے کے علم سے کام چل سکتا ہے۔ نہ صرف ایک ہی پہلو کا انہماک صحیح ہو سکتا ہے۔ وقت،

کے مفتی کے لئے اتنا کافی ہے کہ جواز و عدم جواز اور وجوب و عدم وجوب کے احکام کا عالم ہو، کیونکہ اسے صرف فتوے لکھنا ہے، لیکن عہد کے مصلح و مقوم کے لئے، صرف اتنا ہی کام نہیں ہے اسے لکھنا نہیں بلکہ نافذ و قائم کرنا ہے۔ اسے علم احکام سے کہیں زیادہ حکمتِ اعمال کے بھیدوں اور نکتوں کا راز محرم راز ہونا چاہیئے۔ وذالک من علم النبوۃ۔

ہزار نکتہ درین کار و بار دلداریست

کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاریست

گزشتہ قرنوں میں کتنی ہی اصلاح طلب تو تیں صرف اس لئے ضائع گیئں کہ طریق عمل کی حکمت، ترتیب کار کا قاعدہ "الاقدم فالاقدم" کی اصل عظیم اور رعایتِ احوال و ظروف کی اہمیت نظر انداز کر دی گئی اور یہ افسانہ طول طویل ہے:

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

صحت تشخیص اور اصابت رائے لیکن اب کہ یہ واقعہ وقوع میں آگیا ہے تو کیا کرنا چاہیئے؟ یہ کرنا چاہیئے کہ علم و فہم سے عاری ہو جائیں؟ انصاف و اعتدال کو خیرباد کہدیں؟ افراط و تفریط کے سیلاب میں بہنے لگیں؟ جوش و ہیجان میں دوست دشمن اور نفع نقصان کا امتیاز کھو دیں اور علم و بصیرت کی ان تمام روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں، جو شرع و عقل کی ہمارے سامنے موجود ہیں؟ یا یہ چاہیئے کہ علم و اعتدال کے ساتھ صورت حال پر نظر ڈالیں اور جو کچھ ہوا ہے اس کو اس کی اصلی مقدار اور نوعیت میں تول کر ایک باہوش انسان کی طرح صحیح و معتدل رائے قائم کریں؟ بہتر تھا کہ یہ معاملہ پیش نہ آتا۔ ہماری خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پیش نہ آئے۔ لیکن پیش آگیا۔ اب اگر ہم اسے واپس نہیں بھیج سکتے تو کم از کم اپنی عقل و بصیرت کو تو رخصت نہ کردیں۔

صحیح تشخیص کی ضرورت ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی چاہیئے کہ صحیح تشخیص کی جائے اور صحیح رائے قائم کی جائے۔ میں مطلق کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ لیکن لوگوں کو

صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حسب ذیل امور پر بیچے بعد دیگرے نظر ڈالیں:

۱ ۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ خلافت کمیٹی اور اس کے ارکان کا طرزِ عمل اس معاملہ میں اول وقت سے کیا رہا ہے؟ انھوں نے اس کے خلاف کوشش کی یا نہیں کی اور اگر کی تو وہ کافی تھی یا نہیں؟

یہ بات اس درجہ واضح اور آشکارا ہے کہ محتاج نظر نہ تھی، لیکن عوام کی ذہنیت کا کچھ عجیب حال ہے۔ ان کے لئے کوئی تشریح و تفصیل بھی غیر ضروری نہیں۔ حتیٰ کہ جو چیز نظروں کے سامنے موجود ہو، اس کے اثبات کے لئے بھی ضروری ہے کہ بار بار لوگوں کو بتلاتے رہیئے کہ یہ چیز تو سامنے موجود ہے۔

۲ ۔ خلافت کمیٹی اور اس کے ارکان نے اپنے مندرجۂ صدر مسلک کی بنا پر امیر ابن سعود سے جو نامہ و پیام کیا اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ وہ اس مسلک سے متفق ہیں یا مخالف؟ اگر متفق ہیں تو یہ واقعہ کیوں کر وقوع میں آیا اس کی مقدار اور کمیت کیا ہے؟ آئندہ کے لئے ہمیں مطمئن رہنا چاہیے یا مضطرب؟

۳ ۔ ہمیں اس معاملہ سے کتنا ہی اختلاف ہو لیکن بہرحال ہمارا فرض ہے تعصب و غلو، افراط و تفریط اور بغض و عناد سے خالی الذہن ہو کر معلوم کریں کہ جن لوگوں نے گنبد گرائے ہیں اس سے ان کا مقصود کیا ہے؟ اسلام کی توہین ہے یا اسلام کا اتباع؟ مقابر و مشاہد کی بے حرمتی ہے یا ان کی اصلاح؟ کیا یہ ان کی بربریت و وحشت کا ثبوت ہے یا ایک دینی حکم کی تعمیل کا مفرط جوش؟ نیت کو شرع اور قانون دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ مسجد دونوں حالتوں میں منہدم ہوتی ہے۔ دشمن اس لئے گراتا ہے کہ اسلام کی عبادت گاہ کی توہین کرے۔ متولی اس لئے گراتا ہے کہ اس عمارت کے نقائص

دور کرے۔ پہلی حالت زیر بحث آجاتی ہے، دوسری اصلاح۔ پس معلوم کرنا چاہیے کہ یہاں صورت حال کیا ہے؟ کچھ ضروری نہیں ہے کہ ان کا عمل آپکے نزدیک صحیح ہو، لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں ہے کہ آپ کے لئے ہر طرح کا غلو و تعصب اور اتہام و افترا جائز ہو جائے؟ زیادہ سے زیادہ الزام جو آپ انھیں دے سکتے ہیں یہی ہے کہ انکے عمل میں غلو و تشدد ہے۔ پھر کیا انصاف ہوگا کہ وہی غلو اور تشدد آپ اپنے اندر پیدا کرلیں؟

۴۔ فی الحقیقت اس مسئلہ میں احکام و دلائل کا کیا حال ہے؟ اور اگر رفع قباب اور تشیید مبانی کے خلاف نصوص موجود ہیں تو بہ حالت موجودہ صحیح و معتدل مسلک کیا ہونا چاہیئے۔

۵۔ حجاز کے مستقبل کا مسئلہ۔ اس کی حکمت عملی اور اس کا حل۔

(۴)

مرکزی خلافت کمیٹی کے مساعی یہ ظاہر و معلوم ہے کہ شریف حسین کا مفسدانہ قبضۂ حجاز اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بدترین تاریخی مصیبت تھا۔ حب الوطنی کے نقطۂ خیال سے اس کا اخراج ہر عرب کے لئے ایک قومی فرض تھا اور شرعی احکام کے رو سے تمام مسلمانان عالم پر فرض کفایہ تھا۔ تاہم مسلمانان ہند اور خلافت کمیٹی نے امیر ابن سعود سے التجائیں نہیں کیں کہ شریف حسین پر حملہ کردے اور جب اس نے خود بخود حملہ کیا تو شریف کے آگے ہاتھ نہیں جوڑے کہ نامردوں کی طرح بلا مقابلہ بھاگ جائے۔ جو کچھ پیش آیا وہ وہاں کی حالت کا قدرتی نتیجہ تھا۔ خود شریف حسین ہی کی بداعمالیاں اس کا باعث ہوئیں۔ زیادہ تر اس کا وہ ظالمانہ طرز عمل باعث ہوا جو نو سال سے اہل نجد کے خلاف عمل میں لا رہا تھا اور ان پر حج کا دروازہ بند کردیا تھا۔ جس کی بندش کے بعد مسلمانوں پر قتال واجب ہو جاتا ہے۔ البتہ خلافت کمیٹی کا فرض تھا کہ اس موقع پر اصلاح حال اور حفظ مصالح کے لئے جو کچھ کر سکتی تھی

اس میں کوتاہی نہ کرتی۔ اب فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اس نے ایسا کیا یا نہیں؟

امیر ابن سعود سے ربط و ضبط ہر انسان جس کا تعصب اس درجہ تک نہ پہنچا ہو کہ حقائق سے انکار پر آمادہ ہو جائے تسلیم کرے گا کہ خلافت کمیٹی نے حملہ طائف کی خبر سنتے ہی وہ سب کچھ کیا جو مسلمانان ہندوستان یا کوئی ایسی ہی جماعت موجودہ حالات میں کر سکتی تھی۔ اس نے نجد کے حملہ کی خبر سنتے ہی امیر ابن سعود کے نام پے در پے پیامات بھیجنا شروع کر دیئے جن میں جنگ و خونریزی کے امتناع اور تمام مقامات و مزارات حجاز کی حفاظت کیلئے صاف صاف لفظوں میں زور دیا گیا تھا۔ اس بارے میں کمیٹی کے دفتر کے ارکان نے اس قدر اہتمام و اصرار کیا کہ یہ بات بہت سے لوگوں پر گراں گزری۔ انھوں نے کہا کہ شریف حسین کا فتنہ و فساد مسلم ہے اس کا حجاز سے اخراج تمام مسلمانوں پر فرض کفایہ تھا۔ اب اگر ایک عرب امیر ادائے فرض قومی و اسلامی کے لئے آمادہ ہوا ہے تو اسے دو مسلمان جماعتوں کا باہمی قتال قرار دینا اور صلح بین الاخوین کی صدائیں بلند کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ تاہم کمیٹی اپنی سعی میں سرگرم رہی اور برابر اصرار و تاکید کرتی رہی۔ امیر ابن سعود کیجانب سے جو جوابات وصول ہوئے وہ مع کمیٹی کے پیامات کے بروقت مشتہر ہوتے رہے لڑائی کی نسبت امیر موصوف کا جواب تھا، کہ ذمہ داری ان پر نہیں ہے شریف پر ہے۔ مقدس مقامات کے حفظ و احترام کی نسبت جواب وہی تھا جو قدرتی طور پر مسلمان کا ہو سکتا ہے یعنی ان کا پورا احترام ملحوظ رہے گا۔ خلافت کمیٹی نے اس پر بھی قناعت نہیں کی۔ ایک وفد بھیجا کہ ابن سعود سے مل کر مستقبل حجاز پر گفت و شنید کرے اور اہل نجد کے طرز عمل اور قبضہ حجاز کے نتائج کا بچشم خود معائنہ کرے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جو قوت اس وفد کی تحقیق و معائنہ میں حائل ہوئی وہ ابن سعود کی نہ تھی جو بار بار دعوتیں دے رہا اور انتظام کر رہا تھا بلکہ امیر علی، اور اس کی مفسدانہ اور خود ساختہ حکومت جدہ کی تھی جس نے وفد کو آگے بڑھنے کا موقع دینے سے قطعی انکار کر دیا۔

موسم حج پھر جب حج کا موسم آیا تو امید بندھی کہ مسلمانانِ ہند کو مکہ جانے کا موقع مل سکے گا لیکن پھر امیر علی تمام عالم اسلام اور مکہ میں حائل ہوگیا اور موسم حج کی اتنی رعایت بھی اس سے ظاہر نہ ہوئی جتنی بطور اسلام سے قبل عرب جاہلیہ کیا کرتا تھا۔ یعنی لڑائی ملتوی کردی جایا کرتی تھی اور حاجیوں کے لئے تمام راستے کھل جاتے تھے۔ آج جو لوگ اس شور و شغب میں پیش پیش ہیں، یہی اس وقت التوائے حج کی کوشش میں پیش پیش تھے۔ لیکن ابن سعود نے دعوت حج کا اعلان کیا اور قنفذہ اور رابغ میں نئے انتظامات کیے۔ دوسری طرف خلافت کمیٹی نے حکومت ہند کو مجبور کیا کہ کمیٹی کی ذمہ داری پر حاجیوں کو جانے کا موقع دے۔ چنانچہ امیر علی کی تمام کوششیں ضائع گئیں اور بندر رابغ سے حجاج مکہ معظمہ پہنچے۔ اس طرح خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کو قبضۂ اہل نجد کے بعد پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنے نمائندے وہاں بھیجے۔ یہ نمائندے بطور وفد کے منتخب کر کے نہیں بھیجے گئے تھے۔ تنگیٔ وقت کی وجہ سے اس کا موقع نہ تھا۔ ان کی ترسیل سے مقصود یہ تھا کہ حاجیوں کی نگرانی و خدمت کریں اور وہاں کے حالات بھی دیکھ آئیں۔

نمائندوں کے مشاہدات ان نمائندوں نے وہاں جاکر جہاں امیر ابن سعود کے حسن انتظام و ادارت کے ہر طرف مناظر دیکھے وہاں یہ بات بھی دیکھی اور معلوم کی کہ بعض قبائل نجد نے داخلۂ مکہ کے بعض مقابر و مشاہد کے گنبد گرا دیے اور بعض کے بعض حصص عمارت منہدم کر دیے۔ انھوں نے اس بات پر پوری سرگرمی کے ساتھ اعتراض کیا اور آئندہ کے لئے اطمینان چاہا کہ ایسے واقعات ظہور میں نہ آئیں گے۔ امیر موصوف نے پوری کشادہ دلی اور آمادگی کے ساتھ اعتراضات سنے۔ حقیقت حال واضح کی اور آئندہ کے لئے وضاحت اور شوق کے ساتھ اطمینان دلایا (نمائندگان مجلس خلافت) اس پر بھی قانع نہ ہوئے۔ سرکاری اور تحریری اعلان پر زور دیا۔ اس پر امیر ابن سعود کا وہ مستقل اعلان اس کے سرکاری گزٹ ام القریٰ میں شائع ہوا جس کی نقلیں مع ترجمہ کے اردو اور انگریزی اخبارات میں بھی

شائع ہو چکی ہیں۔

یہ تمام واقعات پچھلے چند مہینوں کے عالم آشکارا حقائق ہیں۔

اہل نجد اور شریف حسین | اب سوال یہ ہے کہ اس سے زیادہ خلافت کمیٹی کے اختیار میں کیا تھا؟ یا اس سے زیادہ ہندوستان کی کوئی جماعت یا فرد کیا کر سکتا تھا؟ تھوڑی دیر کے لیے حقیقت حال بالکل منقلب کر دو۔ تسلیم کر لو کہ حجاز میں شریف حسین کا وجود اسلام کا شرف تھا۔ امت کی توقیر تھی، عدل و نظام کی پادشاہت تھی اور ابن سعود اور افواج نجد کا داخلہ فتنہ و فساد کا ازالہ نہ تھا۔ خود فتنہ و فساد القاد تھا، لیکن اس صورت میں بھی مبتلائے مسلمانان ہند اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے، جو خلافت کمیٹی نے کیا؟ جو لوگ آج شور و شغب مچا رہے ہیں، ان کے پاس بھی بجز شور و شغب کے اور کیا دھرا ہے، ان میں کون ہے جو اس کا عشر عشیر بھی کر سکے جو خلافت کمیٹی اس باب میں کر چکی؟ نجدیوں نے تو صرف یہ کیا کہ بعض غیر محقق مقابر و مشاہد کے گنبد عدم جواز کے اعتقاد اور اتباع شرع کے ہیجان میں گرا دیے۔ یہ زیادہ سے زیادہ احکام شرع کی تعمیل کا غلو ہے یا احوال و ظروف کی عدم رعایت ہے یا طرز عمل کی غلطی ہے، لیکن شریف حسین اور اس کا خاندان تو نو برس تک حرمین شریفین میں کھلے بندوں الحاد و ظلم کرتا رہا۔ اس نے عین حرم کعبہ کے اندر مسلمانوں کا خون بہایا۔ جس کی حرمت، گنبد کی طرح محتاج دلیل نہیں، بلکہ لا نزاع مسلم ہے اور جس کی بے احترامی کی زشتی دنا فرجامی بحث و گفتگو سے ماورا و ہی ولیس بعد الکفر ذنب۔ پھر مبتلائے مسلمانان ہند یا تمام مسلمانان عالم کیا کر سکے؟ وہ اتنا اطمینان بھی حاصل کر سکے جتنا آج اس معاملے کیلئے خلافت کمیٹی نے ابن سعود سے حاصل کر لیا ہے؟ کوئی ایک وعدہ، کوئی ایک اعلان، کوئی ایک اعتراف بھی تمام دنیا کے مسلمانوں نے مل کر شریف سے حاصل کیا؟

ایک فیصلہ کن مقابلہ | ہر طرح کی غلطی اور غلط فہمی برداشت کی جا سکتی ہے، لیکن جہل و تعصب کا کیا علاج ہے؟ جن گرفتاران جہل نے سمجھ بوجھ اور انصاف کے خلاف قسم کھائی ہو انھیں

کوئی سمجھائے تو کیوں کر؟ ہم علم و انصاف سے اپیل کر سکتے ہیں، لیکن علم و انصاف خلق نہیں کر سکتے۔ معاملات میں حجاز میں ہمارا سابقہ شریف حسین سے بھی رہ چکا ہے، اب امیر ابن سعود سے بھی درپیش ہے جو واقعات پیش آئے اور پیش آرہے ہیں، تمام دنیا پر آشکارا ہیں۔ جوش میں آنے اور لڑ مرنے کی کوئی بات نہیں، ٹھنڈے دل سے صرف اتنی بات پر غور کر لو کہ جہاں تک ہماری کوشش اور اس کی اثر پذیری کا تعلق ہے۔ ان دونوں زمانوں میں صورت حال کیا رہی ہے۔

شریف حسین | مقابلہ یوں ہوسکتا ہے کہ

۱. شریف حسین کے پاس کوئی اس کی قوت نہ تھی، صرف انگریزی حکومت کی خود غرضانہ اعانت اور آئندہ کے پُرفریب وعدوں پر جنھیں وہ اپنے جہل و بلادت سے معاہدہ سمجھتا رہا، اس کی ساری گرانیاں تھیں۔

۲. مرکز اسلام میں اس کا الحاد و ظلم اور فتنہ و فساد اس درجہ کا تھا کہ پوری تاریخ اسلام میں بہ حیثیت مجموعی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

۳. کامل نو سال تک نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام دنیا کے مسلمان اس سے بیزار رہے اور اس کی مخالفت و سرزنش میں ہم آہنگ۔

با ایں ہمہ کیا نتیجہ نکلا؟ اس کا جواب ہر شخص کو معلوم ہے اس نے ایک لمحہ کے لئے مسلمانانِ ہند یا کسی حصۂ عالم کے مسلمانوں کا اتنا حق بھی تسلیم نہیں کیا کہ اپنی خواہشیں اس کے اعمال کے خلاف پیش کریں۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک مرتبہ بھی اس میں کامیاب نہ ہوسکے کہ اس ظالمانہ و مستبدانہ اعمال کے خلاف کوئی احتجاج یا اعتراض تسلیم کرائیں یا کوئی وعدہ، کوئی اعتراف کسی کی بھی طمانیت دہی کا احساس حاصل کرسکیں۔ جب کبھی اس کے سامنے مسلمانانِ ہند و مصر کے اعتراضات کا ذکر ہوا تو بہ قول اس کے مشیر خاص محب الدین خطیب سابق ایڈیٹر "القبلہ" کے اس نے جواب دیا: ان کتوں کو ہمارے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟

دراصل اس کا تمام تر اعتماد انگریزی حکومت پر ہے۔ وہ ہمیشہ لندن کو اپنا کعبۂ آمال بنا کرتا تھا مسلمانان عالم کی نہ تو اسے پروا تھی، نہ ان کی رائے کو کوئی چیز سمجھتا تھا۔

امیر ابن سعود | لیکن برخلاف اس کے امیر عبدالعزیز ابن سعود:

۱۔ عرب کی سب سے بڑی مسلح فوج کا مالک ہے وہ بلا کسی خاص اہتمام کے میدان جنگ میں ایک لاکھ انسان ایسے لا سکتا ہے جن کی شجاعت اور بے جگری عرب کے صحراؤں میں ضرب المثل ہے اور جو جان دینا کھیل سمجھتے ہیں اس نے بزور شمشیر شریف کو فرار پر مجبور کیا اور حجاز پر قابض ہو گیا، اس لئے اسے باہر کی کسی اعانت کی احتیاج نہیں۔

۲۔ اس نے مرکز اسلام کو ایک ایسے فتنہ سے پاک کیا جس کا ازالہ تمام مسلمانان عالم پر فرض کفایہ تھا مگر وہ اپنی بے بسی کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

۳۔ اس کا داخلہ حجاز کے لئے امن و انتظام کی بشارت تھا۔ اس نے اپنی حیرت انگیز قوت تدبر و سیاست سے وہاں کی تمام روائتی بدامنیاں دور کر دیں۔ عرصہ کے بعد وہاں حجاج کو امن و عدالت کی صورت نظر آئی۔

یہ ایں ہمہ مسلمانان ہند کے غلبہ سے جاتے ہیں اندر اس کی فوج اور اس کے فرستادہ شریف خالد کی اس کارروائی پر اعتراض کرتے ہیں کہ بعض مقابر و مشاہد کے گنبد گرا دیئے گئے۔ ان عمارات محدثہ کے گرانے کے باب میں اگرچہ اس کے پاس دلائل شرع کا انبار ہے تاہم وہ مسلمانان ہند کے حق اعتراض کا اعتراف کرتا ہے۔ اعلان عام کرتا ہے اور ہر طرح اطمینان دلاتا ہے کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ظہور میں نہ آئے گا۔ اب خدارا انصاف کرو دونوں حالتوں میں سے کون سی حالت قابل اطمینان ہے؟ کیا فہم و انصاف کا اس قدر قحط ہو گیا کہ اتنی صاف اور قطعی بات بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گی؟ فما لھٰؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا [۱]

---

[۱] پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ہو یہ سمجھ بوجھ کے قریب بھی نہیں پھٹکتے (الجہاد)

میری اور امیر کی خط و کتابت | یہ تو وہ کوششیں ہیں جو کمیٹی نے بہ حیثیت کمیٹی کے انجام دیں، لیکن سخت افسوس ہے کہ اس پر بھی قانع نہیں ہوا۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے پیغامات میں بجز دعوت مجملہ کے مباحث و دلائل نہ تھے، نہ ہو سکتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ امیر ابن سعود شریف حسین نہیں ہے جو عربی زبان میں چار سطریں بھی صحیح و فصیح نہیں لکھ سکتا تھا۔ وہ علوم دینیہ خصوصاً کتاب و سنت سے باخبر ہے اس لئے جب تک دلائل و وجوہ شرعیہ بہ تفصیل نہ لکھے جائیں گے اس کی نظروں میں ہماری خواہشیں وقیع نہ ہوں گی۔ چنانچہ میں نے خط و کتابت شروع کی اور نہایت شرح و بسیط کے ساتھ وہ تمام مطالب و دلائل تحریر کئے جن سے خلافت کمیٹی کا ملحوظہ بالا مسلک ماخوذ ہے، نیز مسئلہ اصلاح اسلامی کی جو مہمات پیش نظر ہیں اور بعض جزئیات میں اہل نجد کا جو تشدد و قابل اصلاح ہے۔ ان سب کی حسب ضرورت وقت تشریح و تفصیل کی۔

دلائل و مباحث اپنے مقام پر بیان کئے جائیں گے۔ یہاں صرف اس قدر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مبادی و مقدمات کی شرح و تفصیل کے بعد خصوصیت کے ساتھ جن امور پر توجہ دلائی تھی ان میں سے دو باتیں حسب ذیل ہیں۔

مصلوں کا مسئلہ | ۱۔ نویں صدی ہجری میں فرج بن برقوق چرکسی سلطان کے حکم سے حرم شریف میں چار مذہبوں کے چار مصلے قائم کیے گئے اور ان پر الگ الگ جماعتیں ہونے لگیں۔ یہ رسم اب تک جاری ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ اس رسم سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور جس طرح سابق رواج چلا آتا ہے۔ چلنے دیا جائے۔ اگر بہ نیت دفع احداث و توحید جماعات اس میں تبدیلی کی گئی تو یہ بات جمہور پر، جو اس رسم سے مالوف ہو چکے ہیں۔ شاق گزرے گی اور ایک بے محل باہمی خلاف و نزاع ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اصلاح جو اس باب میں کی جا سکتی ہے یہ ہے کہ تعدد و تفریق جماعت کی وجہ سے بسا اوقات وہاں یہ صورت پیش آجاتی ہے کہ حنفی اپنی جماعت کے انتظار میں شافعی جماعت ترک کر دیتے ہیں۔ شافعی اپنی جماعت کے انتظار میں حنفی جماعت میں شریک نہیں ہوتے۔ اس سے حضور وجود جماعت کے ساتھ ترک جماعت

کا فساد پیدا ہو جاتا ہے، جس کے خلاف سخت وعید وارد ہے مثلاً صبح کی نماز کے افضل وقت میں اختلاف ہے۔ شوافع اور اصحاب حدیث غلس کو ترجیح دیتے ہیں، حنفیہ اسفار کو۔ اب وہاں یہ صورت پیش آتی ہے کہ صبح کی نماز شافعی مصلے پر بہت تڑکے قائم ہو جاتی ہے جنفی جماعت اس کے بعد ہوتی ہے۔ جو حنفی وہاں موجود ہوتے ہیں وہ قد قامت الصلوٰۃ کی صدا سنتے ہیں، مگر شریک نہیں ہوتے اپنی جماعت کا انتظار کرتے ہیں۔ ایسی ہی صورت دوسرے وقتوں میں شوافع وغیرہم کو پیش آتی ہے۔ پس بلا نزاع اس کی اصلاح ضروری ہے اس طرح کی ہدایت جاری کی جا سکتی ہے کہ جماعت ترک نہ کی جائے جس مسلمان کو جو جماعت تیار ملے اس میں شریک ہو جائے۔ مذاہب فقہیہ کا اختلاف حق و باطل کا اختلاف نہیں ہے اور خود علمائے مذاہب فیصلہ کر چکے ہیں کہ صلوٰۃ خلف مخالف کی بحثیں اور کاوشیں نہ صرف بے بنیاد اور ناقابل التفات ہیں، بلکہ ائمہ مذاہب کی تصریحات و عمل کے بھی صریح مخالف ہیں۔

مقابر و مشاہد کا معاملہ ۲۔ حجاز میں بہ کثرت مقابر و مشاہد ہیں، جن بزرگوں یا جن واقعات اور یادگاروں کی طرف وہ منسوب ہیں، ان میں سے بعض کی نسبت ثابت و صحیح ہے بعض کی مشتبہ ہے بعض کے بے اصل ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ تاہم شہرت عوام نے انہیں مقبولیت دے دی ہے۔ ان پر اسی طرح عمارتیں بنا دی گئی ہیں جس طرح دیگر بلاد اسلامیہ میں بزرگوں کی قبروں اور یادگاروں پر بنانے کا رواج پڑ گیا ہے۔ نیز بہ حیثیت ایک زیارت گاہ کے وہاں وہ تمام رسمیں اور طریقے بھی جاری ہیں، جو اور جگہوں میں بھی جاری ہو گئے ہیں نہایت ضروری ہے، ان کی نسبت کمال احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ ان کی عمارتوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ اگر ان مقامات سے یا ان میں سے کسی ایک مقام سے بوجہ عدم صحت انتساب یا عمارت علی القبور یا ان کے طریق استعمال کی عدم مشروعیت و ابتداع کی وجہ سے تعرض کیا گیا تو یہ بات بھی نزاع و خلاف کا ذریعہ بن جائے گی اور اصل مقصود میں خلل واقع ہوگا۔ یہ وقت نہ تو تاریخی تحقیقات کا ہے نہ اعمال و رسوم شائعہ کے جواز و عدم جواز کے فیصلے کا۔ پہلا اور اولی

کام یہ ہے کہ سرزمین حجاز مفسدین کے تسلط اور اغیار و اجانب کے اقتدار سے پاک ہو جائے اور وہاں اسلام کے علم و عمل کا ایک صحیح مرکز قائم ہو سکے۔ سارے مفاسد و مصالح کسی ایسے مرکز کے قیام پر موقوف ہیں۔ سعی جڑ کی درستگی سے شروع ہونی چاہیے نہ کہ شاخ اور پتوں کی قطع و برید سے۔ آپ اس کام کے لئے اٹھے ہیں اور تمام مسلمانانِ عالم اس میں آپ کے ساتھ ہیں۔ پس صرف اسی پر ساری توجہ اور ہمت مصروف رکھی جائے اور کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے اجتماعِ کلمہ میں انتشار ہو۔

(۵)

امیر اور علمائے نجد امیر ابن سعود، ان کے فرزند اور بعض اکابر علمائے نجد کی جانب سے وقتاً فوقتاً جو جوابات موصول ہوئے ان میں نہ صرف ان مطالب و اصول سے اتفاق ظاہر کیا تھا، بلکہ ایسی تصریحات موجود تھیں جن سے صاف مترشح تھا کہ اجتماع کلمہ کی ضرورت، احوال و ظروف کی رعایت، مقتضیاتِ وقت کا اعتبار اور تسامح و درگزر کے مسلک کی اہمیت خود ان کے بھی پیش نظر ہے، اور پوری طرح اس پر کاربند ہونے کا عزم کر چکے ہیں۔

اس سلسلے میں حملۂ طائف کے اسباب و بواعث اور شریف خالد بن لوی کی عاجلانہ سرگرمیوں کی مدد اد بھی معلوم ہوئی۔ یہ بات بھی اول اول انہی خطوط سے معلوم ہوئی کہ طائف کا فوری سقوط اور مکۂ معظمہ کا داخلہ بالکل خلاف توقع طور پر پیش آیا۔ خود امیر ابن سعود بھی اس پر متعجب ہیں۔

اتفاق رائے کا عملی ثبوت! کیا امیر ابن سعود کے یہ اظہارات محض زبانی اظہارات تھے یا فی الحقیقت اس کا مسلک بھی یہی ہے اور وہ جو کہتا ہے، اسی کے مطابق عمل بھی کرتا ہے؟ اس بات کا صحیح اور اطمینان بخش اندازہ اس واقعہ سے کرنا چاہیے کہ مکۂ معظمہ میں پہنچنے اور وہاں کے انتظامات براہ راست اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد اس کا طرزِ عمل کیا رہا ہے؟ اور اس باب میں نہ صرف اس کے دوستوں بلکہ دشمنوں کے بیانات کیا ہیں۔

امیر موصوف کے داخلۂ مکہ پر کافی زمانہ گزر چکا، لیکن اس وقت تک کسی بشر نے یہ

شکایت نہیں کی کہ حرم شریف کے چار مصلوں اور چار جماعتوں کی رسم میں کسی طرح کی تبدیلی کی گئی ہو۔ ان کے اشد شدید مخالفین بھی اس بارے میں کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ حج کے موقع پر ہندستان سے سیکڑوں حاجی گئے اور واپس آئے۔ سب متفق ہیں کہ یہ دستور قدیم بدستور باقی و جاری ہے۔ خود ابن سعود اور اہل نجد حنبلی مصلے پر نماز پڑھتے ہیں۔ باقی اہل مذاہب اپنے اپنے مصلوں پر۔ ہر صاحب علم و نظر جو اس معاملے کی اہمیت سے بے خبر نہیں ہے، اس کا اعتراف کرے گا کہ امیر موصوف نے اس معاملے کو اس کی سابقہ حالت پر چھوڑ کر تسامح اور مصلحت اندیشی کا جو ثبوت دیا ہے وہ اس درجہ واضح اور قطعی ہے کہ اس سے زیادہ ان کی جانب سے کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

عہد نبوت اور صحابہ کرام | سب جانتے ہیں کہ اہل نجد طریق سلف کے متبع ہیں، اس لئے دین کی ان تمام نئی چیزوں کو پسندیدہ نہیں سمجھتے جو قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر یعنی عہد نبوت و صحابہ و تابعین کے بعد نکلیں اور پھیلیں۔ یہ اوپر گزر چکا ہے کہ حرم شریف میں ابتدا سے تمام مسجدوں کی طرح ایک ہی مصلیٰ تھا اور ایک ہی جماعت ہوتی تھی۔ صدیوں تک تو حنفی، شافعی، مالکی و حنبلی کا التزام و تعین ہی نہ تھا۔ جب یہ شروع ہوا تو پھر بھی جماعتیں الگ الگ نہ ہوئیں۔ ایک ہی امام کے پیچھے سب نماز ادا کرتے تھے۔ جب ساتویں صدی میں خلافت عربیہ بالکل مٹ گئی اور بلاد عربیہ کی حکومت مصر کے نومسلم غلاموں کے قبضہ میں آئی تو مختلف اسباب سے جن کے بیان کا یہ موقع نہیں، نئے نئے ڈھنگ اور نئے نئے طور طریقے نکلنے اور پھیلنے لگے۔

قاضی اور مفتی | ازانجملہ یہ بات ہوئی کہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے مذاہب اربعہ کی تفریق بطور چار الگ الگ مستقل جماعتوں کے ٹھہرائی گئی۔ چاروں کے لئے الگ الگ مفتی اور قاضی قرار پائے، الگ الگ عدالتیں بنیں۔ تمام مذہبی عہدوں میں اس کا التزام جاری ہوا، حتیٰ کہ مدرسوں، تکیوں میں، مسافر خانوں میں، خیراتی اوقاف و وظائف میں، غرضکہ ہر چیز میں اس تفریق نے رواج پایا۔ قاضی سبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ ملک ظاہر بیبرس نے الگ الگ

مذہبوں کے قاضی مقرر کئے اور اس باب میں یہ پہلی بات ہے جو ظہور میں آئی۔ چنانچہ یہی چیز ہے جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی کہ نویں صدی میں فرق بن برقوق چرکسی نے (جو بقول حافظ سخاوی اشر سلاطین اسلام تھا) حرم شریف میں بھی چار مصلے اور جماعتیں احداث کیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس عہد میں جو علما تھے یا اس کے بعد جو علمائے محققین ہوئے، ان میں سے ایک جماعت کثیرہ اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ چنانچہ حافظ سخاوی، ابو صالح مقبلی، محمد بن سالم البصری محمد سفارینی، شیخ ابراہیم کردی، سید عبدالقادر کوکبانی، علامہ فلانی صاحب ایقاظ الہمم، امیر محمد بن اسماعیل یمانی، شیخ محمد حیات سندی، سید محمد مرتضیٰ بلگرامی زبیدی شارح احیاء العلوم شیخ محمد فاخر زائر الٰہ آبادی، قاضی شوکانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ عبدالعزیز وغیرہم کی مصنفات سے ظاہر ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اب سے ایک صدی پہلے جب اہل نجد نے حجاز پر قبضہ کیا تھا تو چار جماعتیں بند کر کے صرف ایک مصلیٰ اور جماعت قرار دی تھی۔

<u>الغائے عناد و اجتماع کلمہ</u> یہ ایں ہمہ سب متفق ہیں کہ امیر ابن سعود نے اس معاملہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس سے دو باتیں قطعی طور پر واضح ہو گئیں۔ اول یہ کہ انھوں نے مکہ معظمہ پہنچنے سے پہلے اپنے خطوط میں جو وعدے کئے تھے، انھیں حرف بہ حرف پورا کیا۔ ثانیہ یہ کہ اجتماع کلمہ اور ترک ما بہ النزاع کی اصل عظیم پر ان کی پوری طرح نظر ہے۔ وہ اس کے تحفظ کے لئے اپنا مسلک و مشرب بھی نظر انداز کر دینے کے لئے طیار رہیں، اگرچہ وہ ان کی تعبیرات میں کتنا ہی قوی و اصلح اور اقرب الی الصواب ہو۔

اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اس قوت و صولت کے ساتھ جو ابن سعود کو حاصل ہے، کونسی وجہ ہو کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے جھوٹے وعدے کرے یا ان کی خوشامد و چاپلوسی کے لئے اپنا مسلک عمل چھپائے؟ شریف حسین اپنی تمام بے باکیوں اور نامرادیوں کے ساتھ بھی مجبور نہ ہوا کہ مسلمانان ہند کی پرواہ کرے۔ تو امیر ابن سعود اپنی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ساتھ کیوں مجبور و احتیاج مند ہو سکتا ہے؟ حقیقت حال یہ ہے کہ وہ خود ایک وسیع الخیال اور

ظروف و احوال کا اندازہ شناس انسان ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ وقت کا اصلی سوال کیا ہے؟ اور اس کے تمام اختلافات و نزاعات سے بچنا کس قدر ضروری ہے وہ نہیں چاہتا کہ دنیائے اسلام کی رائے عامہ اس کے خلاف ہو یا تسامح و وسیع النظری کی جگہ غلو و تعصب میں مشہور آفاق ہو۔ گذشتہ سال جب تمام شیوخ قبائل نے حملۂ حجاز پر اصرار کیا تھا تو اس نے اپنی تقریر میں کہا تھا: ایک صدی سے دنیا خصوصاً مسلمانانِ عالم ہماری نسبت طرح طرح کی بے اصل بدگمانیوں میں مبتلا ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے طرز عمل سے انھیں بتلا دیں کہ ان کی بدگمانیاں کس قدر غلط تھیں، لیکن یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی تلوار کی طاقت سے نہیں بلکہ طرز عمل کی خوبی سے مسلمانان عالم کی توجہ حاصل کریں۔

ہدم قباب کیوں کر ہوا؟ لیکن باوجود اس کے گنبدوں کے گرانے کا واقعہ کیوں ہوا؟ جس طرح حرم شریف کے چار مصلوں کے معاملہ میں دست اندازی نہیں کی گئی، ضروری تھا کہ اس میں بھی نہ ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے لیکن واقعات نے بلا کسی پیچیدگی کے واضح کر دیا ہے کہ یہ واقعہ امیر ابن سعود کے حکم و علم سے وقوع میں نہیں آیا۔ یہ قطعی معلوم ہے کہ وہ فتح طائف و داخلۂ مکہ کے بہت بعد مکہ پہنچے۔ اگر وہ بروقت معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکتے تو اس نزاع کے چھڑنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

امیر خالد بن لوئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شریف حسین کی ناگفتہ بہ اعمالیوں کی وجہ سے بعض اس کے اقارب ترک حجاز پر مجبور ہوئے۔ منجملہ ان کے شریف خالد بن لوئی ہے، جو مکہ سے پوشیدہ نکل کر نجد پہنچا اور شریف حسین پر حملہ کرنے کی ابن سعود کو ترغیب دینے لگا۔ شریف حسین کے خلاف اس کا جوش و اضطراب اتنا سخت و تیز تھا کہ جب اس نے امیر کو متامل پایا تو براہ راست قبائل نجد میں تحریک شروع کر دی۔ بہرحال جب ابن سعود نے دیکھا کہ اب مزید تاخیر قرین مصلحت نہیں تو اس نے چند قبائل خالد کے ساتھ کر کے طائف روانہ کر دیے اور اس سے شرط کر لی کہ ہر حال میں صلح و جنگ کا اختیار ابن سعود کے ہاتھ میں

ہوگا. شریف حسین نے بے شمار روپیہ اور ہتھیار اثنائے جنگ میں ترکوں سے حاصل کیے تھے پھر بغاوت کر کے انگریزی حکومت سے بھی مال و اسلحہ حاصل کیا . اس کے علاوہ آٹھ نو سال تک حاجیوں اور حجاز کے مظلوم باشندوں کو بے دریغ لوٹتا رہا . ان حالات میں قدرتی تھا کہ اس کی طاقت اور سر و سامانِ جنگ کی نسبت توقعات پیدا ہوتیں . عام خیال تھا کہ زیادہ نہیں تو چند مہینوں تک تو مقابلہ کرنے اور پامردی دکھانے کی استعداد ضرور رکھتا ہے .
خود امیر ابن سعود اور اہل نجد کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ بعض قبائل نجد کی جو ٹکڑیاں خالد کی سرکردگی میں بطور مقدمۃ الجیش بھیج دی گئی ہیں ، یہ پہنچتے ہی میدان سر کر لیں گی اور بلا کسی مقابلہ اور زد و خورد کے نہ صرف طائف بلکہ حجاز فتح ہو جائے گا خیال یہی تھا کہ خالد کی مہم جنگ شروع کر دے گی . مقابلہ و حصار جاری رہے گا . اسی اثنا میں ممکن ہے اس دباؤ سے عاجز آکر شریف حسین آمادۂ صلح ہو جائے اور آئندہ کے لئے اپنی بداعمالیوں سے باز آ جائے یا آگے چل کر کوئی فیصلہ کن معرکہ سر کرنا پڑے .

شریف حسین اور امیر علی ترتیب یہ اختیار کی گئی تھی کہ ایک ماہ کے بعد دوسری فوج روانہ کی جائے گی . اس کے بعد خود ابن سعود حرکت کریں گے لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا نجدیوں کے حملہ کی محدود خبر ہی نے نو سال کے تخت غرور و طغیان کا آخری فیصلہ کر دیا . فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِہَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِہَا خُسْرًا[ف] امیر علی بغیر اس کے کہ ایک دن بھی حملہ آوروں کا مقابلہ کرے دیوانہ وار مکہ کی طرف بھاگا . ادھر شریف حسین نے اپنی گنتیاں سنبھالنی شروع کر دیں . خالد بن لوئی بغیر کسی مقاومت کے طائف میں داخل ہو گیا . اس کے بعد مکہ تک کی راہ بالکل صاف اور بے روک تھی .

اس غیر متوقع اور اچانک صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبل اس کے ابن سعود کو سقوط طائف و مکہ کی خبر بھی پہنچے ، خالد بن لوئی مکہ میں داخل ہو گیا اور اگرچہ بالاتفاق مکہ

ف پس چکھ لیے اپنے کام کی سزا چکھی اور اس کے کام کا انجام گھاٹا (دیکھو از الطلاق)

کا داخلہ کامل امن و نظم کا داخلہ تھا تاہم بعض مقابر و مشاہد کی عمارتوں کے لیے پیش نظر مصالح
بروئے کار نہ آسکے اور شریف خالد کی سرکردگی میں قبائل نجد نے ان کے گنبد گرا دیے۔
یہ ہے مختصراً اصل حقیقت۔ ہمارے نمائندے حج کے موقع پر گئے: خود امیر
سے ملے، ان کے اعیان حکومت خصوصاً گورنر مکہ سے ملے۔ وہاں موافق و مخالف اہالی سے
ملاقاتیں کیں یہ لوگ مقابر و مشاہد کے معاملہ میں اہل نجد کے ہم مشرب نہیں ہیں، انکے مخالف
ہیں۔ تاہم جو اثرات اپنے ساتھ لائے ان سے بھی یہ بات صاف صاف واضح ہوتی ہے کہ اگر
یہ غیر متوقع اور اچانک صورت حال پیش نہ آجاتی اور امیر ابن سعود کو موقع پر موجود ہونے کا موقع
ملتا تو ضرور اس طرح کے واقعات کی روک تھام کر دی جاتی۔

موجودہ حالات | وہاں کے حالات کو دنیا کے موجودہ حالات پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔
حجاز اور نجد کا فاصلہ اگرچہ کوئی بہت ٹھا فاصلہ نہیں، لیکن تار اور ریل کے نہ ہونے کی وجہ سے
وہ ناقہ سوار کے رحم پر ہے نہیں معلوم سقوط طائف کی خبر کتنے ہفتوں کے بعد ریاض پہنچی ہوگی
اتنے عرصہ میں یہاں شریف مکہ میں داخل بھی ہو گیا اور تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔
اس سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ موافق و مخالف دونوں ذرائع سے جو معلومات
حاصل ہوئی ہیں۔ ان سے متحقق ہو گیا ہے کہ:

۱۔ امیر ابن سعود نے حجاز پہنچتے ہی شریف خالد کی غلطیاں محسوس کیں اور بہ لطائف الحیل اسے حجاز سے باہر بھیج دیا۔

۲۔ جو قبائل شریف خالد کے ہمراہ حجاز آئے تھے انھیں بھی حج کے بعد ہی نجد روانہ کر دیا اور دوسری جماعتیں وہاں طلب کیں۔

۳۔ یہ قطعی ہے کہ جس وقت سے امیر حجاز پہنچ گئے ہیں۔ ایک واقعہ بھی اس قسم کا نہیں ہونے پایا ہے، حالانکہ خود مکہ معظمہ میں بعض مشاہد کی عمارتیں سابق حالت پر موجود ہیں اور اطراف میں بکثرت متعدد مقامات ایسے ہیں جو امیر موصوف کے زیر انتظام آچکے ہیں، انکی تفصیل آگے آئے گی۔

مقابر و آثار پر عمارات

اتباع سنت اور جوشِ تشبہ

یہ طویل مضمون بھی مولاناؒ کا ہے، اگرچہ ان کے نام سے نہیں بلکہ دوسرے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کا ہے جب اہل نجد حجاز پر قابض ہوئے تھے اور انھوں نے طائف نیز مکہ معظمہ میں مختلف مقابر و آثار کی عمارتیں منہدم کرا دی تھیں۔ اس پر پاک و ہند کے مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ اس انہدام پر سخت رنجیدہ تھا اور اس نے اہل نجد کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ جو کچھ ہوا، وہ عین مطابق کتاب و سنت تھا اور اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے حلقوں کے علاوہ فرنگی محل سے بھی چند مضامین گروہ اول کی حمایت میں شائع ہوئے تھے، بلکہ زیادہ تر انھیں مضامین کو جا بجا پیش کیا جاتا تھا۔ مولاناؒ نے انھیں مضامین پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے شریعت کے بعض اہم اصول و مبانی اور متعلقات واضح فرمائے تھے۔ میرے محدود علم کے مطابق ان مباحث کی کوئی مثال اردو یا کسی دوسری زبان میں موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نظر انداز کرنا گوارا نہ ہوا، اگرچہ اس کے بعض حصوں کے اسلوبِ خطاب میں مولاناؒ کے عام اسلوب سے پوری مطابقت نہ تھی۔ میں نے بعض فقروں یا الفاظ کو حذف کر کے ان کی جگہ نقطے لگا دیے۔ جن سے اصل مطالب پر کوئی اثر نہیں پڑا اور مقصود وہ کد و کاوش تھی جو کسی گروہ میں پیدا ہو گئی تھی ... صرف اصولی و بنیادی مباحث کو محفوظ کر دینا منظور تھا، جن کی اہمیت کسی تصریح کی محتاج نہیں۔

(۱)

ایک تحریر مولوی عنایت اللہ صاحب پرنسپل مدرسہ نظامیہ فرنگی محل، لکھنوی اخبار ہمدم
میں بعنوان آثار متبرکہ کی شرعی حیثیت شائع ہوئی تھی۔ یہ دراصل اس تحریر کے جواب میں
لکھی گئی تھی جو اس موضوع پر خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے لکھی تھی اور "ہمدرد" دہلی میں شائع
ہوئی تھی۔ آخرالذکر تحریر میری نظر سے نہیں گزری اس لئے اس کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتا۔
لیکن مقابر و آثار پر عمارات بنانے، گنبد بلند کرنے اور انہیں ایک اسلامی زیارت گاہ کی
حیثیت دینے کے جواز و مشروعیت میں جو دلائل پرنسپل صاحب نے بیان کیے ہیں
وہ نہ صرف کمزور اور ناقابل اعتصام ہیں، بلکہ اس درجہ غلط، بے بنیاد، بے اصل اور نافہمی و کج اندیشی پر
مبنی ہیں کہ کسی اہل علم سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ علاوہ بریں تحریر اول سے آخر تک طرح
طرح کی علمی، فقہی، تاریخی اور اصول و قواعد علوم کی فاش غلطیوں کا مجموعہ ہے۔ صاف نظر
آتا ہے کہ پرنسپل صاحب اس کوچہ سے نابلد ہیں اور یہ منجملہ وقت کی آفتوں کے ہے کہ ایسے
حضرات مسائل دینیہ پر بے دھڑک قلم اٹھائیں۔

فرنگی محل کی تحریرات

اہل علم کے لئے یہ تحریر ناقابل التفات تھی۔ اس طرح کی بے شمار تحریریں آج کل اخبارات
میں نکلتی رہتی ہیں لیکن اہل علم صرف انہی حضرات کو مخاطب کر سکتے ہیں، جنہوں نے اصول
قواعد مقررۂ علوم کے مطابق قلم اٹھایا ہو اور کم از کم ان کی تحریر سے یہ پتا چلتا ہو کہ اس وادی
کے رہ و راہ سے ناآشنا نہیں ہیں۔ . . . .

. . . . یہ نہیں کہ جس تحریر میں عربی کی چند ترکیبیں یا چند کتابوں
کی عبارتیں کسی نہ کسی طرح جمع کر دی گئی ہوں ان کے رد و جواب میں وقت ضائع کیا جائے۔ اگر
ایسا کیا جائے تو علم و قواعد علم پر سے اذن اٹھ جائے اور علم و ادعائے علم میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

ن کے بعد ایک تحریر خود جناب مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کی اخبار ... میں
بحوالہ "ہمدم" شائع ہوئی۔ یہ دراصل ایک خط ہے جو مولانا محمد علی صاحب کے نام لکھا گیا ہے
اس میں مولانا عبدالباری صاحب جا بجا پرنسپل صاحب کے مضمون پر توجہ دلاتے ہیں اور
اس طرح حوالہ دیتے ہیں گویا اس باب میں استدلال و اثبات کی انتہا اور علم و تحقیق کا کمال ہے۔
اس سے یہ بات متحقق ہوگئی کہ پرنسپل صاحب کا مضمون اگرچہ ان کے قلم سے مرتب ہوا لیکن
دراصل وہ خود مولانا عبدالباری صاحب کے دلائل و مباحث کا خلاصہ ہے۔

اصل مقصد

یہ تحریر بھی اہل علم کی نظر سے گزری، لیکن چونکہ خیر سے اس کے عالمانہ خصائص بھی
پرنسپل صاحب کے مضمون سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ بہ اعتبار تفاضل مدارج ایک درجہ
اور زیادہ تھے اس لئے رد و جواب کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی۔

لیکن اب لکھنؤ کے بعض احباب کے خطوط سے معلوم ہوا کہ مولانا ممدوح کے بعض
معتقدین یہ دونوں تحریریں جا بجا دکھاتے اور سناتے پھرتے ہیں اور عوام کو یقین دلاتے
ہیں کہ ان کے دلائل و براہین کا جواب ممکن نہیں اور ان میں عمارت علی القبور و الآثار کا نہ صرف
جواز بلکہ استحسان ثابت کر دیا گیا ہے۔ اس حالت کے استماع سے خیال ہوا کہ اگر ان تحریروں
کی حقیقت حال سے لوگوں کو واقف نہ کر دیا گیا تو ممکن ہے عوام بہ وجہ شیوع جہل و فقدان امتیاز
غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں اور عربی کی چند عبارتیں اور کتابوں کے نام اور جا بجا مثبت و منفی
دعووں کی تکرار نعرہ و شور دیکھ کر خیال کر لیں کہ سچ مچ کو دلائل و براہین شرعیہ پیش
کر دیے گئے۔ اس لئے بادل ناخواستہ سطور ذیل حوالۂ قلم کرنا پڑے۔

حافظ ابن کثیر و علامہ آلوسی

خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی نے ایک آیت کریمہ کی نسبت حافظ عماد الدین ابن کثیر اور علامہ آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی کے اقوال نقل کیے تھے۔ مدرسۂ فرنگی محل کے پرنسپل صاحب کو چونکہ دیگر علوم کی طرح ماشاء اللہ تاریخ و رجال میں بھی کافی دسترس ہے اس لیے لکھتے ہیں "حافظ ابن کثیر ایک غیر مشہور حنبلی عالم ہیں اور کون نہیں جانتا کہ آلوسی اور نواب صدیق حسن اس قدر ہم خیال تھے کہ آلوسی کی تفسیر نواب صاحب ہی نے طبع کرائی۔ آلوسی کی عبارتوں سے احتجاج ایسا ہی ہے کہ خود ابن عبدالوہاب کے اقوال سے احتجاج کیا جائے۔

ان دونوں راویوں کے اظہار سے مقصود یہ ہے کہ ذرا انصاف خیال کریں، ابن کثیر ایک "غیر مشہور حنبلی" ہیں اور علامہ آلوسی نواب صدیق حسن خان مرحوم کے ہم خیال ہیں اس لئے نواب صاحب کی طرح وہابی ہیں[1] پس پہلا بوجہ عدم شہرت و حنبلیت نا قابلِ اعتبار اور دوسرا بوجہ ہم خیالی صدیق حسن خاں بجرم وہابیت گردن زدنی، اسلئے ایسے لوگوں کے اقوال

---

[1] پرنسپل صاحب کے اصل الفاظ یہ تھے: ابن کثیر اور رجال کے علامہ آلوسی کی عبارتیں قرآن کا مقابلہ کرنے کیلئے کافی نہیں ہوسکتیں اور بقول مولانا محمد علی کے قرآن کا مقابلہ تو حدیث متواتر بھی نہیں کر سکتی چہ جائیکہ مفسرین کی عبارتیں وہ بھی ایک غیر مشہور حنبلی کے اقوال خواجہ عبدالحی نے لکھا تھا کہ قرآن پاک میں تیموں کے احکام موجود نہیں جس ایک آیت سے جواز نکالا جاتا ہے وہ بقول ابن کثیر و آلوسی لائق احتجاج نہیں، یہ ارشاد خواجہ صاحب کی اسی تحریر کے متعلق ہے اسکے علاوہ آلوسی کی عبارتوں سے احتجاج ایسا ہے کہ خود ابن عبدالوہاب کے اقوال سے احتجاج کیا جائے۔ کون نہیں جانتا کہ آلوسی اور نواب صدیق حسن خاں اس قدر ہم خیال تھے کہ آلوسی کی تفسیر نواب صاحب مرحوم نے طبع کرائی۔ آلوسی زیادہ نواب صاحب مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے متعلق عجائب ان کے اقوال سے استناد بلا کسی دلیل کے کیسے لائق اعتبار ہوسکتا ہے۔

(رسالہ الہدایہ صتا)

کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔

لیکن پرنسپل صاحب جیسے مدعیانِ علم کی بدقسمتی یا بدقسمتی ہے کہ ابھی علم و نظر ہندوستان نایاب نہیں ہو گیا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ حافظ عماد الدین ابن کثیر بجز فرنگی محل اور اس کے درسِ نظامیہ کے اور تمام حلقہ ہائے علم وغیرہ میں مشہور و معروف ہیں اور آٹھویں صدی ہجری کے اعاظم رجالِ علم و تصنیف میں شمار کیے گئے ہیں۔ تاریخ رجال کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ امام ذہبی، امام ابن دقیق العید وغیرہم کے طبقہ کے مشہور اور مسلّم امام ہیں۔ علاوہ بریں انھیں حنبلی قرار دینا ظلمات بعضہا فوق بعض ہے۔ وہ حنبلی نہیں بلکہ شافعی ہیں۔ حافظ ابوالحجاج مزی صاحب تہذیب کا نام اگر پرنسپل صاحب نے سنا ہو تو یہ ان کے داماد اور شاگرد تھے اور حافظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری کے استادوں میں ہیں۔ جن کی عبارت سے خود پرنسپل صاحب نے استناد کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے انکا ترجمہ اپنے معجم شیوخ میں بھی لکھا ہے اور "درر کامنہ" میں بھی درج کیا ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ "یہ وقت کے شیخ اور علم و تصنیف کے استاد تھے ان کی تاریخ "البدایہ والنہایہ" کی تمام ائمہ معاصرین نے تعریف کی ہے اور ان کی تفسیر سے بہتر کوئی تفسیر بالحدیث متاخرین نے نہیں لکھی۔ ان کی ایک کتاب اصولِ حدیث میں الباعث ہے۔ حافظ موصوف نے اس کی سند ان سے لی ہے اور لکھتے ہیں" یہ حافظ ابن صلاح کے مقدمہ سے زیادہ جامع و انفع ہے بہتعلقات دانۂ فن نے اس کی توثیق کی ہے" درر کامنہ" کا ایک نسخہ مولانا ناصر حسین صاحب مجتہد لکھنؤ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اگر وادیٔ علم و نظر تک رسائی ممکن ہو تو پرنسپل صاحب مطالعہ کر لیں۔ اگر ایسے امام تفسیر و حدیث کو بھی یہ شرف حاصل نہ ہو سکا کہ فرنگی محل کے علماء اس کی شہرتِ علم سے باخبر ہوں تو میں امید کرتا ہوں یہ اس کی بدقسمتی نہیں ہے۔

حنبلیت اور ولایت

یہ تو پرنسپل صاحب کی تاریخی واقفیت کا حال ہے۔ اب اس پر غور

کرنا چاہیے کہ ابن کثیر کی غیر معروفیت کے ساتھ حنبلیت پر کیوں نہ مبیا گیا ہے؟ کیا ان کے نزدیک مجہول الحال ہونے کی طرح حنبلی ہونا بھی کوئی جرم اور وجہ تضعیف نہیں ہے؟ حضرات فرنگی محل سے امام اہل سنت امام احمد بن حنبل اور ان کے ہزارہا متبعین ائمہ کی نسبت سوال کرنا تو بیکار ہوگا، لیکن یہ پوچھنا چاہیئے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ یعنی پیران پیر صاحب کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے؟ وہ تو صرف حنبلی ہی نہ تھے، بلکہ یہاں تک حنبلیت کے حامی تھے کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ ہل کان ولی اللہ علیٰ غیر اعتقاد احمد بن حنبل؟ کیا کوئی شخص اسلام میں ولی اللہ ہوا ہے جو امام احمد بن حنبل کا پیرو نہ ہو؟ تو آپ نے جواب دیا: ماکان ولا یکون نہ تو ہوا ہے، نہ آئندہ ہوگا (حکاہ ابن رجب فی الطبقات) اس سے معلوم ہوا کہ حنبلی ہونا نہ صرف اچھی بات ہے بلکہ بقول حضرت پیران پیر کوئی شخص ولی اللہ ہو نہیں سکتا جب تک وہ حنبلی الاعتقاد نہ ہو۔ اب اگر حنبلی ہونا . . . وجہ تضعیف ہے تو لازم آیا کہ پیران پیر بھی لائق استناد و اعتماد نہیں، لیکن اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو . . . . . ساری پیریت اور قادریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

شیخ آلوسی اور نواب صدیق حسن

اب ایک دوسری تاریخی تحقیق ملاحظہ ہو: علامہ آلوسی کی نسبت ارشاد ہوا ہے کہ ان کا قول قابل اعتماد نہیں، اس لئے کہ وہ نواب صدیق حسن خان کے ہم خیال تھے۔ دلیل یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے ان کی تفسیر چھپوائی تھی۔ میں حیران ہوں پہلے دعوے کا بطلان ظاہر کروں یا دلیل کا؟ پرنسپل صاحب نے تو عہد کر لیا ہے کہ جو بات کہیں گے جچی تلی ہوئی غلط ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شہاب الدین محمود آلوسی عراق کے مفتی اور اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ فقہ میں ان کا مسلک حنفی تھا۔ تصوف میں نقشبندی خالدی المشرب

تھے۔ والدہ کی طرف سے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے اور والدہ کی طرف سے حسینی سید تھے۔ بغداد کے خاندان نقیب الاشراف یعنی سجادہ نشین مسند قادریہ کے اکابران کے شاگرد ہیں ۱۳۶۷ھ میں سلطان عبدالمجید خاں نے انھیں قسطنطنیہ طلب کیا اور خلعت و نشان سے سرفراز کیا اس کی سوانح عمری حدیقۃ الورود فی مدائح شہاب الدین محمود" بغداد میں چھپ چکی ہے اور اگر کسی اہل علم کی شہرت و استناد کیلئے اہل فرنگی محل کی واقفیت شرط نہ ہو تو اہل علم و نظر کے مطالعہ میں آچکی ہو۔

عجیب غریب استدلال

اب یہاں چند باتیں قابل ملاحظہ ہیں۔

اولاً اگر ایسا اہل علم و قبول بھی وہابی ہو سکتا ہے تو کم از کم یہ بات واضح ہو گئی کہ وہابی ہونا چنداں برائی اور عیب کی بات نہیں۔ تمام بلاد عراق کا سرکاری مفتی، دولت عثمانیہ کا مقبول و معتمد، خاندان نقیب الاشرف قادری و جیلانی کا استاد اور وقت کا مسلم الثبوت شیخ بھی وہابی ہو سکتا ہے۔ اگر وہابیت اسی کو کہتے ہیں تو بقول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ "فلیشہد الثقلان انی رافضی"

ثانیاً ان کی تفسیر کی تضعیف کے لئے اس بات سے استدلال کہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے چھپوائی تھی، باب جرح و تعدیل میں ایک نئے "قاعدہ" کا اضافہ ہے نواب صاحب مرحوم نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری اور امام دارمی کی کتاب السنن بھی اپنے سعی و اہتمام سے چھپوائی تھی پھر کیا اس سے فتح الباری اور کتاب السنن کا مصنف بھی وہابی ہو گیا اور اس لئے ان کا حوالہ بھی قابل التفات نہیں؟ "فیاللہ ویا للعقول"!

اصل واقعہ

ثالثاً سب سے زیادہ قابل تماشا لطیفہ یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے۔

دامن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

غلط استدلال کے معاملے میں ظلمات بعضہا فوق بعض کی شاید ہی اس سے کوئی بہتر مثال مل سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہیں سے یہ بات پرنسپل صاحب اور مولانا صاحب کے کان میں پڑ گئی ہے کہ آلوسی زادہ نے یعنی علامہ آلوسی کے بیٹے نے نواب صاحب سے سند حدیث لی تھی اور نواب صاحب نے ان کے کہنے سے کوئی کتاب مصر میں چھپوائی تھی۔ بس جھٹ دعویٰ کر دیا کہ وہ ان کے والد کی تفسیر ہی تھی۔ اس شیوہ تحقیق و شان علم سے یہ بات بھی بعید نہیں کہ آلوسی اور آلوسی زادہ کو ایک ہی شخص سمجھا لیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ آلوسی مصنف تفسیر کے لڑکے علامہ شیخ نعمان آلوسی زادہ شیخ العراق تھے۔ جنھوں نے تین سال ہوئے بغداد میں انتقال کیا۔ انھوں نے نواب صاحب مرحوم سے خط و کتابت کی تھی اور سلسلہ قاضی شوکانی و شاہ ولی اللہ کی سند حدیث لی تھی۔ انھیں کی ایک تصنیف "جلاء العینین" نامی کتاب ہے جو نواب صاحب کے مصارف سے مصر میں چھپی تھی، لیکن تفسیر روح المعانی کی طباعت سے نواب صاحب کو مطلق کوئی تعلق نہیں۔ ان کی اور نواب صاحب مرحوم کی خط و کتابت سے پہلے تفسیر چھپ چکی تھی اور نواب صاحب کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ علامہ آلوسی نے کوئی تفسیر بھی لکھی ہے۔ چنانچہ جلاء العینین کے دیباچہ میں یہ پوری خط و کتابت درج ہے۔ شیخ نعمان اپنے سب سے پہلے خط میں لکھتے ہیں "سال گزشتہ میں حج کے بعد مصر آیا تاکہ اپنے والد کی تفسیر چھپواؤں، وہاں آپ کی تفسیر نظر سے گزری اور اس سے آپ کی دیگر مصنفات کیلئے اشتیاق پیدا ہوا الخ"۔ اس سے واضح ہوا کہ قبل از خط و کتابت وہ طباعت تفسیر کا اہتمام کر چکے تھے۔

تفسیر کس نے چھپوائی؟

رابعاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تحقیق کا معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔

ماجرا با سخنے پآں چشم فسوں ساز مرا

ایک اور لطیفہ بھی قابل بیان ہے علامہ آلوسی کی تفسیر کی انھوں نے اس بناء پر تضعیف کی ہے کہ ایک وہابی یعنی نواب صدیق حسن خان مرحوم نے بہ وجہ ہم خیالی چھپوائی تھی یہ تو معلوم ہوگیا کہ اس کی طباعت سے اس مرحوم وہابی کا کوئی تعلق نہیں۔ اب معلوم کرنا چاہیئے کہ فی الحقیقت کس شخص نے اسے چھپوایا؟ جس نے چھپوایا ہوگا بقاعدۂ موسسۂ فرنگی محل سلمہا اللہ تعالیٰ اس کی ہم خیالی ثابت ہوجائے گی۔ سو واقعہ یہ ہے کہ یہ تفسیر نواب صاحب جیسے وہابیوں نے نہیں چھپوائی تھی، بلکہ بغداد کے سجادہ قادریہ کے سجادہ نشین حضرت نقیب الاشرف کی اعانت سے مصر میں چھپی تھی، جیساکہ خود شیخ نعمان مرحوم کی تحریر سے واضح ہوتا ہے۔ فیالہا من مصیبتہ۔

یہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا!

خلفائے جیلانیہ قادریہ بغداد کے اکابر تو یقیناً مولانا عبدالباری کے نزدیک بابت کے جرم العیفر سے تو دامن نہیں ہوسکتے۔ حضرت سجادہ نشین بغداد اور ان کے آبا کا مقام تو بہت بلند ہے۔ ان کے ایک عزیز پیر ابراہیم صاحب بغدادی بمبئی میں موجود ہیں جن کے آستانۂ فیض پر ہمیشہ مولانا صاحب (بقول ان کے) اپنا درد دل عرض کرنے کے لئے حاضر ہوتے رہتے ہیں اور بار بار ان کی کف پا آنکھوں سے ملتے ہیں مگر جوش عقیدت کا یہ حال ہے کہ سیری نہیں ہوتی۔

نجاک یاتت کہ آں ہم گمان بے ادبی ست!

اب سوال یہ ہے کہ تفسیر "روح المعانی" کو جن حضرات نے بہ وجہ ہم خیالی وہم مشربی چھپوایا ہے ان کا تعلق موجب استناد و تعدیل ہے یا موجب تضعیف و جرح؟ نیز پرنسپل صاحب براہ عنایت یہ بھی فرمادیں کہ ان کے اقوال سے احتجاج اور ابن عبدالوہاب نجدی کے اقوال سے احتجاج میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

المدونۃ الکبریٰ اور امام مالکؒ

خواجہ عبدالحی صاحب نے المدونۃ الکبریٰ سے ایک عبارت نقل کی اور اسے حضرت امام مالکؒ کی تصنیف ظاہر کیا تھا، پرنسپل صاحب نے چونکہ امام مالکؒ کی تصنیف صرف "موطا" ہی سنی تھی اور "مدونہ" مطبوعہ کے لوح یا دیباچے میں عبدالرحمٰن بن قاسم کا نام دیکھا تھا، اس لئے اپنے خیال میں بہت خوش ہوئے کہ حریف پر دلیرانہ وار کرنے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا، نہایت سنجیدگی سے لکھتے ہیں۔

ہم کو حیرت ہے کہ المدونۃ الکبریٰ کن امام مالکؒ کی تصنیف ہے؟

آج تک تو امام مالکؒ کی تصانیف میں سوائے "موطا" کے اور کسی کا پتا نہیں ملا تھا، شکریہ مولانا کے ذریعے ایک اور تصنیف معلوم ہو گئی۔"

میں بھی اس عمدہ جملے سے متفق ہو سکتا ہوں کہ امام مالکؒ کی تصانیف میں سے بجز موطا کے اور کسی کا پتہ نہیں ملا، بشرطیکہ ازراہ عنایت اس میں دو لفظ اور بڑھا دیے جائیں کہ مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں" کیونکہ حافظ ابن کثیر کی شہرت و عدم شہرت کے معاملے کی طرح غالباً امام مالکؒ کی تصنیف و عدم تصنیف "مدونہ" کا معاملہ بھی اسی اصل عظیم پر موقوف ہے کہ پرنسپل صاحب کو بھی اس کی خبر ہے یا نہیں؟ اگر کچھ دنوں تک یہ قاعدہ علم و تحقیق جاری رہا تو امید ہے عنقریب فرنگی محل کے حواشی و شروح کے علاوہ اور تمام مصنفین و مصنفات کے نہ صرف شہرت و عدم شہرت بلکہ وجود و عدم کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔

سلف کا طریق جمع و تصنیف

یہ تو بڑی ہی مصیبت ہے کہ بحث و نظر میں مخاطب کی تعلیم کیلئے مبادیات و مصطلحات کی بھی تشریح کرنی پڑے لیکن اب کرنی ہی پڑے گی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ "المدونہ" امام مالکؒ کی ویسی ہی تصنیف ہے جیسی کہ "موطا" ہے اور فرنگی محل کے علاوہ ایک ہزار برس سے تمام اہل علم و تصنیف نے اسے موطا کی طرح امام موصوف ہی کی تصنیف قرار دیا ہے

اور اسی پر امام موصوف کے علوم و تفقہ کا دار و مدار ہے ۔ پرنسپل صاحب کو اس نسبت پر تعجب اس لئے ہوا کہ وہ سمجھتے ہیں ائمہ سلف کے زمانہ میں بھی کسی کتاب کے تصنیف کرنے کا وہی طریقہ تھا جو بعد کو ہوا اور جو آج کل ہے اور چونکہ " مدونہ " کی تبویب دوسرے اشخاص کے قلم سے ہوئی ہے، اس لئے وہ امام مالکؒ کی تصنیف نہیں ہے ۔ اصحاب تبویب روایت کی ہے حالانکہ ابھی یہ بات انہیں معلوم کرنا باقی ہے کہ اوائل میں جب تدوین علوم اسلامیہ کا سلسلہ شروع ہوا تو طریق جمع و تصنیف کیا تھا ؛ اس وقت تدوین و کتابت کے وہ طریقے وجود میں نہ آئے تھے جو بعد کو ترقی صناعت کتابت و تصنیف سے پیدا ہوتے گئے اس وقت تدوین علوم کا طریقہ یہ تھا کہ ائمہ علوم تمام مطالب و مسائل بطریق املا و درس بیان کرتے تھے اور بار بار کے تکرار و مزاولت کے بعد وہ ایک مرتب و منظم کتاب کی صورت اختیار کر لیتے تھے ۔ ان کے تلامذہ روایتِ حدیث کی طرح ان کی بھی روایت کرتے اور قید کتابت و ترتیب میں آ کر وہ بطریق روایت آگے کو بڑھتے اور پھیلتے تھے ۔ لہا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ مختلف راوی اور تلامذہ ایک ہی کتاب کا مواد اپنے اپنے ذوق کے مطابق مبوب و مترجم کرتے (یعنی ترجمۃ الابواب پرنسپل صاحب کچھ اور نہ سمجھ لیں) اور ایک ہی کتاب مختلف روایتوں اور ترتیبوں سے شہرت پاتی ۔

موطا کی روایتیں

یہ جو موطا امام مالک کی مشہور ہے تو یہ بھی امام مالک نے اس طرح نہیں لکھی تھی جس طرح آج کل مصنفین کتابیں تصنیف کرتے ہیں یا مثلاً جیسے اپنی شرحیں اور حاشیے لکھا کرتے تھے بلکہ یہ بھی بطریق درس و املا مرتب ہوئی ہے اور اسی لئے اس کی مختلف روایتیں موجود ہیں ۔

حافظ ابن عبدالبر نے تمہید میں بیس روایتوں کا استقصاء کیا اور ان میں سے بارہ کو ترجیح دی منجملہ ان کے مقبول و مشہور روایت یحییٰ بن یحییٰ المصمودی کی ہے، جو آج کل موطاء مالک کے نام سے متداول ہے دوسری روایت امام محمد کی ہے، جو موطا امام محمد کے نام سے مشہور ہے ۔ ان سب کے ابواب و تراجم ابواب مختلف ہیں ٹھیک اسی طرح " المدونہ " بھی امام مالکؒ کی

کتاب ہے اور مختلف روایتوں سے مرتب و منسوب ہوئی ہے۔ علمائے مغرب میں امام عبدالرحمٰن بن القاسم کا نسخہ زیادہ مقبول ہوا اور وہی مصر میں چھپا ہے۔ اگر "مدونہ" کی تصنیف کی نسبت امام مالکؒ کی جانب نہیں کرنی چاہیئے، عبدالرحمٰن بن القاسم کی طرف کرنی چاہیئے تو پرنسپل صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ "موطا" کی نسبت بھی امام مالک کی طرف صحیح نہ ہوگی، متداول نسخہ کو یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی تصنیف قرار دیجئے اور بقیہ کو بقیہ تیس راویوں کی طرف منسوب کیجئے۔ امام مالکؒ پر موقوف نہیں تمام ائمہ سلف کے تدوین علوم کا یہی حال تھا۔ امام شافعیؒ کی کتاب الام اور امام احمدؒ بن حنبل کی مسند بھی انہی معنوں میں ان کی مصنفات ہیں، ورنہ یہ بات تو قطع وجزم کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ امام شافعیؒ نے قلمدان سامنے رکھ کر کوئی مرتب کتاب "کتاب الام" کے نام سے نہیں لکھی تھی۔ کتب طبقات و رجال سے یہ امور اہل نظر پر واضح و آشکارا ہیں۔

امام ابن تیمیہ

خواجہ عبدالحی صاحب نے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی ایک عبارت نقل کی تھی۔ اس پر پرنسپل صاحب لکھتے ہیں: "ابن تیمیہ کی عبارت سے استناد اسی طرح ہے۔ جیسے حلی کی عبارتوں سے آپ مطاعن اصحاب نقل کریں اور ہم کو الزام دیں۔ آپ ہی فرمائیے کہ اگر آپ اسی طرح شیعوں کے اقوال نقل کرنا شروع کریں تو کیا وہ ہم پر حجت ہو جائیں گے[1]"

شیخ حلی حضرات امامیہ کے ایک مشہور مصنف گزرے ہیں، جن کی ایک کتاب منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ کے جواب میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے اپنی مشہور کتاب منہاج السنۃ لکھی ہے۔ پرنسپل صاحب فرماتے ہیں ان سے استناد ایسا ہی ہے جیسے کہ شیخ حلی جیسے شیعہ

---

[1] ایک اور مقام پر پرنسپل صاحب لکھتے ہیں۔ ابن تیمیہ کی عبارت سے استناد اسی طرح ہے جیسے پیٹرس کی عبارتوں سے تثلیث نقل کریں اور ہم کو الزام دیں۔ آپ ہی فرمائیے کہ اگر آپ اس طرح عیسائیوں کے اقوال نقل کرنا شروع کر دیں تو کیا وہ ہم پر حجت ہو جائیں گے۔ (رسالہ البلاغ ص۱۰)

مصنفین کے کلام سے استناد کیا جائے اور ہم کو یعنی پرنسپل صاحب اور مولانا عبدالباری کو الزام دیا جائے۔

معلوم نہیں "اس ہم کو" سے مقصود کون سی جماعت ہے؟ فرنگی محل جب "ہم" بولتا ہے تو اس کی اور بہت سی باتوں کی طرح "اس ہم" کا تعین بھی آسان نہیں ہوتا، لیکن اگر ہم سے مقصود اہل سنت والجماعت ہیں تو یہ نتیجہ نکلا کہ ابن تیمیہ اہل سنت کے ویسے ہی مخالف فرقے میں سے ہیں جیسا کہ شیعہ ہیں۔ شیعوں کے متعلق مولانا عبدالباری کی تحقیق ان کی تفسیر کے حوالے سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے کہ وہ کفار میں داخل ہیں اور ان سے مناکحت مثل مشرکین کے جائز نہیں۔ پس چند کڑیوں کے بعد معاملہ اس پر منتہی ہوگا کہ ابن تیمیہ اہل سنت کیلئے بمنزلہ کفار کے ہیں۔ نعوذ باللہ من لحن آخر ہذہ الامر اولہا جس بے پروائی اور بے ساختگی کے ساتھ یہ کہی گئی ہے اس کو ناواقف آدمیوں خصوصاً معتقدین و پرستاران فرنگی محل نے تو یہی فیصلہ کر لیا ہوگا کہ تیح مچ کو ابن تیمیہ کوئی ایسے ہی مخالف اہل سنت فرقہ کے آدمی ہوں گے اور ان کی گمراہی مسلم و معروف ہوگی۔ جبھی تو پرنسپل صاحب نے بغیر کسی حوالہ و دلیل کے بلا تامل یہ بات کہہ دی

ائمہ دین کی شہادتیں

لیکن آپ ناظرین فرنگی محل کے علم و تحقیق کا تماشا کریں۔ امام ابن تیمیہ اس جلالت و مرتبت کے امام اہل سنت تھے کہ بالاتفاق تمام ائمہ معاصرین نے ان کی امامت فی الدین والسنت پر شہادت دی ہے اور متاخرین علمائے اہل سنت میں شاید ہی کسی عالم و مصنف کی امامت فی الدین اور کمال مرتبۂ علم و اجتہاد اور مجدد العصر فی الملت ہونے پر اس درجہ ائمہ علم و اعاظم امت کا اتفاق ہوا ہوگا، جیسا کہ امام موصوف کی نسبت ہوا ہے۔ وہ نہ صرف امام اہل سنت ہیں، بلکہ اماموں کے امام اور مجدد و مصلح و مسلم علیہم ہیں۔ ان کے معاصرین میں کبار ائمہ مثلاً ذہبی، ابن دقیق العید، ابو الحجاج مزی، حافظ ابن زملکانی، تقی الدین سبکی، ابن قدامہ مقدسی، حافظ ابن [illegible]

۔ مال الدین الفزاری، قاضی ابن الزملکانی، ابن سید الناس، ابوالعباس ابن جی، ابوالعباس الواسطی،
ابوعبداللہ حریری وغیرہم جیسے مسلم الثبوت ائمہ اہل سنت تا قدین علوم کی مصنفات دیکھنی
چاہئیں کہ کس طرح ان کی امامت فی الدین اور مجدد العصر ہونے کا اعتراف کرتے ہیں اور
ان کی شاگردی و تلمذ پر مفتخر ہیں۔ حافظ ذہبی جیسے مسلم الثبوت امام المتاخرین جن کی جرح و تعدیل
پر آج کا مدار حدیث و سنت کا دارومدار ہے امام ابن تیمیہ کو اپنے استادوں میں شمار کرتے
ہیں اور معجم شیوخ میں لکھتے ہیں: ہو اکبر من ان ینبہ علی سیرتہ مثلی وواللہ لو حلفت بین الرکن
والمقام انی ما رأیت بعینی مثلہ، ولا ما رأی مثل نفسہ لما حنثت۔ یعنی ان کا مقام کہیں اس سے بلند
ہے کہ مجھ جیسا شخص ان کی سیرت و فضائل بیان کرے۔ قسم خدا کی اگر میں خانہ کعبہ میں
رکن و مقام کے درمیان یہ قسم کھاؤں کہ نہ تو میری آنکھوں نے اس جیسا باکمال کسی کو دیکھا اور نہ
خود اس نے کسی کو اپنا جیسا پایا تو میری قسم جھوٹی نہ ہوگی۔

مزید شہادتیں

ابوالحجاج مزی صاحب تہذیب کہتے ہیں ما رأیت احداً اعلم بکتاب اللہ و سنت رسولہ
ولا اتبع لہما منہ۔ یعنی میں نے کسی شخص کو ان سے زیادہ قرآن و سنت کا عالم دیکھا
اور نہ عامل۔ شیخ ابوحیان صاحب تفسیر بحر المحیط ان کی مدح میں لکھتے ہیں۔

کنا نحدث عن حبر یجیی ہنا

انت الامام الذی قد کان ینتظر

حافظ ابوالعباس الحزامی صاحب البلغہ جو امام ذہبی کے شیوخ میں سے ہیں،
لکھتے ہیں۔ واللہ ما رأینا فی عصرنا ہذا من تستجلی النبوۃ المحمدیۃ وسننہا من اقوالہ و افعالہ الا ہذا
الرجل یعنی خدا کی قسم ہم نے اپنے زمانے میں کسی کو نہیں دیکھا جس کے اقوال و افعال سے نبوت
محمدیہ کے انوار و برکات اور اس کی سنت کی روشنیاں چھن چھن کر نکلتی ہوں، الا اس شخص کو!
اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی نے "درر کامنہ" میں اور شیخ جلال الدین سیوطی نے طبقات

میں ان کا مفصل ترجمہ لکھا ہے اور ان کے امام اہل سنت ہونے پر شہادت دی ہے۔ یا اور اس طرح کا ایک سمت زیادہ شہادتیں اہل علم کی جسے یکجا دیکھنا منظور ہو وہ شیخ مرعی الدین الاعلام العلیۃ فی مناقب الامام ابن تیمیہؒ اور ابن ناصر الدین شافعی کی الرد الوافر اور القول الجلی کا مطالعہ کرے۔ آخر الذکر دونوں کتابیں مصر میں چھپ چکی ہیں۔

قاضی عینی اور ملا علی قاری

لیکن اگر پرنسپل صاحب کے لئے ان تمام ائمہ اہل سنت کی شہادتیں بھی وقیع نہ ہوں؛ کیوں کہ قاعدہ جرح و تعدیل کے عموم و اطلاق کا جو حال حافظ ابن کثیر کے معاملہ میں کھل چکا ہے، اس کا ضبط و نظم ممکن نہیں کون جانتا ہے کس وقت کس پر چل جائے ممکن ہے مدرسۂ نظامیہ ابن کثیر کی طرح حافظ ذہبی، ابو الحجاج مزی اور ابن دقیق العید وغیرہم کو بھی معلوم و مشہور ہونے کی عزت نصیب نہ ہوئی۔ اسلئے میں یہاں دو ایسے پکے حنفی بزرگوں کا قول نقل کر دیتا ہوں جن کی عبارتوں سے خود پرنسپل صاحب نے اپنے مضمون میں استشہاد کیا ہے اور اس لئے نہ تو ان کے ارتکاب جرم حنبلیت کا ڈر ہے اور نہ عدم شہرت کا یعنی قاضی عینی حنفی اور ملا علی قاری۔ امید ہے جب خود پرنسپل صاحب ان بزرگوں کے اقوال سے سند پکڑتے ہیں، تو ان کا شمار شیخ حلی اور شیعوں کی صف میں نہ ہوگا قاضی عینی کی تحریر الرد الوافر کے خاتمہ میں موجود ہے جس میں چھ سات صفحوں کے اندر امام ابن تیمیہ کے مناقب و فضائل بیان کئے ہیں۔ از انجملہ لکھتے ہیں: "وہو الامام الفاضل البارع التقی النقی الورع، الفارس فی علم الحدیث والتفسیر والفقہ والاصولین بالتقریر والتحریر والسیف الصارم علی المبتدعین والحبر القائم بامور الدین والآمر بالمعروف والناہی عن المنکر ...... ولہ المصنفات المشہورۃ المقبولۃ والفتاوی القاطعۃ غیر المعلولۃ"

یعنی امام ابن تیمیہ امام فاضل تھے۔ بڑے صاحب تقویٰ و طہارت نفس تھے۔ علوم تفسیر و

الرد الوافر صفحہ

حدیث اور فقہ کے میدانوں کے شہسوار تھے ۔ اہل بدعت کیلئے شمشیر برہنہ تھے ۔ دین حق کو قائم کرنے والے عالم ربانی تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں کمال سرگرم تھے۔ انکی مصنفات اہل علم میں مقبول ہیں اور ان کے فتوے قاطع اور علت وضعف سے پاک ہیں ۔ ملا علی قاری حنفی شرح شمائل میں امام ابن تیمیہ اور انکے شاگرد امام ابن قیم کا ذکر کر کے لکھتے ہیں : انہما کانا من اکابر اہل السنت والجماعت ومن اولیاء ہذہ الامت ۔ یہ دونوں امام اکابر اہل سنت والجماعت اور اس امت کے اولیاء اللہ میں سے تھے !

تعجب بالائے تعجب !

اب وہ معتقد بن نرنگ محل جنہوں نے یہ مضمون دیکھ کر تصور کر لیا ہے ، کہ انکے پیر جی نے علم و تحقیق کا خاتمہ کر دیا ۔ خدا را انصاف فرمائیں کہ جس ابن تیمیہ کو انکے معتمد علیہ حافظ عینی اور ملا علی قاری امام اہل سنت اور ولی اللہ قرار دے رہے ہیں ، انھیں کس بے باکی کے ساتھ ان نوروں کے مخالف اہل سنت کہہ دیا گیا ہے اور خیر سے علم و نظر کا یہ حال ہو کہ جس عینی اور قاری کی کتابوں سے سند پکڑ رہے ہیں ، ان ہی کے اقوال کی خبر نہیں ۔ پھر اس مبلغ علم پر بے دھڑک اخباروں میں مضامین لکھنے کا بھی حضرت کو شوق ہو ۔ اور کچھ اس کی پروا نہیں ہے کہ ابھی اہل علم و نظر سے بدبخت ہندوستان کی سرزمین خالی نہیں ہوئی ۔

(۲)

کراہت اور حرمت

خواجہ عبدالحی صاحب نے اپنے مضمون میں ائمہ سلف مثلاً حضرت امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہم کے اقوال نقل کئے تھے ، جن میں عمارت علی القبور کو ناجائز بتلایا ہے ۔ امام شافعیؒ کتاب الام میں یہ بھی لکھتے ہیں : وقد رأیت الولاۃ بمکۃ یامرون بہدم ما یبنی فلم ار الفقہاء یعیبون ذالک (میں نے مکہ میں حکام کا یہ عمل دیکھا کہ قبر پر اگر عمارت ہوتی تو اسے گرا دیتے تھے اور فقہا ان کے پاس اس کام پر اعتراض نہیں کرتے تھے) یہ قاعدہ اصول اس

نہ صرف امام موصوف کا مذہب معلوم ہوا، بلکہ سلف میں حرم مکہ کے حکام اسلام کا عمل جاری و مستمر بھی معلوم ہوا جس پر علماء کا عدم اعتراض ایک ثقہ و عادل امام کی شہادت سے ثابت ہے۔
اس روایت و شہادت کا حسب اصول مطلب معلوم جو روشن ہے اور جس سے نہ صرف عمارۃ علی القبور کا ابتداءً عدم جواز ثابت ہوتا ہے بلکہ بنا کے بعد انہدام کی ضرورت اور تاکید بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کی تشریح آگے آئے گی۔ یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ چونکہ اس شہادت کے رد کرنے کے لئے کوئی بات از قبیل قواعد جرح و تعدیل فرنگی محل پرنسپل صاحب کی سمجھ میں نہ آئی، اس لئے اسے تو سراسر نسیان کر گئے گویا امام شافعی کی اس شہادت کا کوئی وجود ہی نہیں، لیکن چونکہ بناء علی القبر کی نسبت کراہت کا لفظ بعض عبارتوں میں آیا تھا اور سلف کی اصطلاح اس باب میں معلوم نہ تھی۔ اس لئے یہ دیکھ کر بہت خوش ہو گئے۔ سمجھے یہاں بھی کراہت سے مقصود یہی مرتبۂ کراہت مصطلحۂ فقہا ہوگا، جس کی تعریف انھوں شاید خلاصۂ کیدانی میں پڑھی تھی۔ پس خیال کیا کہ حرمت تو ثابت نہیں ہوئی، چلئے کراہت ہی کے ستون پر اپنا گنبد علم استوار کیجئے۔ قبروں پر عمارت کا بنانا اگر برا ثابت ہو گیا تو کیا مضائقہ، بہت برا تو ثابت نہ ہو سکا؛ آگے چل کر اس کراہت کو تنزیہی کر دیا جائے گا بلکہ ترک اولی ٹھہرا دیں گے۔ کیوں کہ کراہت مصطلحہ فقہا میں تحریمی و تنزیہی دونوں مفہوم داخل ہیں۔ چنانچہ نہایت اطمینان سے لکھتے ہیں، مولانا عبد الحی نے فقہائے اربعہ کی عبارتیں لکھی ہیں۔ ان میں سوائے دو کے اور تمام عبارتوں میں صاف لفظ کراہت موجود ہے۔ کراہت اور شے ہے، حرمت اور شے ہے۔ کراہت سے حرمت لازم نہیں آتی۔ معلوم نہیں جن دو عبارتوں کا یہاں حوالہ دیا ہے، ان کے جواب سے کیوں گریز کیا گیا؟

دعوت الی المکروہات

بہر حال اب اصل حقیقت ملاحظہ ہو:
اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پرنسپل صاحب اور مولانا عبد الباری صاحب بار بار اس پر مصر رہے ہیں کہ قبروں پر عمارت بنانا مکروہ ہے، حرام نہیں تو اس سے ان کا مطلب

کیا ہے! یہ ظاہر ہے کہ شریعت میں کچھ اعمال مطلوب ہیں، کچھ ممنوع ہیں۔ مطلوبات کے بھی مختلف مدارج ہیں، ممنوعات کے بھی مختلف مراتب ہیں۔ مثلاً کوئی بھلائی اگر سیر بھر ہے، تو کوئی آدھ سیر اسی طرح کوئی برائی من بھر ہے اور کوئی آدھ من۔ عوارض و احوال کے لحاظ سے کبھی کم درجہ کی بھلائی بڑے درجے کی ہو جاتی ہے، کبھی کبھی کم درجہ کی برائی بڑے درجہ کے حکم میں آجاتی ہے، لیکن یہ تمام حد بے اور اقسام مصنفین و فقہائے احکام کے ضبط و نظم کے لئے قرار دیے ہیں اسلئے نہیں ہیں کہ لوگ صرف محرمات ہی سے اجتناب کریں اور مکروہات کا التزام و دوام کرلیں۔ جو امر مطلوب ہے وہ تو یہ ہے کہ تمام مطلوبات شرعیہ کے لئے ہم سرگرم ہوں اور ممنوعات سے ہم اجتناب کریں۔

مطلوبات شرعیہ کے درجے

بہت سی مطلوبات شرعیہ ایسی ہیں جن کے درجے اور قسم کے تعین میں اختلاف ہوا، کیونکہ ان کا تعین دلائل کے نظر و استقصاء پر موقوف ہے اور ان کے تدبر و اعتبار میں اختلاف رائے و نظر کی گنجائش کسی نے واجب ٹھہرایا، کسی نے سنت۔ لیکن اس میں سب کا اتفاق ہوا کہ یہ امور مطلوبات شرعیہ میں سے ہیں۔ مثلاً امام شافعی و جمہور کے نزدیک نماز میں سورۃ فاتحہ کی قرأت فرض ہے، امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک فرض نہیں اور اگر چھوٹی سے چھوٹی بھی آیت پڑھ لی جائے تو بقدر فرض قرأت ہو جائے گی۔ پس سورۃ فاتحہ ایک کے نزدیک فرض ٹھہرا، ایک کے نزدیک فرض سے کمتر، لیکن عملاً مطلوب دونوں کے نزدیک ہے۔ اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ تمام حنفی سورۂ فاتحہ پڑھنے کا التزام ترک کردیں اور یہ سمجھ کر کہ ایک آیت ادائے فرض کے لئے کافی ہے، بقول قفال مروزی کے "دو برگ سبز" یعنی سورۂ رحمٰن کی آیت "مدھامتان" ہی پر قناعت کرلیں؟ یا مثلاً ہمارے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز سے باہر آنے کے لئے سلام فرض نہیں۔ بالقصد کوئی فعل کیا جائے اور نماز سے باہر آجائے تو فرض صلوٰۃ میں حرج واقع نہ ہوگا... پھر اس کا نتیجہ تو نہیں ہونا چاہیئے کہ پرنسپل صاحب اس کا

التزام کریں اور ہمیشہ سلام کی جگہ بالقصد والاہتمام کوئی ایسی ہی بات کرکے نماز ختم کیا کریں؟

مقصود کیا ہے؟

اسی طرح مان لیجئے کہ عمارت علی القبور والی برائی آپ کے نزدیک من بھر والی نہیں ہے
یکجا نہیں تو پاؤ من ہی سہی، پھر بھی خدارا شوقاً مطلوب کیا ہے؟ برائیوں سے خواہ بہت
بڑی ہوں یا کمتر اجتناب مقصود ہے یا ان پر اصرار؟ مان لیا کتبوں پر عمارت بنانا حرام نہیں
مکروہ ہی سہی، لیکن بہرحال شرفاً بھلائی اور پسندیدگی کی بات تو نہ ہوئی! پھر یہ کیا کھلی
علم بغاوت عقل ہے کہ مکروہات کے قیام و دوام اور شیوع و قبول پر اس قدر اصرار کیا گیا
اور اگر کسی کا دست صلاح انہیں چھوے تو اسے مسلمانوں کے لئے قیامت کبریٰ اور
مصیبت عظمیٰ ٹھہرایا جائے؟ آخر آپ کو اس میں کونسا اتنا اصرار ہے کہ مسلمان عین حرم محترم
کے اندر جہاں منکرات کا احداث و عمل دوسری جگہوں سے ہزار درجہ زیادہ عنداللہ ممقوت ہے،
مکروہ اشیاء و اعمال قائم رکھیں اور کیوں ان کا ازالہ نہ کیا جائے؟ یہ کیا مصیبت اور طوفان
بےتمیزی ہے کہ غریب مسلمانوں کو مکروہات پرستی اور کراہت پسندی کی اس مجنونانہ شدومد
اور جاہلانہ جوش و ہیجان کے ساتھ دعوت دی جا رہی ہو؟ نہ خدا کا خوف اس سے مانع آتا ہے،
نہ بندوں سے شرم دامنگیر ہوتی ہے۔

ائمۂ اسلام کا فرض

ثانیاً اگر تسلیم کرلیا جائے کہ عمارت علی القبور والآثار حرام نہیں ہیں، بلکہ مکروہ مصطلحہ
اصول ہے پھر بھی مولانا... اپنے اس مسلک جدیدہ کے حق میں کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟
اگر ایک مکروہ کام عوام میں اس درجہ مقبول اور معمول بہ ہو جائے کہ اسے شرعاً کارِ خیر سمجھ کر
انجام دینے لگیں اور بجائے ممنوعیت کے اگرچہ علی وجہ الکراہت ہی اسے ایک مشروع و مطلوب
عمل سمجھ کر اس درجہ اہتمام کریں، گویا واجبات و مہمات شرعیہ میں سے ہے، حتیٰ کہ بوجہ
شیوع عمل و رسوخ اعتقاد ان کے خلاف اعتراض و انکار کی جرات لوگوں کو نہ ہو اور سلاطین

جہال کے عمل اور شائے دین کے کتمانِ شہادت سے حقیقت شرعیہ یکسر منقلب ہو گئی ہو تو ایسی حالت میں فقہائے حنفیہ کی تصریحات کے مطابق ائمۂ اسلام کا فرض کیا ہے ؟ اگر قدرت پائیں تو اصرار اور کاوش کے ساتھ اس عمل مکروہ کا جو بوجہ مداومت و اصرار اشد شدید حرمت تک پہنچ گیا ہے ازالہ کریں یا یہ سمجھ کر تحریف شرع گوارا کر لیں کہ اصلاً یہ فعل حرام نہ تھا، اس سے ایک فروتر درجہ ممنوعیت یعنی مکروہ تھا۔

ناقابل علاج مصیبت

تمام فقہائے حنفیہ مثلاً اصحاب متون اور شروح معتبرہ کی تصریحات اوپر مالے میں کیا ہیں ؟ ابن نجیم نے اشباہ اور بحر میں کیا لکھا ہے ؟ قازانی "بدائع" میں کیا کہہ رہے ہیں ؟ اصحاب فتاویٰ مثلاً قاضی خان و تاتارخانیہ تک کے اقوال کیا ہیں ؟ اگر ائمہ سلف و فقہا کے اقوال یا کتاب و سنت کے نصوص کے لئے قابل احتجاج نہیں تو کیا ان ہی بزرگوں کی تصریحات پر کاربند ہونے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ آخر ہر زندگی عمل کے لئے کسی دلیل اور حجت شرعی تحت قبۃ السماء کا وجود بھی ہے یا نہیں ؟ حافظ ابن کثیر جیسا مفسر غیر مشہور اور مجرم جرم حنبلیت ہے۔ علامہ آلوسی تابعی اعتنا نہیں اور ان کی دلیل کے لئے صحت و صدق کی ضرورت نہیں۔ امام ابن تیمیہ جیسا مسلم الثبوت امام اہل سنت قتل امامیہ سے گمراہ ... ہے ائمہ اسلام کی تصریحات میں کراہت سے مقصود تحریم نہیں بلکہ کراہت مصطلحہ فقہا ہے۔ اچھا ہم یہ تمام مصیبتیں گوارا کر لیتے ہیں مگر برائے خدا ... کوئی اصل، کوئی قاعدہ، کوئی مذہب و مسلک تو تسلیم کریں اور اس پر اپنی عادت مبارک کے خلاف جم جائیں ! ناقابل علاج مصیبت تو یہ ہے کہ کسی طرح بھی ان کا پسندیدہ و محبوب عمل مکروہ فسق تا قابل ازالہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ با ایں ہمہ وہ بے نکان کہے جاتے ہیں کہ تیامت کیوں آ گئی اور ابن سعود نے اسلام کا خاتمہ کر دیا۔ کیوں ؟ اس لئے کہ ان کی [illegible] نے [illegible] [illegible] کیا ؟

ائمہ سلف اور اصطلاحات کراہت

یہاں تک تو بطریق حجت الزامی عرض کیا گیا - اب بطریق تحقیق بھی سنیے۔

دراصل پرنسپل صاحب کا یہ فہم ہی سرے سے غلط ہے کہ ان عبارات ائمہ میں کراہت سے مقصود وہ مرتبۂ کراہت مصطلحۂ فقہائے متاخرین ہے، جس کی تعریف انھوں نے شاید خلاصہ کیدانی میں پڑھی ہے۔ انھیں معلوم نہیں کہ یہ تمام درجے اور ان کی تعریفیں بعد کو بنی ہیں، اوائل میں نہ تھیں۔ اس لئے علمائے سلف جب کبھی لفظِ کراہت استعمال کرتے ہیں تو اس کے لئے لغوی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جس سے مقصود علی الاطلاق ناپسندیدگی اور عدم مشروعیت ہے اور مراد ان کی وہی ہوتی ہے جو بعد کی بول چال میں لفظ حرمت اور حرام سے ہے، نہ کہ معنی مصطلحہ فقہاء اصولیین، جو حرمت کے بعد ایک خاص مرتبۂ منع ہے اور جس کی تحریمی و تنزیہی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ اسی طرح استحسان و وجوب کے لئے بھی سلف کے اطلاقات بعد کی تقسیموں کے پابند نہیں ہیں۔ وہ اکثر موقعوں پر عام الفاظ پسندیدگی کے ان لغوی دلالت کے ساتھ بولتے ہیں۔ مثلاً ہذا احسن یا یعجبنی ہذا یا احب ہذا، یعنی یہ بات اچھی ہے اور میں ایسا کرنا پسند کرتا ہوں اور اس سے مقصود ان کا جائز بھی ہوتا تھا۔ مذہب و استحسان بھی ہوتا تھا، سنن و واجبات بھی ہوتے تھے۔

چنانچہ خود قرآن و سنت کے اطلاقات کا بھی یہی حال ہے۔ سورۂ اسریٰ میں وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاہ فرما کر متعدد فواحش و کبائر کا ذکر کیا ہے، جس میں اہانت ابوین، قتل اولاد، قتل نفس، اکل مال یتیم، زنا وغیرہم محرمات و فسوق قطعیہ بھی شامل ہیں، لیکن ان سب کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے کل ذالک کان سیئہ عند ربک مکروہاً۔ یعنی یہ ساری باتیں تمہارے

ملاحظہ ہو سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۳ تا ۳۸ آخری فقرے کا ترجمہ یہ ہے، ان ساری باتوں کا یہ حال ہے کہ ان کی برائی تمہارے پروردگار کے نزدیک بڑی ہی ناپسندیدہ ہے۔ مولانا کا استدلال یہ ہے کہ قرآن مجید نے بڑی بڑی برائیوں کا ذکر کرکے آخر میں انھیں مکروہ قرار دیا۔ پھر کیا اس لفظ کی بنا پر ان برائیوں کو مکروہ مصطلح فقہا قرار دیا جائے گا!

پروردگار کے نزدیک بری ہیں (مکروہ) اب اگر پرنسپل صاحب . . . . . کا فہم یا معلول صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اولاد قتل کرنا، یتیموں کا مال کھانا اور زنا کرنا۔ مکروہ بمصطلح فقہا ہی ہوگا، حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ آیت میں لفظ مکروہ آیا ہے۔ پھر چونکہ مکروہ کی بھی دو قسمیں مولانا کو معلوم ہیں تحریمی و تنزیہی اس لئے ممکن ہے کہ یہ تمام افعال مکروہ تنزیہی ہوں چونکہ مکروہ تنزیہی منجملہ مرغوبات و مطلوبات فرنگی محل کے ہے حتی کہ اس کے لحاظ سے تمام کیلئے تمام مسلمانوں کو دعوت اجتماع و جہاد دی جا رہی ہے، اس لئے عجب نہیں ان مکروہات کے لئے بھی فرنگی محل سے صلائے عام شروع ہو جائے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

احادیث و آثار

اسی طرح صحیحین کی حدیث میں ہے ان اللہ عز وجل کرہ لکم ثلاثا قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال یعنی خدا نے تمہارے لئے مکروہ کیا ہے بے ہودہ قیل وقال و کثرت سوال اور مال کا ضائع کرنا۔ اب سوال یہ ہے کہ اضاعت مال حرام ہے یا مکروہ فقہی؟ حضرت علی علیہ السلام نے دیکھا کہ کچھ لوگ اہل شام پر سب و شتم کر رہے ہیں، اس پر فرمایا انی اکرہ لکم ان تکونوا سبابین میں مکروہ رکھتا ہوں کہ تم گالی گلوچ کرنے والوں میں سے ہو۔ یہ معجم طبرانی اوسط میں یا فقہ دونوں میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے کو گالی دینا باوجود بحکم سباب المسلم فسوق یا مکروہ فقہی ہے؟ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے جیسا کہ امام دارمی اور احمد نے روایت کیا ہے انا اکرہ ان احل حراما او احرم حلالا میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں کہ حلال کو حرام کر دوں یا حرام کو حلال۔ سوال یہ ہے کہ بحکم ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ہذا حلال وہذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب الخ۔ حلال کو حرام کر دینا اور حرام کو حلال کر دینا افترا علی اللہ اور ایسے

ملہ اور ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبانوں پر جھوٹی بات آ جاتی ہے بے دھڑک کہہ دیا کرو اور ... یہ حکم لگا دو یہ چیز حلال ہے، یہ چیز حرام ہے۔ اس طرح ... اللہ پر افترا پردازی کرنا ہے۔

اشد معصیت ہے یا محض مکروہ تنزیہی؛

اطلاقات ائمہ و فقہاء

یہ حال تو قرآن و سنت اور آثار صحابہ کا ہے، لیکن اگر ائمہ و فقہاء کے اطلاقات جمع کئے جائیں تو شواہد اس قدر ہو جائیں گے کہ ایک پورا رسالہ مرتب ہو جائے۔ سب سے پہلے حضرت امامنا الاعظم امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ اور صاحبین کے وہ اقوال ملاحظہ ہوں جن میں لفظ کراہت استعمال ہوا ہے اور بالاتفاق کراہت سے مقصود حرمت ہے۔ قال ابوحنیفہ: یکرہ بیع ارض مکۃ۔ مکہ کی زمین بیچنا مکروہ ہے، مشائخ حنفیہ نے اتفاق کیا کہ کراہت سے یہاں مقصود حرمت ہے۔ یکرہ الاحتکار فی اقوات الآدمیین والبہائم اذا اضر بہم وضیق علیہم۔ (مکروہ ہے انسان اور چارپایوں کی غذا کا احتکار جب کہ غذا کی قلت ہو) یہاں کراہت سے بالاتفاق حرمت مقصود ہے۔ یکرہ بیع السلاح فی ایام الفتنۃ (ایام فتنہ میں ہتھیار بیچنا مکروہ ہے) اور مقصود اس سے بالاتفاق حرمت ہے۔ یکرہ ان یجعل الرجل فی عنق عبدہ او غیرہ طوق الحدید الذی یمنع من التحرک (مکروہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے غلام یا کسی آدمی کی گردن پر لوہے کا ایسا طوق ڈال دے جس سے وہ گردن نہ ہلا سکے) حالانکہ معلوم ہے ایسا کرنا مکروہ معنی نہیں، بلکہ حرام ہے۔ اسی طرح بیع عذرہ و لبس منادیل حریر کی نسبت امام صاحب سے لفظ کراہت منقول ہے، حالانکہ وہ ان کے نزدیک حرام ہیں۔ مزید نظائر اس استعمال کے اگر دیکھنا ہوں تو مبسوط، بدائع، "شرح اصول بزدوی" وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔

مزید مثالیں

اسی طرح حضرت امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کے اقوال میں جا بجا یہ استعمال موجود ہے خود "مدونہ" میں ہے۔ اکل کل ذی ناب من السباع مکروہ۔ کیا پنڈت صاحب یہ حکم لگا دیں گے کہ مالکیہ کے نزدیک سباع ذی ناب یعنی درندوں کا گوشت حرام نہیں؟ اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں مکروہ سے مقصود حرام ہے نہ کہ مکروہ غیر حرام۔ اسی طرح حضرت امام شافعیؒ کی

بول چال ہے جنھوں نے اصول فقہ میں اولین کتاب تصنیف کی، انعاظ الرجل بنت من الزنا کے مسئلہ میں جب بعض ظاہر بینوں نے امام شافعیؒ پر اعتراض کیا کہ وہ حرمت کے قائل نہیں ہیں تو حافظ بیہقی نے امام مزنی کی یہ عبارت پیش کی انہ رای الشافعی نص علی کراہتہ تزوج الرجل بنیۃ من ماء الزنا۔ یعنی اس کی کراہت پر امام شافعیؒ کی نص موجود ہے اور اس سے ثابت ہے ان کے نزدیک حرام ہے (حکاہ فی المدخل) اسی طرح امام احمدؒ بن حنبل اور ان کے اصحاب کی تصریحات میں اس کے نظائر بے شمار ملیں گے، کیوں کہ سلف کی بول چال یہی تھی امام موصوف کے مذہب میں جمع بین الاختین بملک الیمین حرام ہے۔ لیکن حرمت کے لئے صرف ان کا قول مروی ہے" انا اکرہ" میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں۔ اقناع میں بہ روایت ابوعبداللہ ہے:" اکرہ اکل لحم الحیۃ و العقرب" سانپ اور بچھو کھانا میرے نزدیک مکروہ ہے، حالانکہ باتفاق ان کے نزدیک حرام ہے۔ اس میں بہ روایت جعفر بن محمد ہے: "انا اکرہ الحیل۔ میرے نزدیک نکاح و طلاق کے معاملات میں حیلوں سے کام لینا مکروہ ہے، حالانکہ ان کے نزدیک شریعت میں حیلہ سے کام لینا شدید جرم ہے اور اس پر ان کا ایک مستقل مکتوب موجود ہے۔ جس میں کہتے ہیں: ان من افتی بہذہ الحیل نقد قلب الاسلام ظہرا لبطن ونقض عری الاسلام عروۃ عروۃ، اسی طرح ابوعبداللہ روایت کرتے ہیں۔ یکرہ ان یتوضاء فی آنیۃ الذہب والفضۃ وان یستعمل مکحلۃ منہا۔ یعنی چاندی سونے کے باسن سے وضو کرنا اور اس کی سرمہ دانی استعمال کرنی مکروہ ہے۔ مگر یہاں مکروہ سے مقصود بالاتفاق حرام ہے، جیسا کہ مذہب حنابلہ معلوم ہے۔

مصطلح سلف اور مصطلح فقہاء

چنانچہ اسی بنا پر اہل علم نے تصریح کی ہے کہ آئمہ سلف کی اصطلاح میں کراہت کے وہ معنی نہیں جو مرتبۂ کراہت مصطلح فقہا ہے اور ایسا سمجھنا منجملہ ان سخت غلطیوں کے ہے جو تصریحات سلف کے فہم میں بعض کوتاہ متاخرین کو ہوئی اور جن امور کو انھوں نے مکروہ بمعنی

حرام قرار دیا تھا اسے مکروہ تنزیہی ٹھہرا کر لوگوں پر دروازۂ منکرات و ممنوعات کا کھول دینا چاہا اور اس طرح منکرات شرعیہ کی اہمیت عوام کے دلوں میں جو قلب میں باقی نہ رہی۔ چنانچہ حافظ ابو شامہ اس کی تصریح کر کے لکھتے ہیں، وقد غلطت جماعۃ من اتباع الائمۃ بسبب ذالک فنفت التحریم عما اطلق علیہ الائمۃ الکراہۃ ثم سہل علیہا لفظ الکراہۃ وخفت مؤنۃ فحملہا البعض علی التنزیہ وتجاوز بہ آخرون فحملوا علی کراہۃ ترک الاولیٰ فحصل بسببہ غلط عظیم علی الشریعۃ وا لائمۃ،

یعنی اس حقیقت کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ایک جماعت غلطی میں مبتلا ہو گئی اور جن جن امور کی نسبت ان کے اماموں نے کراہت بمعنی حرمت کے بولا تھا ان کی حرمت سے انکار کر دیا اور اسے وہ مکروہ سمجھ لیا جو حرام کے بعد فقہاء کا ایک ٹھہرایا ہوا درجہ ہے۔ پھر کراہت کا لفظ ان کے لئے سہل اور ہلکا ہو گیا اور اس کی ممنوعیت کی اہمیت نظروں میں باقی نہ رہی۔ پس ان میں سے بعض نے کراہت کو کراہت تنزیہی کہہ دیا، بعض۔ اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور کراہت کو ترک اولیٰ کے معنوں پر محمول کیا۔ اس طرح احکام شریعت اور مذاہب ائمہ کے بارے میں ایک بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ انتہی

اور حافظ ابن قدامہ مقدسی الفائق میں لکھتے ہیں۔ والسلف کانوا یستعملون لفظ الکراہۃ فی معناہ الذی استعمل فی الکتاب والسنۃ ولکن المتاخرین اصطلحوا علی تخصیص الکراہۃ بما لیس بحرام وترک ارجح من فعلہ ثم حملوا نصوص السلف علی الاصطلاح الحادث الموضوع فغلطوا فی ذالک، یعنی ائمہ سلف لفظ کراہت اسی لغوی معنی میں استعمال کرتے تھے، جس معنی میں خود قرآن وحدیث میں مستعمل ہوا ہے، لیکن متاخرین نے کراہت کو ایک خاص درجہ کے لئے مخصوص کر لیا جو حرام نہیں ہے اور وہ ایسی بات ہے جس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی لوگوں کو ہوئی کہ اسی نئے اصطلاحی اور وضع کیے ہوئے معنوں میں ائمہ سلف کی نصوص اور اقوال بھی لیے گئے اور جہاں جہاں انھوں نے حرام کے معنی میں مکروہ کہا تھا، اسے اپنا وضع کیا ہوا مکروہ سمجھ لیا، بس اس وجہ سے ایک سخت غلطی پیدا ہو گئی، انتہی :

ایک اہم نکتہ

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابل بیان ہے، جس کی صرف انہی اصحاب بصیرت کو خبر ہوسکتی ہے، جنھیں علوم و معارف سلف کے تدبر و تفکر کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ ائمۂ سلف افتاء و تکلم فی الشرع میں نہایت احتیاط کرتے تھے۔ خصوصاً کسی بات کو حلال کہنے یا حرام ٹھہرانے میں ان کی خشیت و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ تاکید اور دعوے کے ساتھ کبھی زبان نہیں کھلتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے کہ بقول حضرت ابن مسعودؓ ابرہم قلوباً واعمقہم علماً صرف ان کا علم ہی سب سے زیادہ گہرا نہ تھا، بلکہ ان کے دل بھی سب سے زیادہ نیک تھے، اس لئے ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں حلال حرام کے معاملہ میں کوئی لغزش نہ ہو جائے۔ ان کے سامنے قرآن کی یہ وعید موجود تھی ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ہذا حلال وہذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب۔

انھیں صحابۂ کرام کا حال معلوم تھا کہ حلت و حرمت کے افتاء میں کس قدر حزم و احتیاط کرتے تھے اور اللہ اور اس کی شریعت کی طرف کوئی حکم منسوب کرنا کس طرح ان کے لئے زندگی کا سب سے زیادہ کٹھن کام تھا۔ چنانچہ امام دارمی نے سنن میں کراہیۃ الفتیا من باب الفتیا وکرہ التنطع اور الفتیا و ما فیہ من الشدۃ کے تراجم سے ابواب باندھے ہیں اور ان میں صحابہ و سلف کے وہ اقوالُ اثمال جمع کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں کوئی حکم لگانا خصوصاً حلال اور حرام کا لفظ ان پر کیسا کٹھن تھا اور کس طرح حتی الامکان اس کی ذمہ داری سے گریز کرتے تھے۔ اس حالت کا نتیجہ یہ تھا کہ باب حلال و حرام میں ان کی ایک خاص محتاط بول چال ہوگئی تھی۔ چونکہ قرآن و حدیث میں اپنے خیال سے حلال و حرام ٹھہرانے کے لیے بڑی ہی سخت وعیدیں آئی ہیں، اس لئے حتی الامکان تاکید اور قطع کے ساتھ حلال حرام کا لفظ نہیں بولتے تھے۔ ایسے الفاظ بولتے جن میں قطع و جزم کی جگہ عموم و وسعت اور حزم و احتیاط کا پہلو ہوتا تھا۔ چنانچہ اگر کسی بات کو ناجائز اور حرام سمجھتے تو کہتے انا اکرہ ہذا، لا ینبغی ہذا، لیس بحسن، لا یعجبنی ان تفعل کذا وغیر ذالک یعنی میں اسے مکروہ رکھتا ہوں۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے پسند نہیں کہ ایسا

کیا جائے اور جب کسی بات کا وجوب ظاہر کرنا مقصود ہوتا تو اس صورت میں بھی تاکید و جزم کے الفاظ کی جگہ عموماً عام و محتاط اطلاقات سے کام لیتے مثلاً انا احب ان افعل کذا، اری ہذا حسنا، یعجبنی ان افعل کذا، یستحب ان افعل کذا، ینبغی ہذا، یعنی میں فلاں عمل دوست رکھتا ہوں۔ یہ بات اچھی ہے۔ یہ بات مجھے پسند ہے۔ چاہیے کہ ایسا کیا جائے۔ مستحب ہے کہ ایسا کیا جائے۔ ایسے موقعوں پر ان کا مقصود مستحب سے وہ ایک خاص درجۂ شرعی کا نہ تھا، جو بعد کو قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس کے لغوی معنی میں بولتے تھے یعنی یہ امر پسندیدہ ہے۔

چنانچہ اس حقیقت کی طرف خود امام مالکؒ نے اشارہ کیا ہے جیسا کہ صاحب موافقات نے بروایت ابن وہب نقل کیا ہے۔ لم یکن من امر الناس ولا من مضی من سلفنا ولا ادرکت احدا اقتدی بہ یقول فی شیٔ ہذا حلال وہذا حرام ما کانوا یجترؤن علی ذالک وانما کانوا یقولون نکرہ کذا ونری ہذا حسنا وینبغی ہذا ولا نری ہذا۔ یعنی نہ تو یہ صحابہ و سلف کا طریقہ تھا اور نہ ان لوگوں میں سے کسی کا زمانہ میں نے پایا اور جن کی میں پیروی کرتا ہوں کہ وہ کسی بات میں کہیں، یہ حلال ہے، یہ حرام ہے ایسا کہنے کی وہ جرات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا طریقہ تو یہ تھا کہ ایسے موقعوں پر کہتے ہیں کہ مکروہ سمجھتا ہوں یا یہ ٹھیک نہیں ہے یا میں نہیں دیکھتا کہ ایسا کیا جائے انتہی

پس اس سے معلوم ہوا کہ اگر حرام کے لفظ کی جگہ بعض منکرات کے لئے انھوں نے کراہت کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ان کے نزدیک حرام نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ تکلم و افتاء میں بوجہ احتیاط ان کا انداز گفتار یہی تھا۔

افسوس ہے اس معاملے کے بیان میں بہت تطویل ہو گئی لیکن ناگزیر تھی، مقصود یہ تھا لوگوں کو معلوم ہو جائے، حضرت امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور دیگر قدما فقہاء کے اقوال میں جو عبارات حلی التصویر کی نسبت کراہت کا لفظ دیکھ کر پرنسپل صاحب اور مولانا عبد الباری نے اسے غیر حرام اور پھر مکروہ تنزیہی بتلا دیا ہے، تو یہ ایک نہایت ہی افسوسناک غلطی اور علوم سلف و اصطلاح سلف سے ناآشنا ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہاں کراہت سے مقصود حرمت ہی ہے کیونکہ

اہل علم کا اتفاق ہو، اس کراہت کو خلافہ کیدانی والی کراہت سمجھ لینا اہل علم و دیانت سے بعید ہے۔ مگر یہاں کراہت کو کراہت مصطلحۂ فقہا پر محمول کیا جائے گا تو تمام کا رخانۂ حلت و حرمت درہم برہم ہو جائے گا اور کتنے ہی محرمات غیر محرمات بن جائیں گے۔ کیوں کہ سلف وائمہ کے کلام میں بے شمار محرمات قطعیہ کی حرمت لفظ کراہت سے تعبیر کی گئی ہے۔

اصول فقہ حنفیہ اور کراہت

رابعاً یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ خود اصول مقررۂ فقہ کے بموجب بھی مجرد لفظ کراہت دیکھ کر کہیں کراسے کراہت غیر حرام پر محمول کر لیا جا سکتا ہے، جبکہ پہلے پاچکا ہے کہ کراہت، میں اصل تحریم ہے، الا یہ کہ قرینۂ صارفہ تو یہ اس کے خلاف موجود ہو؟ خود حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول جامع کثیر سے علاؤ الدین بخاری نے نقل کیا ہے۔ کل مکروہ فہو حرام الا انہ لما لم یجد فیہ نصاً قاطعاً لم یطلق علیہ لفظ الحرام۔

اب اہل فہم و انصاف اس حقیقت حال کے مطالعہ کے بعد ہمارے پرنسپل صاحب اور مولانا کے اس ارشاد پر ایک آخری نظر اور ڈال لیں اور غور کریں کہ علم و فہم کے دعووں کی جرأتوں کا کیا حال ہے؟ پرنسپل صاحب مضمون کے آخر میں بڑے ہی اطمینان کے ساتھ فارغ البال ہو کر لکھتے ہیں:

> غرضکہ مولانا عبدالحی نے اپنے مضمون میں کوئی دلیل بھی حرمت پر نہیں دی ہے اور جو کچھ بھی ثابت کر سکے ہیں، وہ کراہت ہے۔

خدا را معتقدین فرنگی محل اس "غرضکہ" کی داد دیں کہ کس درجہ علم و تحقیق اپنے دامن کی وسعت میں لپیٹے ہوئے ہے؟

(۳)

عمل صحابہ سے استدلال جناب مولانا.... کے علم و تحقیق کا جو حال اس وقت تک منکشف ہوا ہے، کاش اس سے آگے نہ بڑھتا لیکن حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب وہ ایک اور قدم

آگے بڑھاتے ہیں اور کھلے بندوں بغیر کسی ادنیٰ جھجک کے ایسا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں، جس سے بڑھکر علم و حقیقت کے خلاف ادعا بکلم کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ چنانچہ اپنے مکتوب گرامی بنام مولانا محمد علی میں لکھتے ہیں:

مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ نے وہ درخت جس کے نیچے بیعتِ رضوان میں حضورؐ نے سایہ لیا تھا، بخوف پرستش کھدوا ڈالا، مگر یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ صحابہ کے وقت میں مآثر پر جو مساجد تھے ان کو حضرت نے کھودنے کا حکم نہیں دیا، حالانکہ ان کی زیارت پسند نہیں کی۔ چنانچہ سائقی سے کہا کہ ان مساجد پر اگر وقت نماز ہو تو پڑھ لیا کرو۔ اور فرمایا کہ اگلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں کہ انھوں نے معبد ایسے مآثر پر بنایا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ صحابہ میں اس کی زیارت لوگ کرتے تھے۔ حضرت کے (یعنی حضرت عمرؓ کے) تشددات کے باوجود انھوں نے یعنی حضرت عمرؓ نے نہ تو لوگوں کو زیارت و نماز سے باز رکھا نہ مساجد کو شکست کرایا۔ تفصیل اس کی غالباً مولوی عنایت اللہ صاحب کے مضمون میں ہوگی۔ اس واقعہ کو حضرت عمرؓ کے کنز العمال میں روایت کیا ہے[1] وہ تفصیل کیا ہے جو مولوی عنایت اللہ پرنسپل صاحب نے اپنے مضمون میں پیش کی ہے؟ یہ ہے کہ مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں:

اب ہم وہ عبارتیں نقل کرتے ہیں جن سے مولانا عبدالحی کے مدعا کے خلاف بھی روشنی پڑتی ہے[2]

اس کے بعد انھوں نے چند عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں ... زالہ کی کنز العمال کی وہ روایت بھی

[1] ملاحظہ ہو رسالہ البدایہ صفحہ اول۔ یہ مکتوب یا مضمون ۱۰ صفر ۱۳۴۴ھ (۹ ستمبر ۱۹۲۵ء) کے "ہمدرد" میں شائع ہوا تھا۔ مولانا نے اصل عبارت نقل کردی تھی، میں نے حوالے کی تصدیق کے لئے "البدایہ" کا ذکر مناسب سمجھا۔ [2] رسالہ البدایہ صفحہ ۲

تصریفات و تحریفات کے ساتھ ہے، جس سے مولانا.... نے استدلال کیا ہے۔ ان عبارتوں کے نقل کرنے اور انھیں مفید مدعا سمجھ کر استدلال کرنے، غلط ترجمہ کرنے اور عوام کو دھوکا دینے میں ان حضرات نے جرأت و ادعا کی جو حیرت انگیز نمائش کی ہے اس کی پوری حقیقت تو آگے کھولی جائیگی، یہاں صرف اتنے حصّے سے بحث مقصود ہے جو مولانا..... کی عبارت منقولہ میں اوپر گزر چکا ہے۔

علم وحقیقت کا تقاضا!

میرے دل میں مولانا..... کی بزرگی اور ان کی خاندانی وقار کا پورا احساس ہے۔ میں شخصاً ان کی عزت کرتا ہوں۔ میرے لئے یہ کوئی خوشگوار بات نہیں کہ ان کے علم و دیانت علم کے خلاف سختی سے زبان کھولوں، لیکن کیا کیا جائے علم و حقیقت کا لحاظ ہر طالب علم کے لئے ذاتیات و تشخص سے بالاتر ہے۔ اس کے مقابلہ میں کسی کی بھی رعایت کرنا نہ شرعاً جائز ہے، نہ عقلاً مطلوب مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ ان چند سطروں کے اندر انھوں نے اپنے علم و فہم کی جو جلوہ آرائی کی ہے، وہ نہایت درجہ افسوسناک ہے۔ علم اور دیانت علم کے خلاف اقدام و اجتہاد میں انھوں نے کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے اور کیا کہا جائے؟ میں بے علمی اور بے خبری کا لفظ نہیں بولنا چاہتا کیوں کہ اس کا استماع طبائع پر گراں ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ جو کچھ ان سطروں میں ہے، وہ بھی علم و فہم نہیں ہے۔ علم و فہم کا ضد ہے۔ اب اسے کس لفظ سے تعبیر کیجئے؟ اگر جہل نہ کہئے تو علم بھی تو نہیں کہا جاسکتا؟ یہ سچ ہے، واقعین حال کو بھی مولانا ممدوح سے اس کی توقع نہیں رہی کہ وادی علم و تحقیق میں وقت کی عام سطح سے کوئی بلند جگہ رکھتے ہیں۔ تاہم پھر بھی علوم رسمیہ کے درس و تدریس کے مشغلہ سے اتنی توقع تو کرنی ہی پڑتی ہے کہ اصول و قواعد راہ سے اقلاً آشنائی ہوگی، لیکن جیسا کہ قارئین تحریر سے خود اندازہ کرلیں گے ان مضامین سے عموماً اور سطور بالا سے خصوصاً یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت کو علوم شرعیہ کی رسم و راہ سے بلد و آشنا ہونیکا بھی ابھی موقع

نہیں ملا ہے اور میاں کی موٹی موٹی اور ابتدائی باتوں کے فہم سے بھی فکر مبارک کو ذوق و مناسبت نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مباحثِ شرعیہ میں دیانتِ کلام اور صدقِ بیان کا لحاظ ان کے نزدیک ضروری نہیں اور اگر اثبات مدعا کے لئے کوئی واقعہ اپنے جی سے گھڑ لینا پڑے یا کسی عبارت کا الٹا مطلب اور غلط ترجمہ کرنا پڑے تو اس میں چنداں باک نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی حکم و تکلم فی الشرع کے میدان میں کسی سے پیچھے رہ جانا بھی پسند خاطر نہیں اور ساری آفت یہی نہیں ندسری ہے

واذا لم تری الہلال فسلم لاناس راؤہ بالابصار

ارشادات کا خلاصہ

اب اس اجمال کی تفصیل سنیئے: مولانا نے ان چند سطور میں حسب ذیل امور بیان کیے ہیں، بعض بہ طریقِ استدلال بعض بہ طریقِ استنباط اور بعض بر سبیلِ روایت:

۱۔ صحابۂ کبار کے زمانہ میں آثار متبرکہ پر مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں اور لوگ ان مقامات کی بہ حیثیت یادگار ہونے کے زیارت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اگرچہ بیعتِ رضوان والا درخت بخوف پرستش کٹوا دیا، لیکن ایسی عمارتوں کے گرانے کا حکم نہیں دیا۔

۲۔ کنز العمال میں ہے حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ان مساجد (آثار متبرکہ والی مساجد) پر اگر نماز کا وقت ہو تو نماز پڑھ لیا کرو، لیکن ان کی زیارت پسند نہیں کی۔ نیز فرمایا اگلی امتیں اس لئے ہلاک ہوئیں کہ انھوں نے معبد ایسے مآثر پر بنایا تھا۔ مولانا اس روایت کی نسبت کہتے ہیں کہ اس سے صرف معلوم ہی نہیں ہوتا بلکہ "صاف" معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ صحابہ میں ایسے مآثر کی زیارت لوگ کیا کرتے تھے۔ یعنی اس کے اثبات کے لئے کسی بحث و نظر کی ضرورت نہیں ہے، بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

۳ ۔ اس بارے میں حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل "تشددات" میں سے تھا ۔
۴ ۔ حضرت نے باوجود اپنے تشددات کے لوگوں کو ان مساجد کی زیارت اور نماز پڑھنے سے باز نہیں رکھا ۔

اب سنئے ان علوم وتحقیقات اربعہ کی حقیقت کیا ہے ؟

عہدِ صحابہؓ اور آثارِ متبرکہ

اولاً ۔ یہ بات کس درجہ دیانتِ علم سے بعید ہے کہ نزاع قبروں اور یادگاروں پر عمارت بنانے اور انھیں بطور زیارت گاہ استعمال کرنے میں ہے ، نہ کہ ان مساجد میں جو کسی یادگار پر تعمیر کی گئی ہوں ۔ کہ معظمہ میں بھی جو ماتوہ پیش آیا ہے وہ ایسی عمارتوں کے انہدام کا ہے نہ کہ ماثر کی مساجد کے انہدام کا ، لیکن مولانا اس کی دلیلیں ڈھونڈ رہے ہیں کہ ماثر کی مساجد کا انہدام ضروری ہے یا نہیں ؟ کیا اس لئے نہیں ہے کہ عمارت علی القبور والآثار کے اثبات کے لئے چونکہ کوئی راہ شرعاً نہیں ملتی اس لئے اس سے گریز کر کے مسجدوں کے معاملہ پر زور دیا جا رہا ہے ؟ تاکہ عوام اور معتقدین پر ما بہ النزاع کی حقیقت مشتبہ ہو جائے اور وہ اس طرح کے اثبات واستدلال کی نمائش دیکھ کر دھوکے میں پڑ جائیں ۔

ایک بے بنیاد بیان !

ثانیاً ، اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ما بہ النزاع مسئلہ مساجد علی الآثار کا ہے ، جب بھی اس عجیب الخلقت طریقِ استدلال کی بوالعجبی قابلِ تماشا ہے نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے بیانات دیکھ کر ہر خالی الذہن شخص یہی سمجھے گا کہ سچ مچ کو عہدِ صحابہ میں یادگاروں پر مسلمان مسجدیں تعمیر کیا کرتے تھے ۔ جبھی تو اس بے باکی سے مولانا نے اس سے استدلال کیا ہے ، لیکن ہر نہیں سمجھتا اس کی حیرت کا کیا حال ہوگا ، جب وہ معلوم کرے گا کہ یہ بیان نہ صرف بے اصل و بنیاد ہو بلکہ حقیقتِ حال بالکل اس سے الٹی ہے ۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا زمانہ تو ایک ایسا زمانہ تھا جو اسلام کے روحِ علم وعمل کا نمونہ تھا اور ماثران کے زمانے میں

بھی ایسے بدعات و محدثات رواج پا سکتے تھے تو پھر اسلام اور مسلمانوں کے لئے عمل بالشریعت کا دنیا میں کوئی نمونہ وجود نہیں رکھتا اور دونوں پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے یہ بات کہہ کر خلاف حقیقت ادعا کی حد کردی۔ میں ان تمام لوگوں کو جن کی نظر سے مولانا کی تحریر گزری ہو، علی وجہ البصیرت بتلانا چاہتا ہوں کہ مولانا کا یہ دعوئے اس عہد کی نسبت ایک صریح اتہام ہے۔ یا در کھا جائے مابہ النزاع یہ بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے عہد میں بزرگوں کی یادگاروں پر بہ نیت تبرک و زیارت عمارتیں (خواہ وہ مسجد ہوں یا غیر مسجد) بنائی جاتی تھیں یا نہیں ؟ مولانا نے بیان کیا ہے کہ بنائی جاتی تھیں اور اس سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ باوجود ان کے وجود کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منہدم نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قطعاً غلط ہے۔ عہد صحابہ میں ایسی عمارتوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بیان کیا جا سکتا۔ خلاف حقیقت اظہار کی یہ انتہا ہے کہ پہلے تو سرے سے ایک بے اصل بات اپنے جی سے گھڑلی جائے، پھر اسے مسلّم واقعہ قرار دے کر اس سے استدلال کیا جائے اور اس طرح حقیقت کو پیچ در پیچ غلط فہمیوں اور کذب آفرینیوں میں ملفوف کر کے لوگوں کو حیران اور درماندہ کر دیا جائے۔

عہد صحابہ اور مآثر و قبور

حقیقت حال یہ ہے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا شرک اور بت پرستی میں غرق تھی اور منجملہ اقسام شرک کے ایک بڑی مہلک قسم یہ تھی کہ بزرگ اور مقدس انسانوں کی محبت و احترام کے غلط استعمال کی وجہ سے لوگوں نے ان کی اور ان کے آثار کی پرستش شروع کر دی تھی۔ کتنی ہی قوموں میں بت پرستی کا دروازہ اسی آثار پرستی سے کھلا۔ ابتدا میں یہ ہوا کہ کسی بزرگ اور مقدس انسان نے دنیا سے انتقال کیا۔ اس کی محبت وارادت کی وجہ سے اس کی یاد اس کے آثار و تبرکات کی لوگوں نے عزت و عظمت کرنی شروع کر دی۔ عزت نے کچھ دنوں کے بعد اجلال و تعظیم کی شکل اختیار کی، اجلال و تعظیم پرستش و تعبد کا ذریعہ بن گئی۔ چنانچہ ترجمان القرآن

حضرت عبداللہ بن عباس نے سورۂ نوح کی تفسیر میں بسند صحیح فرمایا۔ انسانی پرستش کا اولین سرچشمہ یہی معاملہ تھا۔ اسلام دین آخری تھا اس لئے وہ ان تمام راہوں کو قطعاً بند کر دینا چاہتا تھا جو آگے چل کر شرک کا ذریعہ بن سکتی تھیں، اس لئے اس نے اس طرح کی تمام باتیں روک دیں اور صرف روکی ہی نہیں بلکہ ان کے منع میں اس قدر شدت و اہتمام کیا کہ جس بات میں کوئی ادنیٰ سی وجہ مشابہت یا وجہ اشتباہ پائی تو اس سدًا للذریعہ اس کا انسداد کر دیا۔ پوری تفصیل اس کی اس وقت آئے گی، جب علوم و تحقیقات فرنگی محل کے نظارہ و تماشا کے بعد اصل موضوع پر فرصت التفات ملے گی۔ یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ بزرگوں کے آثار کی محبت و تعظیم کی افراط بھی منجملہ ذرائع شرک و تعبد غیر اللہ تھا، اس لئے اسلام نے اس کی روک میں بھی اہتمام بلیغ کیا اور اوائل میں مسلمانوں نے بوجہ قرب عہد جاہلیہ جب کبھی کوئی ایسی بات کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سخت غضب ناک ہوئے اور بلا استثناء یہی حال عہد خلفائے راشدینؓ اور عہد صحابہؓ کا رہا۔ نظائر و شواہد اس کے بے شمار ہیں۔

سب سے بڑی آزمائش

لیکن چونکہ معاملہ نہایت نازک تھا۔ محبوب و مطاع کی محبت و تعظیم اور مبغوض و مطرود سے تنفّر و استکراہ طبیعت انسانی کا قدرتی مقتضا ہے اور چونکہ نوع انسانی کے لئے راہ عمل کی سب سے بڑی آزمائش اسی میں ہے کہ فطری امیال و جذبات میں عدل و اعتدال ملحوظ رکھا جائے نیز چونکہ اسلام سے پیشتر تمام قومیں انبیاء و اکابر امت کے قبور و آثار کو پرستش گاہ بنا چکی تھیں اور نسلاً بعد نسلٍ اس بات کی علت و الفت طبائع میں راسخ ہو چکی تھی، اس لئے اگرچہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معجزانہ قوت اصلاح و انقلاب سے توحید کامل اور دین اللہ الخالص پر لوگوں کو مستقیم کر دیا تھا، تاہم بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ لوگ جذبات عقیدت و محبت سے بے اختیار ہو کر کوئی ایسی بات کر بیٹھتے تھے، جس سے بزرگوں کے آثار و منسوبات کو زیارت گاہ بنانے کی راہ کبھی نہ کبھی نکل سکتی تھی یا حد شرع سے متجاوز تعظیم و اجلال موصل

اہل الشرک کے نظریہ کا اس میں امکان تھا، چونکہ عہد صحابہؓ میں اسلام کی روح علم و عمل پر سرایت نہیں
ہوئی تھی اور اس کا سلطان دلوں و نفوس پر حاوی تھا۔ اس لئے عامۃ الناس کے جذبات بھی
ضبط و حدود شرع سے متجاوز ہو کر ابھر نہیں سکتے تھے۔ جب کبھی کوئی ایسی بات کسی سے
سرزد ہو جاتی، ولاۃ الامور فوراً اس کی روک تھام کر دیتے۔ عوام کے یہ جذبات تعظیم و
اجلال ہر حال میں قابل روک تھام بھی نہیں ہوتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی ایسی بات کی
جاتی جو فی نفسہٖ تو حدود شرع سے متجاوز نہ تھی، لیکن اس میں اس کا امکان تھا کہ آگے چل کر بن جائے
چونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو معلوم تھا کہ گزشتہ اقوام خصوصاً اہل کتاب کے مبتلائے شرک
ہونے کی راہ بھی ابتداء میں انہی باتوں سے کھلی تھی۔ اس لئے وہ ایسی باتوں پر بھی چونک اٹھتے اور
فوراً روک تھام کرتے۔

یادگار بیعت رضوان اور حضرت عمرؓ

منجملہ اس طرح کے واقعات کے وہ دو واقعے بھی ہیں، جن کا کچھ عجیب طرح کی تحریف
و تخییل کے ساتھ مولانا نے ذکر کیا ہے۔ پہلا واقعہ شجر بیعت رضوان کا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام رضوان اللہ سے بیعت جہاد لی تو ایک درخت
کے نیچے تشریف فرما تھے۔ اس لئے وہ بیعت درخت والی بیعت کے نام سے مشہور ہو گئی۔
سورۂ فتح میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ یعنی
اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا جب کہ وہ درخت کے نیچے تیرے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔
یہ درخت حضرت عمرؓ کی خلافت تک موجود تھا، لیکن جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام و بیعت کی وجہ سے اس جگہ کو متبرک سمجھنے لگے ہیں اور
بہ نیت تبرک اس کا قصد کرتے ہیں اور اس کے نیچے نماز پڑھتے ہیں تو انہوں نے حکم دیا کہ
اسے جڑ سے کٹوا کر پھینک دیا جائے تاکہ اس کا اور اس جگہ کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔
چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں [illegible] نافع سے روایت کی ہے [illegible] عمر [illegible] الشجرۃ

التی بویع تحتہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقطعہا لان الناس کانوا یذہبون فیصلون تحتہا فخاف علیہم الفتنۃ

یعنی حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ درخت اکھاڑ دیا جائے جس کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے بیعت رضوان لی تھی۔ چونکہ وہاں لوگ جانے لگے تھے اور اس کے نیچے نماز پڑھتے تھے اس لئے انھیں فتنہ کا خوف ہوا اور اسی لئے اسے کٹوا دیا۔ انتہیٰ اور صحیح بخاری میں بھی حضرت ابن عمرؓ سے ہے کہ اس درخت کے باقی نہ رکھنے میں یہ مصلحت تھی کہ آگے چل کر مسلمانوں کے لئے فتنہ کا موجب نہ ہو جائے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انتساب کی وجہ سے لوگ اس کی تعظیم و اجلال شروع نہ کردیں۔

قابل توجہ امور

اس روایت سے معلوم ہوا کہ:

۱۔ بیعتِ رضوان والا واقعہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی عظیم الشان واقعہ تھا۔ یہ درخت اس واقعہ کی یادگار تھا۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم میں اس درخت کا ذکر کیا تھا اور اس طرح قیامت تک کے لئے اس کا تذکار محفوظ کر دیا تھا۔ تاہم جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ اس انتساب کی وجہ سے اس نے عوام کی نظروں میں خصوصیت حاصل کرلی ہے اور لوگ تبرک کے خیال سے اس کے نیچے آتے اور اس کا قصد کرتے ہیں تو اسے کٹوا دیا۔ تمام مجمع صحابہؓ میں سے کسی نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا اور جیسا کہ اصول میں طے پاچکا ہے اس سے صحابہؓ کا اس عمل پر اجماع تقریری ثابت ہو گیا۔

۲۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اس باب میں شرعاً جو حالت مخدوش ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایسے مقامات کی زیارت کا لوگ قصد و اہتمام کرنے لگیں، نہ کہ مجرد یادگاروں اور مآثر کا وجود۔ قصد و اہتمام سے مقصود یہ ہے کہ مقدس انتساب کی وجہ سے اسے ایک مقدس مقام یقین کرکے زیارت کے لئے لوگ جائیں اور سمجھیں اس سے انھیں ثواب اور برکت حاصل ہوگی، لیکن اگر اس حد تک معاملہ نہیں پہنچا ہے اور لوگ ایک مقام کو محض ایک یادگار کی حیثیت سے

پہچانتے ہیں اور اس کی پہچان کی وجہ سے ان میں صاحب یادگار کی محبت و عزت کے جذبات بھی حرکت میں آجاتے ہیں جو خاصۂ انسانی ہے اور جب کبھی اس برگزیدہ جائے اسے دیکھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں تو اس حد تک شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔ شریعت ایسی یادگار کی مخالف نہیں ہے چنانچہ آگے چل کر واضح ہوگا کہ یہ درخت اس حیثیت سے برسوں تک معروف رہا، مگر صحابہ کو کٹوانے پر توجہ نہ ہوئی، کیونکہ یادگار کا معاملہ حد اعتدال سے متجاوز نہیں ہوا تھا، لیکن جونہی متجاوز ہوا فوراً حضرت عمرؓ چونکے اور حکم دیا، جڑ سے کٹوا کر زمین اس طرح صاف کر دو کہ آئندہ اس کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے اور لوگ سراغ نہ لگا سکیں۔

معاملے کی اہمیت

۳۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ معاملہ شریعت کی نظروں میں کس درجہ اہم ہے اور ذرائع و وسائل مفاسد کے انسداد میں صحابہ کرام کو کہ اسرار شرع کے محرم راز تھے کس درجہ اہتمام بلیغ تھا؟ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت ان بدعات و رسوم کا مسلمانوں کو وہم و گمان بھی نہ گزرا تھا جو بعد کو غیر اقوام کے اختلاط و اتباع سے پھیلیں۔ لوگوں نے اس درخت کے پاس عمارت یا گنبد نہیں بنایا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کی جگہ گھیر کر اسے سنگ مرمر سے پاٹ نہیں دیا تھا۔ چاندی کا کوئی کٹہرا نہیں تھا۔ زرکار اور منقش چادر نہیں ڈالی تھی۔ پھول نہیں چڑھائے جاتے تھے۔ گلاب سے دھو کر اس کا پانی بطور تبرک کے نہیں بٹتا تھا۔ جھاڑ فانوس اور شمعیں وہاں نہ تھیں۔ لوگ آکر اسے بوسہ نہیں دیتے تھے۔ زمین بوس سجدے نہیں کرتے تھے۔ رحبت قہقری کرکے واپس نہیں ہوتے تھے۔ ہاتھ باندھ کر تعبد و ابتہال اور خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے نہیں رہتے تھے۔ ایک دربار شاہی اور معبد الہٰی کی طرح وہاں تمام سرو سامان درست نہیں کیا گیا تھا۔ پھر ان سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ لوگ اپنی تکلیفوں اور احتیاجوں میں اس کی منتیں نہیں مانا کرتے تھے۔ چڑھاوے اور نذرانے نہیں چڑھاتے تھے۔ کوئی خاص دن ان کی زیارت کا مقرر کر کے (جیسے اصطلاح رسولؐ میں

عہد کرنا کہا گیا ہے، وہاں مثل موسم حج کے اجتماع نہیں ہوتا تھا اور لوگ اپنے حوائج کی طلب نہیں کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ بات جو ہوتی تھی، یہ تھی کہ جب لوگ اس مقام پر سے گزرتے تھے۔ تو ایک عظیم واقعہ اور ایک عظیم و مقدس انسان کی یادگار سمجھ کر بہ نیت تبرک و ثواب اس کا قصد کرتے اور وہاں جا کر بجائے بدع و رسوم کے نماز پڑھتے جو افضل العبادات والاعمال ہے، لیکن چونکہ اس بات میں بھی اس کے زیارت گاہ بن جانے کا دروازہ کھلتا تھا اور ایسے مقامات کا خصوصیت کے ساتھ قصد و اہتمام کرنا ہی ہر طرح کی خرابیوں کی بنیاد تھا، اس لئے صحابہ کرام نے سداً للذریعہ فوراً انسداد کر دیا اور یہ مجرد و سادہ صورت حال بھی تعظیم و تبرک کی گوارا نہ کی۔ پھر خدا را وہ دل جن پر تعلیماتِ بار اور الفتِ رسوم نے ابھی اس درجہ قبضہ نہیں پایا ہے کہ نورِ ایمان و شرع بکلی محجوب ہو گیا ہو، انصاف کریں کہ اگر آج صحابۂ کرام وہ تمام باتیں دیکھتے جو یادگاروں اور قبروں پر کی جا رہی ہیں تو ان کا کیا حال ہوتا اور وہ ہماری آبادیوں کو مسلمانوں کی آبادیاں سمجھتے یا کسی دوسری قوم کی؟

برائیوں کے انسداد کا اصول

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ جو برائی جس درجہ قوی و عام ہوتی ہے اتنی ہی قوت و شدت کے ساتھ اس کا دروازہ بھی بند کرنا پڑتا ہے۔ برائیوں کی اصلاح و انسداد میں شارع کے احکام و اعمال بھی اسی اصل پر مبنی ہیں۔ چونکہ محبت و تعظیم کا معاملہ انسانی قلب کے لئے نہایت نازک واقع ہوا ہے اور کوئی قوم راہ توحید و دین الخالص سے نہیں بھٹکی مگر محبت و تعظیم کی بے اعتدالی سے، اس لئے اسلام نے اس کے انسداد میں بھی کمال شدت و اہتمام کیا اور ایک چھوٹا سا سوراخ بھی کہیں کھلا نظر آیا تو فوراً اسے بند کر دیا۔ یہی حال صحابہ کرام کا تھا۔

م۔ اس معاملے میں اکثر معاملات کی طرح دونوں باتوں کے درمیان مقابلہ تھا۔ ایک طرف فائدہ تھا، دوسری طرف نقصان۔ فائدہ یہ تھا کہ کسی اہم اور مقدس معاملہ کی یادگار کا باقی

رہنا مفید ہے ۔ یہ ہمیشہ آنے والی قوموں کو اس کی یاد دلاتا ہے اور ان کے جذبات و عواطف کے لئے عبرت و تذکرہ کا موجب ہوتا ہے ۔ یہ درخت تاریخ اسلام کے ایک عظیم الشان واقعہ کی یادگار تھا، جس نے فی الحقیقت فتح مکہ کی راہ کھولی اور یہی فتح اسلام کی آخری فتح عظیم اور کارہ بارودین کی تکمیل تھی ۔ ایسی یادگار کا قائم رہنا درا صل اسلامی فتح عظیم کے ایک بنیادی واقعہ کی تذکار کا باقی رکھنا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ایک نقصان بھی تھا، یعنی لوگوں نے فرط اعتقاد و تعظیم سے خصوصیت کے ساتھ زیارت شروع کر دی تھی ۔ وہاں جانے اور نماز پڑھنے میں اہتمام کرنے لگے تھے ۔ اگر یہ حالت گوارا کر لی جاتی تو ایک بہت بڑے شرعی اور اساسی نقصان یعنی غیر شرعی زیارت گاہ کے بن جانے اور لوگوں کے شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کا دروازہ کھل جاتا ۔ اب مزید ی ہوا کہ فائدہ اور نقصان دونوں تولے جائیں اور دیکھا جائے، باقی رکھنے کا فائدہ زیادہ ہے یا نقصان؟ ساتھ ہی اس اصل پر بھی غور کیا جائے کہ اگر کسی معاملہ میں فائدہ اور نقصان دونوں کا پہلو موجود ہو تو رعایت دفع مضرت کی مقدم ہے یا جلب منفعت کی؟ حضرت عمرؓ اور صحابہ کرامؓ کو حقائق شرع کے نکتہ شناس تھے اس کا فیصلہ کرنے میں کچھ دشواری پیش نہ آئی ۔ انھوں نے بلا تامل فیصلہ کیا کہ اس درخت کے رکھنے میں فائدہ سے زیادہ نقصان کا دفع کرنا فائدہ کی تحلیل پر مقدم ہے پس بلا تامل کٹوا دیا ۔ ایسے ہی احکام و اعمال سے فقہائے امت نے یہ اصل عظیم مستنبط کی ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے ۔

معیار کا معاملہ

۵ ۔ اس سے یہی معلوم ہوا کہ بزرگوں کی تعظیم و احترام کا ایسے معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور معیار اس باب میں وہ ہونا چاہیئے جو خود ان کی تعلیم سے قرار دیا گیا ہو اور شریعت نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی ہو، نہ کہ وہ اوہام وہ وساوس جو یہ اسم احترام اکا برہم نے اپنے جی سے گھڑ لیے ہیں ۔ خود کر دہ مسلمانوں کے لئے اس دنیا میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے وجود مقدس و مبارک سے بڑھ کر مستحق تعظیم و احترام کون وجود ہو سکتا ہے۔ جس کی تعظیم خدا نے ہر مسلمان پر بحکم " و تعزروہ و توقروہ " فرض کردی ہے اور جس کی بے احترامی کا ارادہ کرنا بھی ایک مسلمان کے لئے بدترین کفر ہے۔

پھر اس پر بھی غور کرو کہ صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدین سے بڑھ کر اس وجود مقدس کی تعظیم کرنے والی اور کون سی جماعت علی وجہ الارض ہو سکتی ہے؟ انہی حضرت عمرؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کی آواز خلقی طور پر اونچی تھی۔ بات کرتے تو معلوم ہوتا پکار رہے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور چیخ کر بات کر بیٹھے۔ ایک روایت کے بموجب اس رفع صوت میں حضرت ابوبکرؓ بھی شریک تھے۔ اس پر سورۂ حجرات کی یہ آیت اتری " لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجہروا لہ کجہر بعضکم لبعض الخ[1] راوی کہتے ہیں جس دن یہ آیت اتری اس کے بعد سے حضرت عمرؓ کا یہ حال ہو گیا تھا گویا ان کی خلقی آواز ہی بدل گئی تھی۔ آنحضرت صلعم کے حضور بات کرتے تو اس قدر آہستہ اور نرمی کے ساتھ گویا کوئی راز کی بات کان میں کہی جا رہی ہے۔ صحیح بخاری میں بروایت ابن ابی ملیکہ ہے:

اذا حدث النبی بحدیث حدثہ کاخی السرار ولم یسمعہ حتی یستفہمہ[2]۔ آنحضرت صلعم کے وصال فرمانے کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ مسجد نبوی میں جاتے تو قبر مطہر کے قرب کے وجہ سے یہ کمال تعظیم و ادب منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ کسی آدمی کو وہاں پکار کر بات کرتے دیکھتے تو سخت غضب ناک ہوتے اور فرماتے ترفعون اصواتکم فی مسجد رسول اللہ؟ غور کرو ان کے اور ان جیسے صحابہ کرام و عشاق رسولؐ سے بڑھ کر کن کے دل میں ان کا عشق و احترام ہو سکتا ہے؟

[1] اے ایمان والو! بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر اور اس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے تڑختے ہو ایک دوسرے پر، کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمہارے کام اور تم کو خبر بھی نہ ہو (سورۂ حجرات)

[2] یعنی حضرت عمرؓ اس آیت کے نزول کے بعد اس قدر آہستہ بات کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے پوچھنا پڑتا تھا۔

حضرت عمرؓ کا عمل!

بایں ہمہ انہی حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ اس تاریخی درخت کی لوگوں نے بالقصد واہتمام زیارت شروع کردی ہے اور بہ نیت تبرک وہاں جاکر نماز پڑھتے ہیں تو انھوں نے اس بات کی ذرا بھی پرواہ کی کہ یہ درخت کس ذاتِ گرامی کی طرف منسوب ہے اور اس کی ٹہنیوں اور پتوں کے نیچے کونسا وجود جلوس فرما ہوچکا ہے۔ بلا تامل اکھاڑ پھینکنے کا حکم دے دیا اور تمام صحابہ میں سے کسی کا نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا ادب واحترام کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ادب واحترام کا عین مقتضیٰ یہی ہے۔ بزرگوں کی سچی تعظیم یہ نہیں ہے کہ ان کی یا ان کے منسوبات کی پرستش کی جائے یا ایسی باتیں کی جائیں جو پرستش کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ایسا کرنا تعظیم کی جگہ عین بے احترامی ہے اور اس کا ازالہ مقتضائے تعظیم ومحبت ہے، نہ کہ اس کا ابقا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ وغیرہم انبیائے کرام کے مجسمے خانہ کعبہ میں توڑے اور حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک سے تڑوائے۔ یہ ان انبیا کی تعظیم تھی یا بے احترامی تھی؟

پھر جب خود حضرت سرور عالمؐ شہنشاہ کونینؐ کا انتساب حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کے لئے مانع ازالہ نہ ہوا تو بتلاؤ ان سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے کون ہے، کس کی نسبت اور یادگاریں محترم ہوسکتی ہیں؟

درخت اور عمارتیں

۶۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس مقام اور چیز کی نسبت ایسا خطرہ لاحق ہوجائے بہتر یہی ہے کہ اسے اس طرح معدوم کردیا جائے اور اس کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔ آگے چل کر اگر گمراہ طبائع اس کا کھوج لگانا چاہیں اور زیارت گاہ بنانی چاہیں تو اس کا موقع ہی باقی نہ رہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اگرچہ یہ بھی کرسکتے تھے کہ لوگوں کو روک دیں یا اور کوئی ایسی بات کی روک تھام کی مع انقاے تجویز کردیں، لیکن آپ نے یہ نہیں کیا، بلکہ جڑ سے اکھڑوا کر

زمین صاف کردی تاکہ اس موضع اور درخت کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے ۔ صحابہ کرامؓ نے ایسا ہی حضرت دانیال علیہ السلام کی حنوط (ممی) کی ہوئی نعش کی تدفین میں کیا تھا، جب کہ وہ فتح تستر میں برآمد ہوئی تھی اور کوئی علامت قبر کی باقی نہیں چھوڑی تھی، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

۲۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اگر لوگوں نے کسی ایسی یادگار پر عمارت بنا کر اسے ایک مستحکم اور دائمی زیارت گاہ بنا دیا ہو اور قصد و اہتمام کے ساتھ لوگ اس کی زیارت کرتے ہوں تو بہ درجہ اولیٰ اس کا گرا دینا بھی ضروری ہوگا کیوں کہ درخت کوئی ایسی چیز نہ تھا جسے لوگوں نے بہ نیت تعظیم و اجلال بنایا ہو۔ ایک خود رُو چیز تھی جو بیعت رضوان سے نہیں معلوم کتنے برس پہلے سے موجود تھی۔ تاہم اسے اکھڑوا دیا گیا۔ پس جب درخت کے ساتھ ایسا کیا گیا، جس کی بنا بہ نیت تعظیم و زیارت نہ تھی تو لوگوں کی بالقصد بنائی ہوئی عمارت کا انہدام تو بہ درجۂ اولیٰ ضروری ہوگا، کیونکہ وہ خاص اسی غرض سے بنائی گئی ہے اور اپنی تعمیر ہی میں خلاف شرع اور موجب فتنہ ہے

(۳)

لطیفہ| یہاں ایک لطیفہ اہل ذوق کے تفنن طبع کے لئے لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولانا عبدالباری نے لکھنو میں ایک جلسہ امیر ابن سعود کے خلاف منعقد کیا تھا اور اس میں اپنی ایک تحریر پڑھوائی تھی۔ اس میں گنبدوں کے لئے لکھتے ہیں:

"گنبد مقابر پر سے اتارے جا سکتے ہیں مگر ادب و تعظیم کے ساتھ نہیں اتارے گئے۔"

لیکن اول تو اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انہدام عمارت میں ادب و تعظیم کی رعایت سے حضرت کا مقصود کیا ہے؟ اگر عمارت ڈھائی جائے گی تو ڈھائی ہی جائے گی، خواہ کتنا ہی ادب و تعظیم ملحوظ ہو۔ بہرحال یہ تو نہ ہوگا کہ گلاب چھڑک کر یا پھولوں کی چھڑی چھو کر گرائی جائے۔

پھاوڑا اور کدال ہی چلانا پڑے گا اور جو کچھ واقع ہو گا وہ ہدم وانہدام اور شکست وتخریب ہی ہوگی' تعمیر وتکوین نہ ہوگی۔ پھر اس انہدام وتخریب میں طریق ادب وتعظیم اور شیوۂ بے ادبی وبے احترامی کی تفریق کیوں کر کی جائے اور اس کا معیار اور ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ مزید برآں یہ نہیں معلوم کہ یہ جو حضرت عمرؓ نے "بیعت رضوان والا درخت جڑ سے کٹوا دیا تو یہ قاعدہ جدیدہ "تعبیۂ فرنگی محل" ادب وتعظیم" کے ساتھ لوگوں نے اس پر پھاوڑا چلایا تھا بے احترامی کے ساتھ؛ یقیناً یہ کسی روایت میں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ حکم دیا ہو کہ باقاعدہ وضو کرکے اور تسبیح ہاتھ میں لے کر اور بجذ ذاتی سلگا کر یا گلاب اور کیوڑہ چھڑکتے ہوئے درخت کاٹا جائے؛ لیکن اگر کسی "کنز العمال" میں ایسا بھی آیا ہو یا مولانا کے اکابر کے ملفوظات میں کہیں درج ہو جیسا کہ "قبر اور جسم" کے علاقے کا نکتۂ بلیغ اور لطیفۂ عجیب اس تحریر میں حوالۂ قلم ہوا ہے تو امید ہے کہ مولوی عنایت اللہ صاحب یا قطب میاں صاحب کا ارشاد ہو جائے گا کہ کسی تحریر میں اسکی تفصیل بھی کر دیں جیسی کہ ماشاء اللہ زیر نظر مضمون میں کی گئی ہے، لیکن اگر اول الذکر کو بوجہ پرنسپلی' اور ثانی الذکر کو بوجہ مولی عہدی' فرصت تحریر نہ ملے تو خیر سے الطاف میاں حضر وسفر میں حضور والا کی سعادت سے مالامال ہیں انہیں حکم ہو جائے کہ ایک پوسٹ کارڈ "ہمدم" کے نام بھیج دیں۔

تعجب انگیز جرأت وبے باکی

اب ملاحظہ ہو ایک ایسے صاف اور قطعی الدلالت واقعہ کو، جو ان کے خلاف از سرتاپا حجت پر حجت اور برہان پر برہان ہے، کس تعجب انگیز جرأت وبے باکی کے ساتھ ٹھکرا دیا جا رہا ہے، بجائے اس کے اس کا جواب دیں، خود اپنے جی سے ایک بات گھڑ کر اور اسے مسلم الثبوت قرار دیکر ہم سے سوال کرتے ہیں: حضرت عمرؓ نے درخت کو اکھڑوا دیا، لیکن مآثر کی عمارتیں کیوں نہیں منہدم کرائیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ گویا ان کے عہد میں مآثر پر عمارات ومساجد زیارات کا ہونا ایک ایسا مسلم ومحقق واقعہ ہے کہ اس کے لئے کسی اثبات کی ضرورت نہیں۔

صرف ہم جیسے ناواقفوں کو یہ سمجھا دینا باقی رہ گیا ہے کہ انھیں منہدم کیوں نہیں کیا گیا؟ اس پر غور کریں۔ فسبحانک ہذا بہتان عظیم؛

حقیقت یہ ہے کہ فقدانِ امتیازِ حق وباطل کی حد ہو گئی۔ ایسی صریح غلط بیانات کھلے بندوں نہ صرف بیان کی جاتی ہے بلکہ اس سے استدلال کیا جارہا ہے۔ ہم اہلِ علم کے فہم ما استدلال کی غلطی ظاہر کرسکتے ہیں، لیکن یکسر غلط بیانی کے جواب میں بجز اس کے سر پیٹ لیں اور کیا کر سکتے ہیں؛ میں کہتا ہوں پہلے خدارا یہ تو ثابت کر دیجیے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں آثار متبرکہ پر عمارتیں اور مسجدیں بنائی گئی تھیں اور لوگ بالقصد واہتمام ان کی زیارت کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ ہم سے سوال کیجیے گا کہ حضرت عمرؓ نے کیوں نہیں گرائیں؟

ایک سوال اور حقیقتِ حال

جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایسی عمارتیں تھی ہی نہیں تو گراتے کیسے؟ ہوا کو گھلاتے؟ عمارت کا اس نیت سے تعمیر کرنا تو بہت بڑی بات ہے اس کا تو صحابہؓ کو وہم وگمان بھی نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے تو یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ ایک درخت کا وجود بھی باقی رہے جو اس نیت سے اگایا نہیں گیا تھا، بلکہ پہلے سے موجود تھا، صرف یہ ہوا تھا کہ بوجہ ایک مقدس انتساب کے عوام اس کے نیچے خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنے لگے تھے۔ جب یہ صاف اور واضح عمل صحابہؓ کا موجود ہے تو اب دنیا کی کس سمجھ بوجھ میں ایسی اشیاء کا انہدام وانسداد ثابت نہیں ہوتا اور یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ بھلا حضرت عمرؓ نے ایسی باقی کیوں چھوڑ دیں؟ یہ کیا عقل وبصیرت کا قتل عام ہے۔ آخر کوئی بتلائے انھوں نے باقی کہاں چھوڑ دیں؟ ایک درخت سے اس طرح کا کھٹکا ہوا تھا، اسے جڑ سے اکھڑوا پھینکوایا۔ خدارا معتقدین ومریدین مولانا صاحب انصاف کریں

. . . .

کریں۔ یہاں جو کچھ واضح کرنا مقصود ہے یہ ہے کہ اگر شرعِ ذہن میں عدم تقدم وعدم وجود سے وقوع ووجود پر استدلال جائز ہو سکتا ہے تو مولانا کا استدلال بھی قابل قبول ہے، ورنہ واقعہ نفس الامر کو دیکھیے کہ عہد صحابہ میں [illegible]

انھیں وہم و خیال بھی ہوا تھا جو ایسی عمارتوں سے وابستہ ہیں۔ ایسی عمارتیں اس عہد میں فرض کرکے ان کے منہدم نہ ہونے سے استدلال کرنا نہ صرف بہ اصطلاح فن مناظرہ مصادرہ علی المطلوب ہے بلکہ غلط بیانی کی جرأت کی انتہا ہے اور اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی بدبختی نہیں ہو سکتی کہ جو لوگ علما کے بھیس میں رہتے ہوں اور درس و تدریس علوم دینیہ کا مشغلہ رکھتے ہوں ان کے قلم سے ایسی بات کا صدور ہو۔

روایت معرور بن سوید | لیکن نہیں، مولانا صاحب نے تو اس کے ثبوت میں ایک واقعہ بھی نقل فرمایا ہے اور کمال شانِ علم و تخریج کے ساتھ کنز العمال کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ نیز پرنسپل صاحب نے از راہ عنایت اصل روایت بھی نقل کر دی ہے اگرچہ تصحیف و تحریف کے ساتھ۔ بہرحال آیئے، دیکھیں صرف حضرت کے علم و دیانت کی نمائش کے عجائب و خوارق کا کیا حال ہے؟

مولانا کا بیان پھر ایک مرتبہ یاد کر لیجئے فرماتے ہیں حضرت عمر نے ان کے کھودنے کا حکم نہیں دیا۔ دلیل یہ ہے کہ کنز العمال میں ہے آپ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ان مساجد پر اگر وقت نماز ہو تو پڑھ لیا کرو اور فرمایا اگلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انھوں نے معبد اپنے ماثر پر بنایا تھا۔ پھر بہ اطمینان تمام اس سے نتیجہ نکالتے ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ صحابہ میں ان کی (ماثر پر بنائی ہوئی مسجدوں) کی زیارت لوگ کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے تشدد کے باوجود انھوں نے حضرت عمرؓ نے ا نہ تو لوگوں کو زیارت و نماز سے باز رکھا، نہ مساجد کو شکست کرایا۔

اب سنیئے حقیقت حال یہ ہے معرور بن سوید روایت کرتے ہیں کہ انہ رجع مع عمر فی حجۃ فرای عمر الناس یبتدرون فقال ما ہذا؟ فقالوا مسجد صلی فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال ہکذا ہلک اہل الکتاب، اتخذوا آثار انبیائہم بیعاً۔ من عرضت لہ منکم فیہ الصلوٰۃ فلیصل و

من لم تعرض لہ الصلوٰۃ فلا یصل ؛ یہ محب طبرانی کے الفاظ ہیں۔ عبدالرزاق نے مسند میں بھی روایت حسب ذیل لفظوں میں درج کی ہے اور کنز العمال نے اسے نقل کیا ہے۔ اس میں تھوڑی سی وضاحت زیادہ ہے۔

صلیت مع عمر بطریق مکۃ صلوٰۃ الصبح ثم رای الناس یذہبون مذاہب فقال این یذہب ہؤلاء ؟ فقیل مسجد صلی فیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فہم یصلون فیہ فقال انما ہلک من کان قبلکم بمثل ہذا کانوا یتبعون آثار انبیائہم و تیخذونہا کنائس وبیعا فمن ادرک الصلوٰۃ فی ہذہ المساجد فلیصل ومن لا فلیمض ولا یتعمدہا[1]

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ معرور بن سوید کہتے ہیں میں حج سے واپسی کے وقت حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا۔ راہ میں ایک جگہ ہم نے صبح کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا کچھ لوگ ایک طرف جا رہے ہیں۔ پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ کسی نے کہا، یہاں ایک مسجد ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔ پس یہ لوگ بھی اس میں جاکر نماز پڑھتے ہیں یا جا رہے ہیں تاکہ نماز پڑھیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا تم سے پہلی قومیں اور یہودی و نصاریٰ اس لئے ہلاک ہوئے کہ وہ اپنے نبیوں کے آثار کا کھوج لگاتے تھے۔

پھر انھیں عبادت گاہ بنا لیتے تھے۔ چاہیے کہ تم میں سے جس کسی کو اس میں (اور دوسری روایت میں ہے کہ ان مسجدوں میں) نماز کا وقت مل جائے، پڑھ لے۔ جسے نہ ملے، نہ پڑھے۔ یہ نہ کرے کہ عمداً قصد سے وہاں جاکر نماز پڑھے۔ انتہیٰ

روایت کی اصل و اساس

اب خدارا انصاف کیجئے کہ یہ روایت کیا کہہ رہی ہے اور اسے کس انداز میں پیش کیا جا رہا ہے!

---

[1] روایت کے الفاظ جا بجا ترک کر دئے۔ ملاحظہ ہو رسالہ ابدی صلا

اولاً روایت میں صاف موجود ہے کہ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے کہا، یہاں ایک مسجد ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی: مسجد صلّی فیہ النبیؐ۔ پس اس سے معلوم ہوا وہاں ایک مسجد تھی جس میں آنحضرت صلعم کو نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا، یہ نہیں کہ وہاں آنحضرت صلعم کے نماز پڑھنے کی جگہ بہ نیت تبرک و تعظیم کوئی مسجد بنائی گئی تھی اور لوگ اس کی زیارت کے لئے جاتے تھے۔ پھر کیس درجہ صریح کذب بیانی ہے کہ جس روایت سے استدلال کیا جائے اس میں تو ایک مسجد کا ذکر ہو، جہاں آنحضرت صلعم نے نماز پڑھی تھی اور استدلال یہ کیا جائے کہ وہاں آنحضرت صلعم کے نماز پڑھنے کی جگہ ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی؟ پھر اسے آثار پر مساجد سے تعبیر کیا جائے۔ کجا پیشتر سے ایک مسجد کا ہونا اور اس میں آنحضرت صلعم کا نماز پڑھنا اور اس لئے لوگوں کا بھی وہاں جاکر نماز پڑھنے کا ارادہ کرنا اور کجا یہ بات کہ آنحضرت صلعم نے کسی جگہ نماز پڑھی ہو، اسے زیارت گاہ بنانے کے لئے اس پر مسجد تعمیر کرنا اور بہ نیت زیارت موضع صلوٰۃ اس کی زیارت کے لیئے جانا؟

دو صورتیں

میں اور زیادہ واضح کردیتا ہوں۔ دو صورتیں ہیں اور دونوں کا حکم جدا ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ کسی مسجد میں آنحضرت صلعم نے نماز پڑھی ہو، یعنی مسجد پہلے سے بنی بنائی موجود ہو۔ پھر ایسا اتفاق ہوا ہو کہ آپ نے وہاں نماز پڑھی اور اب جن لوگوں کو یہ بات معلوم ہوئی، انھوں نے چاہا اسی مسجد میں نماز پڑھیں۔ یعنی بوجہ آپ کے نماز پڑھنے کے اسکی خصوصیت کا اعتقاد ان میں پیدا ہوگیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی مقام پر آنحضرت صلعم نے پڑھی، وہاں مسجد نہ تھی۔ چونکہ آپ نے نماز پڑھی چونکہ آپ نے نماز پڑھی اس لئے لوگ اس کی زیارت کرنے لگے اور بہ نیت تعظیم و اجلال زیارت گاہ بنانے کے لئے، وہاں ایک مسجد تعمیر کردی۔ یہ ظاہر ہے کہ ساری بحث دوسری صورت میں ہے نہ کہ پہلی میں اب غور کیجئے، روایت میں کس صورت کا ذکر ہے؟ روایت

میں بلاشبہ لوگوں کا نماز پڑھنے کے لئے جانا مذکور ہے، مگر کہاں؟ مسجد صلّی فیہ النبیؐ، ایک مسجد میں آنحضرت صلعم نے نماز پڑھی تھی۔ یہ نہیں ہے کہ فی موضع صلی فیہ النبی فبنوا علیہ المسجد یعنی اس مقام میں جہاں آپ نے نماز پڑھی تھی اور اس لئے وہاں مسجد بنا دی گئی تھی۔ پس معلوم ہوا کہ پہلی صورت تھی نہ کہ دوسری۔ لیکن مولانا کا دعویٰ یہ ہے کہ اس عہد میں مآثر پر مسجدیں بنائی گئی تھیں اور دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ اس میں مآثر والی مسجد کا ذکر موجود ہے سوال یہ ہے کہ کہاں ذکر موجود ہے؟ روایت کے کس لفظ، کس ترکیب، کس اشارے سے یہ عجیب الخلقت اور غریب النسل استنباط ہوا ہے؟ . . . .

ثانیاً مولانا لکھتے ہیں اس روایت میں ہے کہ "حضرت عمرؓ نے لوگوں کی زیارت پسند نہیں کی، یعنی جو فعل ان لوگوں نے کیا تھا وہ مآثر کی زیارت تھی، پھر دو سطر کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔" اس سے صاف معلوم ہوا کہ زمانۂ صحابہؓ میں اس کی زیارت لوگ کرتے تھے حضرت عمر کے تشدد کے باوجود انھوں نے (یہ انھوں نے، مولانا کی اس عبارت لطیف و فصیح میں بار بار آتا ہے معلوم نہیں اس "انھوں" سے مقصود خود حضرت عمرؓ ہیں یا صحابہ، بہر حال انھوں نے) نہ تو لوگوں کو زیارت و نماز سے باز رکھا، نہ مساجد کو شکست کرایا۔"

متضاد باتیں

اس عبارت میں دو سطروں کے اندر متضاد باتیں فرما دی گئی ہیں۔ پہلے تو کہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کی زیارت پسند نہیں کی۔ اس کے بعد بے تامل لکھ دیا کہ انھوں نے زیارت سے باز نہیں رکھا تو اس لطف بیان کے داد دینے سے بالفعل قطع نظر کرتا ہوں کیونکہ . . . .

فضائل و کمالات کے جو اعلیٰ مراتب و مقامات اس مضمون میں نمایاں کر دیے ہیں انکے نظارہ و تماشا کی محویت میں بھلا ان چھوٹے چھوٹے لطائف و بدائع پر آنکھ اٹھانے کی مہلت کب مل سکتی ہے؟

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کنند کہ تماشا بما رسد

لیکن خدارا مجھے کوئی بتلائے، اس پوری روایت کے کس لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں لوگ مآثر پر بنی ہوئی مسجدوں کی زیارت کیا کرتے تھے؟ روایت میں تو صرف یہ ہے کہ لوگ ایک طرف چلے، پوچھا کہاں جاتے ہیں؟ کسی نے کہا یہاں ایک مسجد ہے جس میں آنحضرت نے نماز پڑھی تھی، اس لئے یہ لوگ بھی وہاں نماز پڑھتے ہیں اس پر حضرت عمرؓ نے کہا پچھلی امتیں ایسی ہی باتوں سے ہلاک ہوئی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ نے جس بات پر ناپسندیدگی ظاہر کی وہ یہ تھی کہ خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ اس مسجد میں نماز پڑھی جائے اور اس کا قصد کیا جائے' کیونکہ یہی بات لوگوں نے کی تھی۔ پھر یہ زیارت کا معاملہ کہاں سے آدھمکا؛ زیارت کو پورے واقعہ سے کیا تعلق؟ آخر یہ کیا قیامت ہے کہ ایک جھوٹی بات خود اپنے جی سے گھڑلی جائے اور اسے حضرت عمرؓ اور تمام صحابہ کے سر تھوپ دیا جائے۔ ساتھ ہی بے باکی اور جرأت کا یہ عالم ہو کہ کنزالعمال کا حوالہ بھی بے نکان دے دیا جائے! ....

....

صحابہ کا متفقہ فیصلہ

ثالثاً حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کو ان کے تشدد سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آثار متبرکہ کو زیارت گاہ بنانے کے خلاف ان (حضرت عمرؓ) کا ارشاد شریعت کا کوئی عام اور صحابہؓ کا مجمع علیہ کا کام نہ تھا بلکہ جس طرح صحابہ کرامؓ میں بعض لوگ اپنے خاص ذوق و طبیعت کی بنا پر کسی خاص بات کے کرنے نہ کرنے میں زیادہ سختی کیا کرتے تھے' اسی طرح حضرت عمرؓ بھی اس بات پر متشدد تھے۔ پس یہ بات ان کے تشددات مخصوصہ میں سے ہے، اسے صحابہؓ کا عام و مجمع علیہ عمل نہیں سمجھنا چاہیے۔

تشدد کی حقیقت!

حقیقت اس تشدد کی یہ ہے کہ جس طرح انسانوں کے ہر گروہ میں ذوق اور طبیعت کا اختلاف ہوتا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ میں بھی تھا، لیکن کن امور میں؟ حلال و حرام میں؟ اتباع سنت اور احداث بدع میں؟ مکروہات و منکرات کی پسندیدگی اور عدم پسندیدگی میں؟ حاشا کہ کوئی ایک صحابی بھی دوسرے صحابی سے اس بارے میں مختلف ہو۔ یہ امور شرع وملت کے اساسات وارکان تھے۔ ان میں نہ تو اختلاف ذوق کی گنجائش تھی، نہ تشدد وعدم تشدد کو دخل۔ دراصل یہ اختلاف ذوق ومشرب خود شریعت ہی کے اتباع کے مختلف مراتب ومدارج اور طریق سلوک ووصول میں تھا۔ مثلاً جو طبیعتیں زہد وقناعت اور ترک دنیا کی طرف مائل تھیں، وہ شریعت کی عزیمتوں کو اس کی رخصتوں پر ترجیح دیتی تھیں اور آسانیوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی شائق نہ تھی لیکن جو لوگ دنیوی زندگی کی مقتضیات وعلائق سے وابستگی رکھتے تھے ان کا ذوق اس طرح کی سختیوں کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا۔ وہ عزیمت کی طرح رخصت پر بھی عمل کرتے تھے بلکہ عام حالات وضروریات کی اندازہ شناسی کی وجہ سے بسا اوقات رخصت کو عزیمت پر ترجیح دے دیتے تھے۔ زہد وعبادت میں بھی ان کا سلوک اعتدال واقتصاد پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے لئے نوافل وتطوعات سے کہیں زیادہ دنیا اور دنیا والوں میں رہنا سہنا اور ان کی خدمت واصلاح کرنا موجب اجر وثواب ہے۔

مختلف مثالیں

چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابوذرؓ ترک دنیا وقناعت بالقلیل میں نہایت سخت تھے۔ آسائش ونعیم دنیا کی طلب کو برا سمجھتے تھے۔ سلف نے ان کی یہ بات ان کے تشددات میں سے شمار کی ہے اور خود حضرت عمرؓ نے بارہا سختی سے انھیں ٹوکا ہے اسی طرح عبداللہ ابن عمرؓ کو اتباع وسنت او رتشبہ بالخلق بہ اسوۂ نبوت میں نہایت درجہ اہتمام تھا

بہت سی باتیں جو حقیقتاً سنن ہدیٰ میں داخل نہ تھیں یا ایسے امور تھے جو کبھی کبھار آنحضرت صلعم
سے ہو گئے یا اتفاقاً کوئی صورت حال سفر و حضر میں پیش آگئی تو بہ سبب کمال عشق سنت ان سب
باتوں کا بھی بعینہٖ اتباع کرنا چاہتے تھے اور ایسے ہی اعمال وطاعات میں غایت درجہ مبالغہ فرماتے
ان کی یہ ادا بھی ان کے تشددات میں شامل کی گئی ہے۔ خود فقہائے محدثین تصریح کر دیتے
ہیں کہ انھوں نے فلاں بات یوں کی، لیکن ممکن ہے یہ ان کے تشدد فی الاتباع میں سے ہو۔
جیسا کہ طہارت و وضو کے باب میں اہل علم کی نظر سے گزرا ہوگا۔

اسی طرح اعمال نماز کے معاملہ میں رخص وعزائم کا فرق اور اس اعتبار سے صحابہؓ کا اختلاف
اذواق بھی اس وادی کا ایک دقیق گوشہ ہے۔ یہ جو حضرت انسؓ والی روایت میں ہے کہ انھوں نے
نماز پڑھی اور ان کے ارکان و اعمال میں بہت زیادہ طول و تنوت نہیں فرمایا اور کہا، بس ہم تو ایسی
ہی نماز پڑھتے ہیں (او کما قال) پھر بکثرت اس کے خلاف شواہد موجود ہیں مثلاً حضرت
براء بن عازب والی روایت کہ "فکان رکوعہ وسجودہ وما بین السجدتین قریباً من السواء" (او کما قال)
تو اس میں بھی یہی رخصت وعزیمت والی بات ہے نہ وہ راز کار توجیہیں جو مخالفین اعتدال
فی الصلوٰۃ نے اپنے جی سے گھڑ لیں اور معاملۂ صلوٰۃ میں کہ حاصل اعمال و خلاصۂ طاعات ہے،
بدذوقی کا دروازہ مستقل کھول دیا۔ وامثال ہذا کثیر فی صحف السنۃ ولکن لا یعقلہا الا العالمون۔

انصاف کیلئے اپیل

پس صحابہ کرامؓ میں سے بعض کے تشددات کی حقیقت اہل علم کے نزدیک یہ ہے کہ منکرات
کے نہی و انسداد میں سرگرمی و تیز گامی۔ یہ تو عین مطلوب شریعت ہے۔ اس میں تشدد و عدم
تشدد کا کیا موقع ہے؟ اس میں کچھ ایک صحابی ہی متشدد نہ تھے، سب ہی متشدد تھے۔ اور اگر
یہ تشدد ہے تو خود شارع علیہ السلام اور تمام صحابہ کرام کو متشددین ہی سے شمار کرنا چاہیے بلکہ
کل امت کو بحکم کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر الی آخر الآیہ۔
اب اہل فہم انصاف فرمائیں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو صریح منکرات و مفاسد میں داخل تھے"

جس کے خلاف خود صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نہی صریح موجود ہے جو اس فتنہ کا دروازہ امت پر کھولتا ہے، دوسرے سے شریعت کی اصل و اساس یعنی توحید خالص کو مکدر و آلودہ کر دینے والا ہے جو اس فعل تک منجر ہو سکتا ہے، جس پر اللہ کے رسولؐ نے مرض الموت کے بستر پر لعنت بھیجی تھی اور جو منجملہ ان کے پانچ کلمات وصیت کے ہے کہ لعن اللہ الیہود و النصاریٰ، اتخذوا قبور انبیائہم مساجد، اور جس کی وجہ سے تمام سابقہ اقوام عالم باوجود انزال کتب و انبعاث نبوت و تعلیم دین اللہ الخالص مبتلائے شرک و ضلالت ہو گئیں اور دین حقیقی مسخ و محرف ہو کر رہ گیا۔

محرم اسرار شریعت

پھر ایسا ہوتا ہے کہ عہد صحابہ میں حسب مقتضائے طبیعت بشری بعض خوش عقیدہ مگر ناواقف لوگ کوئی ایسی بات کر بیٹھتے ہیں جس سے اس معاملہ کا ایک ابتدائی دروازہ کھل جاتا ہے اس پر حضرت عمرؓ تمام مجمع صحابہؓ کی موجودگی میں اس کا فوراً انسداد کرتے ہیں اور ان لغزشوں سے روکتے ہیں، جو امت کو ایک ضلالت کبریٰ سے روشناس کر دے سکتی ہیں۔ کون حضرت عمرؓ؟ وہ کہ محرم اسرار شریعت تھے، نکتہ شناس دقائق ہدایت و ضلالت امم تھے، امام الائمہ اسلام تھے۔ اس شہادت عظیمہ نبویہ کے مورد تھے کہ ان اللہ جعل الحق علی لسان عمر وقلبہ (رواہ ابو داؤد و ترمذی) اور مرتبہ خاصہ محدثیت (بالفتح) سے فائز المرام تھے من غیر ان یکن الانبیاء (کما اخرجہ الشیخان) پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے بعد تمام ائمہ علم و سنت ان کے اس فعل سے دلیل پکڑتے اور اس طرح کے منکرات و مفاسد کے خلاف بطور ایک واضح و قطعی حجت کے پیش کرتے ہیں، لیکن اس ۱۳۴۴ھ میں مولانا عبد الباری صاحب تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں یہ تو کچھ تشددات میں سے تھا ورنہ اس عہد میں باوجود ان کے تشدد کے لوگ آثار و مزارات و مساجد بناتے تھے اور ان کی زیارت کیا کرتے تھے گویا جس طرح حضرت عبد اللہ بن عمرؓ [illegible] کے اتباع میں اپنی [illegible] کے نیچے پانی ڈال دیا کرتے تھے یا حضرت ابوذرؓ [illegible]

بُرا سمجھتے تھے، ویسا ہی حضرت عمرؓ بھی اس معاملے میں تشدد کرتے تھے۔ ورنہ ویسے شریعت کا حکم یا صحابہؓ کا عام مسلک یہ نہ تھا۔ خدارا مجھے کوئی بتلائے کہ اس تیرہ سو برس میں کس اہل علم نے بھی حضرت عمرؓ کے تشددات میں سے ایک ایسے صریح نہی عن المنکر کو شمار کیا ہے اور کوئی صاحب علم ایسا کلمہ زبان سے نکال سکتا ہے؟

آثار و مآثر

ناجا..... دیانتِ روایت و حکایت کا ایک اور منظر بھی قابل دید ہے لکھتے ہیں: "حضرت عمرؓ نے فرمایا اگلی امتیں اس وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں کہ انھوں نے معبد مآثر پر بنایا تھا۔" حالانکہ روایت میں کہیں یہ نہیں ہے کہ معبد مآثر پر بنایا تھا۔ اس میں تو یہ ہے کہ کانوا یتبعون آثار انبیائہم فیتخذونہا کنائس و بیع، یعنی پچھلی امتیں ہلاک ہوئیں کہ اپنے نبیوں کے آثار (نہ کہ مآثر جیسا کہ مولانا بہ معنی آثار استعمال کر رہے ہیں) ڈھونڈتی تھیں اور پھر انھیں کنیسہ اور بیع بنا لیتی تھیں، یعنی ان آثار ہی کو معبد بنا لیتی تھیں۔ یہ نہیں کہ آثار پر بناتی تھیں۔ دونوں صورتوں میں عظیم فرق ہے۔ کہاں کسی چیز کو معبد بنا لینا اور کہاں اس پر معبد بنانا اس سے بڑھ کر تحریف لفظی و معنوی اور یحرفون الکلم عن مواضعہ کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

لیکن.... یہ حرکت یہاں کیوں کی؟ اس لئے کہ عوام پر احکام شرعیہ کی حقیقت مشتبہ کردینے کے لئے جو کاروائیاں یہ حضرات کر رہے ہیں، ان میں اس تحریف سے مدد ملے۔ احادیث و آثار میں جا بجا اس سے روکا گیا ہے کہ آثار و قبور کو معبد بنایا جائے۔ یہ لوگ ان کا یہ مطلب گھڑتے ہیں کہ قبور و آثار کو معبد بنانے سے مقصود ان پر مسجد بنانا ہے اور چونکہ ہم تو قبر کے اوپر مسجد نہیں بناتے اس لئے یہ نہی ہمارے بدعات و رسوم سے تعلق نہیں رکھتی۔ لیکن اس روایت میں بھی جب حضرت عمرؓ کے قول میں تحریف کر گئے کہ ایک ضمنی بات ہے جس کی وجہ سے اہل علم تو توجہ نہیں کریں گے اور عوام پر حقیقتِ حال مشتبہ ہو جائے گی

(۴)

عہدِ صحابہؓ کا تعامل مصیبت یہ ہے کہ یہاں ہمارے لئے مصیبت کی کوئی سطح مستوی نہیں۔ جوں جوں بڑھتے جائیے زیادہ بھیانک اور وحشت ناک صورتیں نمودار ہوتی جاتی ہیں۔ ان تمام عجائب و خوارق استدلالات سے بھی بڑھ کر جو اس وقت تک اس روایت سے ہو چکے ہیں، مولانا کا یہ استنباط ہے:

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ صحابہ میں
اس کی (ماثر والی مساجد کی) زیارت لوگ کرتے تھے؟

یعنی یہ جو اس روایت میں ہے کہ حضرت نے کچھ لوگوں کو اس مسجد میں جاتے دیکھا اور روکا تو اس سے معلوم ہوا کہ لوگ یہ بات کرتے تھے جبھی تو روکا! پس اس سے نہ صرف معمولی درجہ کی معلومیت حاصل ہوئی بلکہ "صاف" معلوم ہو گیا کہ عہدِ صحابہؓ میں لوگ ایسے ماثر کی زیارت کیا کرتے تھے..... اس "صاف" استنباط پر زور دینے سے مقصود یہ ہے کہ.... معتقدین سمجھیں یہ باتیں کچھ نئی نہیں ہیں، عہدِ صحابہؓ میں بھی ہوتی تھیں۔ باقی رہی یہ بات کہ.... بدقسمتی سے اس روایت کا اصل حصّہ حضرت عمرؓ کے انکار پر مشتمل ہے تو اس کا وغیرہ یوں کر دیا گیا کہ یہ تو ان کے تشددات میں سے تھا۔

معاملے کی حیثیت

اب حقیقت حال سنئے:

اولاً ناظرین پوری روایت پڑھ چکے ہیں۔ سرے سے معاملۂ زیارت کو تو اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ نہ تو وہ مسجد ماثر پر بنائی گئی تھی، نہ لوگ ماثر کی زیارت کے لئے گئے تھے۔ نہ حضرت عمرؓ کے دریافت حال کہنے پر کسی نے زیارت کا ذکر کیا، نہ حضرت عمرؓ کے جواب میں زیارت کی طرف کوئی اشارہ ہے۔ ماثر کو زیارت گاہ بنا کر وہاں زیارت کے لئے جانا تو بہت بڑی بات ہے اس کا صحابۂ کرامؓ کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے تو اتنی بات بھی گوارا

نہیں کی کسی مسجد میں خصوصیت واہتمام کے ساتھ اس لئے نماز پڑھی جائے کہ وہاں آنحضرت ؐ
کو نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ چنانچہ اس روایت میں جو کچھ ہے ۔ ایک ایسی ہی مسجد میں بالقصد
واہتمام نماز پڑھنے کا معاملہ ہے۔ پھر یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زیارت زیارت کی رٹ کیا لگائی ہے؟
کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سمجھ رکھا ہے کہ اللہ کے رسولؐ سے تربیت یافتہ انسانوں کا بھی وہی حال تھا جو
ان کا اور ان کی پیری ومشیخت کے بدعات ورسیم کا ہے ۔

عجیب وغریب طریق استنباط

ثانیاً اگر ایک لمحہ کے لیے یہ طریق استنباط صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی
ہوں گے کہ تمام کارخانہ شرع وملت بیک دفعہ درہم برہم ہو جائے۔ یہ ۔ ۔ ۔ قاعدہ استنباط
اس اصل ۔ ۔ ۔ پر مبنی ہے کہ اگر کسی روایت میں کسی صحابی کا کسی بات سے روکنا نکلتا ہو تو
اس سے یہ بات بھی " صاف " ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ بات اس وقت کی جاتی تھی ، اور جب
کی جاتی تھی تو اس سے عہد صحابہؓ میں اس کے رواج وتعامل کا ثبوت مل گیا اور چونکہ صحابہ
کے عہد میں کسی بات کا عام طور پر رائج ہونا اس کا جواز ثابت کرتا ہے ، اس لئے اس
سے جواز پر استدلال کیا جا سکتا ہے ۔ گویا یہ جو تیرہ سو برس سے تمام اہل علم کا اس پر اعتقاد
وعمل چلا آتا ہے کہ باب امر ونہی میں اگر صحابہ کرامؓ کا کسی فعل سے روکنا ثابت ہو جائے تو اس سے
اس فعل کے منہی عنہ ہونے کا علم مستفید ہوتا ہے، نہ کہ ماموربہ ہونے کا ، تو یہ بالکل غلط ہے اور
حقیقت بالکل اس سے الٹی ہے صحابہؓ سے نہی کا ثابت ہونا اس فعل کے منہی عنہ ہونے پر
نہیں بلکہ جواز پر دلالت کرتا ہے ، کیونکہ کسی فعل سے روکنا جبھی ہو سکتا ہے کہ کسی نے وہ
بات کی ہو اور جب کی تھی تو صاف " معلوم ہو گیا کہ یہ بات ہوتی تھی اور جو نکہ ہوتی تھی
اس لئے یہ بھی صاف " معلوم ہو گیا کہ اس وقت صحابہؓ ایسا کیا کرتے تھے اور اس لئے
اسے جائز تصور کرنا چاہیئے نہ کہ منہی عنہ

عہد صحابہ کی فضیلت و خصوصیت

اگر یہ قاعدہ مجھ میں آ جائے تو عقل و علم پر جو کچھ گزرے گی، سو گزرے گی، اس کی بھلا ...... کیا پروا ہے، لیکن غور تو کیجئے کہ اس زمانہ شر و ملت کا کیا حشر ہوگا؟ صحابہؓ کا عہد بھی انسانوں ہی کا عہد تھا، کچھ آسمان کے فرشتے زمین پر نہیں اتر آئے تھے۔ لوگوں سے ہر طرح کی لغزشوں خطاؤں اور معاصی کا صدور بھی ممکن تھا اور نہ صرف ممکن تھا بلکہ اسی طرح ظہور میں بھی آتا تھا جیسا ہمیشہ انسانوں سے ظہور میں آتا رہا ہے اور آتا رہے گا۔ ساری فضیلت و خصوصیت جو اس عہد مبارک کی تھی وہ یہ نہیں تھی کہ مسلمان معصوم ہو گئے تھے صرف یہ تھی کہ صحابہؓ کرام کا غالب گروہ تربیت یافتہ عہد نبوت تھا، اس لئے اپنے علم و عمل میں شریعت کا عامل و محافظ تھا اور ان کی حکومت ان کی نگرانی، ان کے عملی نمونہ اور ان کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک بہترین جمعیت بہ حیثیت مجموعی پیدا ہو گئی تھی۔ نیز عہد نبوت کے قرب کی وجہ سے عقائد کی وہ آلودگی، اعمال کا وہ ضعف، ہیئت اجتماعیہ کے وہ مفاسد ابھی سر نہ اٹھا سکے تھے جن کا بعد کو حسب روایت حضرت حذیفہؓ کا تھیر عود اً عودا ظہور و شیوع ہوا اور مسلمانوں پر بدع و مفاسد کے دروازے کھل گئے۔

خدائی شریعت کا وظیفہ

جب کبھی عامۃ الناس کو لغزش ہوتی تھی، فوراً کوئی نہ کوئی آمر بالمعروف و ناہی عن المنکر اٹھتا تھا اور ٹوک دیتا تھا۔ جب کوئی مبتلائے معصیت و فسق ہوتا، فوراً حکومت شرعیہ احتساب کرتی اور بلا رو رعایت سیاست و تعزیر میں سرگرم ہو جاتی۔ حفظ شرع، قیام حدود اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں لوگوں کی زبانیں گویا، ہاتھ مبسوط اور دل مستقیم تھے۔ یہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا کہ اس وقت انسانی فطرت بدل گئی ہو۔ خدا کی شریعت فطرت کو بدلنے کے لئے نہیں بلکہ معدود قواعد میں جکڑنے کے لئے آتی ہے۔ اس وقت کی ساری بڑائی یہی تھی کہ اسلام کی پیدا کی ہوئی ایمانی فطرت مزکیٰ و مجلیٰ اپنے اصلی جلوہ و شان میں موجود تھی۔ اس وقت بھی دنیا کی یہ مخلوق، جس کا نام انسان ہے، وہ تمام نادانیاں کر سکتا تھا اور کرتا تھا جو ہمیشہ سے کرتا آیا ہے اور کرتا رہے گا، لیکن ساتھ ہی علم کتاب و حکمت

کے تزکیہ و تربیت نے ایسے سعید اور مستقیم الاحوال انسان پیدا کر دیئے تھے جن میں انسانی نادانیوں اور لغزشوں کے احتساب و اصلاح کی پوری قوت تھی، اس لئے اگرچہ زمین پر فرشتے نہیں اتر آئے تھے، لیکن فرشتوں جیسے نیکی کے مشتاق اور کبوتروں جیسے برائی سے نفور انسانوں کی بدولت حکومت قائم ہو گئی تھی۔ پس گو برائی موجود تھی مگر غالب نہیں آ سکتی تھی اور گو کمزوری ابھرتی بھی مگر سر نہیں اٹھا سکتی تھی۔

واقعات و نتائج

اب اگر . . . یہ قاعدۂ استدلال مان لیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ نکلے گا کہ شریعت کے تمام محرمات و فسوق جائز بلکہ مستحسن ہو جائیں گے۔ معلوم ہے کہ اس عہد میں لوگوں نے شراب پی ہے اور ان پر حد جاری ہوئی ہیں۔ حد خمر کا تعین ہی عہد صحابہ میں ہوا۔ لوگ زنا کے مرتکب ہوئے اور مستحق حد ٹھہرے ہیں۔ چوری کی ہے اور پکڑے گئے ہیں۔ تہمت لگائی ہے اور اس پر سزا پائی ہے اس طرح کے حوادث کا ذکر بے شمار روایتوں میں آیا ہے، جن سے مسائل و احکام کا استنباط کیا جاتا ہے۔ پھر کیا اب آج کے دن سے یہ سمجھ لیا جائے کہ چونکہ اس عہد میں شراب پینے پر حد جاری کی گئی تھی، پس اس سے پتا چلا کہ لوگ پیتے تھے اور جب پینا ثابت ہو گیا تو اس عہد کا تعامل بھی ثابت ہو گیا؟ اور زمانوں سے قطع نظر کر کے صرف انہی حضرت عمرؓ کا عہد خلافت لو، جس میں فی الحقیقت احکام و مسائل فقہ کا غالب حصہ مدون و منظم ہوا ہے ایک اس مسجد والے معاملے ہی میں ان کا روکنا مروی نہیں۔ سیکڑوں منکرات و محرمات ہیں، جن میں ان کا روکنا، سزا دینا، حتیٰ کہ کسی برائی کو زیادہ پھیلتے دیکھ کر اپنے خطبات جمعہ میں بار بار اعلان کرنا ثابت و مروی ہے اور دواوین سنت و تذکار ان سے بھرے پڑے ہیں۔ آج تک تمام اہل علم و نقل ان روایات سے ان منکرات کے خلاف استدلال کرتے آئے ہیں، اب . . . . یہ فلسفہ ایجاد ہوا ہے کہ نہیں، روکنا اگر دلیل کسی بات کی ہے تو اسے نظر انداز کر دیجئے۔ استدلال یوں کیجئے کہ لوگوں نے یہ فعل کیا تھا، جبھی تو روکا۔ اب معلوم نہیں ان تمام

محرمات وفسوق کی نسبت حضرت کا مذہب ومشرب کیا ہے، جن کا صدور اس معاملہ سے کہیں زیادہ تکرار وسعت کے ساتھ ثابت ہے، صرف کتب صحاح ہی دیکھ لی جائیں، جلد عمر کذا وکذا، فعل الناس کذا فأمر۔ وکذا امرنی عمر فی جماعۃ بکذا وکذا فجلدنا وفعلنا کذا وکذا رای عمر وعثمان وعلی کذا وکذا، فقال کذا وکذا۔ محب طبری کی تاریخ الخلفاء چھپ گئی ہے اس میں حضرت قضاء عمرؓ کی روایات یکجا دیکھ لیں، پھر کیا اب ان تمام روایات سے یہ استدلال کیا جائے گا کہ بسبب نہی کے فعل ثابت ہو گیا اور اس لئے تعامل صحابہ سے جواز نکلتا ہے؟

فنعوذ باللہ من شر الجہل والفتنۃ۔ الغرض! یہ جو معاملات شرع میں ایک سخت فساد حیلوں کے اختراع کا پیدا ہوا، حتیٰ کہ تمام اعمال شرعیہ میں حیلے بہانے گھڑ کر بعضوں نے بڑی بڑی کتاب الحیل تک بنا چھوڑیں تو انسانی کمزوری کی یہ برائی اس عہد میں بھی ہاتھ پاؤں نکالنا چاہتی تھی۔ چنانچہ بعض نادان اور کمزور طبیعتوں نے طلاق ثلاثہ دیکھ پھر حلالہ کے لئے آج کل کے دین باز مولویوں کی طرح یہ راہ نکالی کہ فرضی نکاح کرا لیا جائے اور بھول گئے کہ اللہ کے رسولؐ نے اس طرح کے حلالہ کرنے والے اور کرانے والے پر لعنت بھیجی ہے لَعَنَ اللّٰہُ المحلل والمحلل لہ (اخرجہ ابو داؤد) ایک مرتبہ انہی حضرت عمرؓ کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے خطبات میں بار بار اعلان کیا لا اوتی بمحلل ولا محلل لہ الا رجمتہا۔ میں اس طرح کے فرضی حلالہ کرنے والوں کو بغیر رجم کئے نہیں چھوڑوں گا۔ کیا اب اس سے یہ استدلال کیا جائے گا کہ معلوم ہوا، باوجود حضرت عمرؓ کے تشددات کے لوگ فرضی وملعون حلالہ کرتے کراتے تھے جبھی تو حضرت عمر نے روکا اور اس لئے اس عہد کا عمل ثابت ہو گیا؟

عمل جاری کا مطلب

اصل یہ ہے کہ اس تیرہ سو برس میں کسی ذی عقل انسان نے کبھی عہد صحابہؓ کے عمل جاری کا مطلب یہ نہیں سمجھا ہے۔ یہ علم وحقیقت کے خلاف جرأت وبے باکی کی انتہا ہے کہ جو روایات صریح ترک ونہی کیلئے حجت ہیں، انہی کا اثبات وجواز کے لئے استعمال کیا جائے اور صحابی

کے رد کرنے سے نہیں بلکہ لوگوں کے محض عمل کرنے سے استدلال کیا جائے۔ صحابہؓ کے عہد کا عمل جس سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ کسی بات کا عمل غالب بھی صحابہ سے ثابت ہو جائے اور اس کے خلاف اعتراض ورد قابل اعتماد واعتنا ثابت نہ ہو یا یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی بات عام طور پر مرکز اسلامیہ میں معمول بھی اور خلفائے راشدین وعموم صحابہ نے اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ خصوصاً اگر خلفائے راشدین کے زمانے میں عام تعامل وشیوع مع تقریر وسکوت ثابت ہو جائے تو بلاشبہ یہ اس مدت کا قابل احتجاج عمل سمجھا جائے گا۔ یہ قاعدہ کہاں سے حضرت نے سیکھ لیا ہے کہ جس روایت میں صریح صحابہؓ کا، خصوصاً حضرت عمرؓ کا بہ زمانہ خلافت ایک بات سے روکنا ثابت ہو رہا ہے اور ایک چیز کو حکم دے کر بالکل نابود کرا دینا مستفید ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ چونکہ بعض مجہول الحال لوگوں نے یہ بات کی تھی، اس لئے عمل ورواج ثابت ہو گیا؟ پھر لطف یہ کہ حضرت عمرؓ نے درخت اپنے عہد خلافت میں کٹوا دیا اور اس مسجد میں خصوصیت واہتمام کے ساتھ نماز پڑھنے سے بھی بہ عہد خلافت ہی روکا۔ بقیہ تمام صحابہؓ کے اجماع کی مہر لگ چکی ہے۔ ان بدع ورسوم وعمارات محدثہ کے خلاف اس سے بڑھکر تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ با ایں ہمہ بلا ادنیٰ جھجک کے اخبار میں بکھ کر شائع کرار ہے ہیں کہ صاف معلوم ہو گیا اس عہد میں لوگ زیارت کیا کرتے تھے۔

عام مثال

اور یہ جو عہد صحابہؓ کے عمل ورواج کی نسبت کہا گیا تو صرف اسی عہد کے لئے مخصوص نہیں۔ یہ تو علم واعتبار کا ایک عام عقلی قاعدہ ہے۔ کوئی عہد ہو اگر ہم معلوم کرنا چاہیں کہ اس وقت کے معمول ورواج کا کیا حال تھا تو ظاہر ہے علم واستدلال کا طریقہ یہی ہو گا کہ اس عہد کے ایسے لوگوں کا جو سو ساٹھ کے قریب انکا نام ہوں عمل معلوم کریں یا یہ معلوم کریں کہ لوگوں کی غالب تعداد کیا کہتی اور کیا کرتی تھی؟ لیکن کوئی ذی عقل یہ نہیں کرے گا کہ اگر کسی روایت

سے حکام اور اہل علم کا کسی بیرانی سے چند مجہول الحال آدمیوں کو روکنا ثابت ہو جائے تو
اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ یہ بلائے عام طور پر اس وقت رائج تھی ۔

ضروری نکتے

اب کہ یہ تمام تفصیل گزر چکی ہے اہل انصاف غور کریں کہ پورے استدلال کی
حقیقت کیا ہے ۔ تفصیلات گزشتہ سے واضح ہو چکا ۔

۱۔ یہ بالکل کذب و افترا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں ماثر پر عمارتیں یا مساجد بغرض زیارت
و تعظیم بنائی گئی تھیں، کوئی ثبوت اس کا موجود نہیں۔ پس یہ استدلال ہی سرے سے
لغو ہے۔ جب ایسی عمارتوں کا وجود ہی نہیں تھا تو گراتے کیسے ؟ ہوتیں تو انھیں گراتے ۔
درخت سے کہیں زیادہ وہ مستحق انہدام تھیں ۔

روایت کنز العمال

۲۔ روایت کنز العمال سے استدلال ظلمات بعضہا فوق بعض ہے ۔ روایت میں
قطعاً یہ نہیں ہے کہ وہاں کوئی ایسی مسجد موجود تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موضع صلوٰۃ
پر بہ نیت زیارت و تعظیم تعمیر کی گئی ہو۔ اس میں صاف موجود ہے کہ وہاں ایک مسجد
تھی جس میں آنحضرت صلعم نے نماز پڑھی تھی اور جو لوگ وہاں گئے تھے اس لیے گئے تھے ۔
کہ آنحضرت صلعم کے اتباع و تشبہ کے جذبے میں انھوں نے چاہا تھا، خود بھی اس مسجد میں
جاکر نماز پڑھیں، لیکن چونکہ اس خصوصیت و اہتمام سے یہ بات نکلتی تھی کہ آنحضرتؐ کے
انتساب کی وجہ سے ایک مقام کا لوگ قصد کیا کریں اور رفتہ رفتہ اس کے زیارت گاہ بن جانے
اور آثار و منسوبات کی تعظیم کرنے کی راہ کھل جائے ، اس لیے حضرت عمرؓ نے سداً للذریعہ
اسے بھی ناپسند کیا اور روک دیا ۔ چنانچہ خود انہی کے قول سے منع کی علت واضح ہو گئی ہے ۔
فمن ادرکتہ الصلوٰۃ فی ہذہ المساجد فلیصل ومن لا فلیمض ولا یتعمدہا یعنی خصوصیت و اہتمام
کے ساتھ اس میں نماز کے لئے نہ جاؤ کیوں کہ اس طرح کا اختصاص اور اہتمام ہی آگے چل کر

زیارت گاہ بن جانے اور پھر زیارت گاہ سے پرستش گاہ بن جانے کا ذریعہ ہو جایا کرتا ہے۔ جس کسی کو ایسا اتفاق ہو کہ وہاں مسجد تھا یا وہاں سے گزر رہا تھا اور نماز کا وقت آگیا تو چاہیے کہ پڑھ لے لیکن جس کسی کو ایسا اتفاق پیش نہ آئے تو گزر جانے اور عمد و قصد کے ساتھ اس بات کے لئے وہاں نہ ٹھہرے۔ پس جب نہ تو وہ مسجد آثار پر بنائی گئی تھی، نہ لوگ مآثر کی زیارت کے لئے گئے تھے تو پھر حضرت عمرؓ اس کے گرانے کا حکم کیوں دیتے؟ اور اگر ایسی مساجد کو انھوں نے نہیں گرایا تو اس سے مآثر کی عمارات کا تحفظ و ابقا کیوں کر ثابت ہوا؟

تمسخر انگیز بات

۳۔ اس سے یہ بات نکالنی کہ اس عہد میں لوگ مآثر کی زیارت کیا کرتے تھے، جہل پر جہل، کذب پر کذب اور بر افترا ہے۔ اول تو وہ مآثر والی مسجد ہی نہ تھی۔ ثانیاً لوگ زیارت کے لئے گئے ہی نہ تھے۔ ثالثاً جو کچھ بھی ہوا جب حضرت عمرؓ نے اس پر نکیر کی تو معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ ایسی باتوں پر انکار کرتے تھے۔ لہٰذا اس کی برائی متحقق ہوئی، یہ نہیں کہ چونکہ چند مجہول الحال آدمیوں سے یہ غلطی سرزد ہو گئی تھی، اس لئے ان کی غلطی کو اس عہد کا عمل درواج قرار دے دیا جائے۔

۴۔ کسی بات کا کسی عہد میں بطور ایک عام اور مقبول بات کے رائج ہونا جبھی ثابت ہو سکتا ہے جب کہ اس عہد میں اس کا عموم و قبول ثابت ہو جائے۔ عہد صحابہؓ کا تعامل رواج معلوم کرنے کے لئے بھی یہی طریقہ تمام اہل علم نے سلفاً و خلفاً قرار دیا ہے۔ پس کسی ایک روایت میں یہ دیکھ کر کہ چند مجہول الحال آدمیوں نے فلاں بات کی تھی اور اس پر حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ راشد نے ممانعت کی، یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ بات اس وقت عام طور پر رائج تھی، نہایت تمسخر انگیز ہے۔ کوئی ذی عقل اور پڑھا لکھا انسان اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔

۵۔ اس بات کو حضرت عمرؓ کے تشددات "سے تعبیر کرنا معاملہ جہل کو اس کے منتہا مرتبۂ کمال تک پہنچا دینا ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے بعض صحابہ کے تشددات اہل علم کی بول چال

میں کیے جاتے ہیں، دوسری ہی بات ہے اس معاملہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

عہد صحابہؓ کی ذہنیت

اس روایت سے جو فی الحقیقت مولانا رد ہ اور ان کے ہم مشربوں کے خلاف ایک دلیل قاطع اور حجت واضح ہے، جو عجیب الخلقت استدلال کیا گیا تھا اس کی حقیقت تو آشکارا ہو چکی، اب چاہتا ہوں کہ اہل علم و نظر کی مزید بصیرت و اعتبار کیلئے اس کے بعض نقد و فوائد کی طرف اشارہ کر دوں؛

۱ - روایت میں ہے: صلیت مع عمرؓ بطریق مکۃ صلوٰۃ الصبح ثم رای الناس یذہبون مذاہب فقال این یذہب ہؤلاء؟ فقیل مسجد صلی فیہ النبی صلعم فہم یصلون فیہ۔ میں نے حضرت عمر کے ساتھ مکہ جاتے ہوئے صبح کی نماز پڑھی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا، لوگ مختلف راستوں سے کسی طرف جا رہے ہیں۔ پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ کسی نے کہا یہاں ایک مسجد ہے جس میں آنحضرتؐ نے نماز پڑھی تھی، اس لئے یہ لوگ بھی چاہتے ہیں کہ وہاں نماز پڑھیں۔

اب یہاں غور کرنا چاہیے، صورت حال کیا تھی؟ بظاہر ہے کہ یہ معاملہ سفر میں پیش آیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مکہ جاتے ہوئے منزل کی اور صبح کی نماز پڑھی۔ اس کے قرب و جوار میں کہیں ایک مسجد بھی تھی جس میں آنحضرت صلعم کو نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے چاہا وہاں جائیں اور نماز پڑھیں۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس مسجد میں نماز پڑھنی چاہی، انہوں نے صبح کی نماز کے لئے ایسا کیا تھا یا صبح کی نماز باجماعت کے بعد چلے تھے کہ وہاں بھی دو رکعت نفل پڑھ آئیں۔ روایت کے الفاظ دونوں صورتوں کے لئے محتمل ہیں لیکن زیادہ قرینہ دوسری صورت کا ہے۔ یہ بات زیادہ قوی نہیں معلوم ہوتی کہ لوگوں نے صبح کی وہ جماعت ترک کر دی ہو جو حضرت عمرؓ نے اپنی قیام گاہ میں قائم کی تھی، کیوں کہ ایک موجودہ قائم جماعت کا ترک کرنا اور دوسری جگہ جا کر نماز ادا کرنا التزام جماعت کے شرعی احکام کے صریح خلاف ہے اور یہ قرین قیاس نہیں کہ ایسی بات لوگوں نے کی اور اس پر حضرت عمرؓ نے اعتراض نہ کیا۔ علاوہ بریں

خود روایت میں صلیت مع عمر صلوٰۃ الصبح "کے بعد قم راہی " کے لفظ سے بھی یہی مترشح ہے کہ جماعت صبح کے بعد یہ معاملہ پیش آیا تھا، نہ کہ اثنائے جماعت میں۔ پس جو صورت پیش آئی تھی کہ لوگوں نے صبح کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد کچھ لوگ چلے کہ اس مسجد میں جائیں اور وہاں بھی نماز پڑھائیں یعنی نماز نفل۔

صحابہ وسلف کے اعمال وافکار

جن لوگوں نے عہد صحابہ وسلف کے اعمال وافکار کا تتبع کیا ہے۔ ان پر یہ حقیقت مبرہن ہوگی کہ ان کے لئے ہر طرح کے تعمیر عمل صالح میں نماز بمنزلہ محور مرکز کار تھی۔ جب کبھی کوئی بات مذہبی جذبات کی بنا پر کرتے تو بجز نماز پڑھنے کے اور کوئی ڈھنگ اور طریقہ نہیں سوجھتا تھا ان کا دماغ قرآن وسنت کی عملی تربیت نے کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا تھا کہ اس میں کوئی فکر وارادہ غیر اسلامی نوعیت کا اترہی نہیں سکتا تھا وہ اگر کوئی ایسی راہ چلنے بھی لگتے جس کے لئے شریعت کی تبلائی ہوئی تفصیل سامنے نہ ہوتی تو اس میں بھی ان کا قدم کسی غیر اسلامی طریقہ کی طرف نہ اُٹھتا، نماز ہی کی طرف اُٹھتا، روزہ ہی طلب کرتا، تلاوت قرآن پر زور دیتا۔ وہ حالت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ جو بحکم حدیث ابن العاص مند ابن ماجہ۔ لم یزل امر بنی اسرائیل معتدلاً حتی انشا فیہم المولدات۔ اہل کتاب کی طرح بعد کے مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اور غیر اقوام کے اختلاط وتشبہ کی وجہ سے دینی زندگی کے نئے نئے طریقے اور نئے نئے ڈھنگ طبیعتوں نے قبول کر لئے پھر بتدریج معاملہ یہاں تک پہنچ گیا جہاں آج نظر آرہا ہے۔

ذہنیت میں تغیر

چنانچہ یہ جو روایات وآثار میں تم جابجا پڑھتے ہو کہ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ نے کہا مجھے مشکلات پیش آئیں سوچا کیا کروں؟ دل نے فیصلہ کیا کہ نماز پڑھو۔ ابوسعید کہتے ہیں ایک مرتبہ راستہ بھول گیا۔ کوئی تبلانے والا دکھائی نہ دیا۔ میں نے نماز شروع کردی۔ ایک دوسرے صحابی جب بھنور میں پھنس گئے اور بظاہر اعانت کی کوئی راہ نظر نہ آئی۔

تو نماز شروع کر دی اور اسی طرح کے بے شمار واقعات ہیں، تو ان کے اندر بھی اسی عہد کی ذہنیت کا مطالعہ کرو۔ یہ ذہنیت پھر بتدریج متغیر ہوتی گئی یہاں تک کہ یہ وقت آ گیا کہ اب اگر کسی مسلمان کو مشکلات پیش آتی ہیں تو کسی حال میں بھی اس کا ذہن نماز کی طرف یا تلاوت قرآن کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے، یہ ہوتی ہے کہ فلاں درگاہ کی منت مانوں، فلاں عرس میں چادر چڑھاؤں، فلاں مقام پر بکرا ذبح کروں۔ غور کرو ان کی دماغی بناوٹ اور قلبی حالت کیا تھی اور ہماری کیا ہو گئی ہے؟ رونا مجرد ان اعمال ہی کا نہیں، یہ تو کسی شجر فکر کے برگ و بار ہیں۔ ساری مصیبت اس دماغی و فکری حالت کے انقلاب میں مضمر ہے جس سے تمام انسانی اعمال پیدا ہوتے ہیں اور اس پر ارادہ و فعل کا دارومدار ہے:۔

بہرحال اس روایت میں جو صورت حال معلوم ہوتی ہے، یہی ہے کہ لوگوں نے اس مسجد میں نفل پڑھی یا پڑھنا چاہی، اس لئے کہ آنحضرت صلعم کو بھی، وہاں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

اتباع سنّت اور ذوق تشبہ و تخلق

۲۔ لیکن ایسا ارادہ انھوں نے کیوں کیا؟ تو یہ محتمل ہے دو تعلیلوں میں:

پہلی وجہ تو ظاہر ہے، یہ ہوگی کہ آنحضرت کی محبت و تعلیم کی وجہ سے انھیں خیال ہوا جس مسجد میں اس وجود گرامی نے نماز پڑھی ہے، وہیں ہم بھی جا کر نماز پڑھ آئیں، بوجہ برکت مقام اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔

لیکن ایک دوسرا معاملہ بھی اس کے لئے محرک ہو سکتا ہے۔ عہد صحابہؓ کے اقوال و اعمال کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن و حدیث نے سنت کے اعتصام اور آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع وتاسی پر نہایت اصرار واہتمام کے ساتھ زور دیا تھا اور چونکہ صحابۂ کرام کے دلوں میں آپ کا عشق وشغف بھی اس درجہ راسخ واستوار ہو گیا تھا کہ آپ کی ہر بات ان کے لئے محبوب ومطلوب اور آپ کی ہر ادا ان کے دلوں کے لئے دلربا اور روح پرور تھی، اس لئے شرعی رابطہ وعلاقہ کے صرف اسی مرتبہ پر قانع نہیں تھے، جسے اتباع سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ عالم محبت وشیفتگی کی ایک دوسری حالت بھی پیدا ہو گئی تھی، جسے اتباع سنت سے نہیں بلکہ جوش تشبہ وتخلق سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ان دونوں حالتوں کا فرق دقیق ہے۔ بعض اوقات ان کے عدم فہم وامتیاز سے ارباب بحث ونظر کو سخت لغزشیں پیش آگئی ہیں اور بعض معاملات میں تو ایک طرح کا خلط مبحث ہو گیا ہے یہ محل تشریح وتفصیل کا نہیں

محبوب میں گم شدگی

مختصراً یوں سمجھنا چاہیے کہ شرع کی اصطلاح میں اتباع سنت سے مقصود یہ ہے کہ تعلیم وتربیت امت کے باب میں آنحضرت صلعم کے جس قدر قولی وعملی سنن وکلم ہیں، ان سے استفادہ کیا جائے اور جو سنن اعمال وطاعات میں ہیں ان کی بھی پیروی کی جائے، لیکن تشبہ وتخلق بالرسول کا معاملہ ایک دوسری ہی وادی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مبدا عقائد وافکار نہیں، بلکہ باصطلاح حضرات صوفیہ اذواق ومواجید ہیں یہ معاملہ صرف اتباع وتاسی ہی پر قانع نہیں رہتا۔ اس سے بہت آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ مقصود اس سے قلب انسانی وہ حالت ہے جب کسی وجود کی محبت وشیفتگی سے یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی ہر ادا اور ہر بات بھی اسی کی طرح محبوب ومطلوب ہو جاتی ہے بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے کہ جو بات جس طرح اس نے کی ہو ٹھیک ٹھیک میں بھی اسی طرح کروں۔ وہ جہاں چلا ہو، میں بھی چلوں، وہ جہاں بیٹھا ہو میں بھی بیٹھوں۔ اس نے جیسی پوشاک پہنی ہو، میں بھی پہنوں، اس نے جو وضع قطع پسند کی ہو وہی میری بھی وضع قطع ہو جائے۔ حتی کہ میری شخصیت اور شخصیت کے خواص کے تشبہ وتخلق میں اس طرح گم ہو جائیں کہ ۔۔

انا من اهوی و من اهوی انا
نحن روحان حللنا بدنا

کا سا معاملہ واقع ہو جائے۔ جب یہ حالت قلب پر طاری ہوتی ہے تو ایک دوسرے ہی عالم میں انسان اپنے آپ کو پانے لگتا ہے۔

عشق و محبت کی بے اختیاریاں

یہاں اعمال کا محرک اجر و ثواب کی طلب و طمع نہیں ہوتی بلکہ صرف عشق و محبت کا بے اختیارانہ ولولہ ہوتا ہے۔ جب کبھی اس عالم میں کسی کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ میرے محبوب و مطلوب نے فلاں بات ایسی کی تھی اور فلاں کام میں اس کا ڈھنگ ایسا رہا تھا تو بغیر اس کے کہ طلب ثواب و طمع اجر کا اسے احساس بھی گزرے، بے اختیار ہو کر چاہنے لگتا ہے، میں بھی ویسی ہی بات کر گزروں، خواہ اس میں اجر ہو یا نہ ہو۔ پھر جس طرح تمام احوال قلبیہ کے لئے مختلف مراتب و ثمرات ہیں اور ہر مرتبہ و ثمر کے مطابق اس کا حکم ہے، اسی طرح اس عالم کے لئے بھی مختلف مراتب و احکام ہیں اور ہر حالت کے لئے یکساں ہیں۔ یہاں محاسن و مطالب بھی ہیں، مفاسد و مہالک بھی ہیں۔ افراط و تفریط بھی ہے۔ اعتدال و اقتصاد بھی ہے اور پھر جس طرح ہر وادی فکر و عمل میں افراط و تفریط سے پاک اور ہر بات ضبط و اعتدال میں رکھنا چاہتی ہے اسی طرح یہاں کے لئے حدود و قیود ہیں اور ہر حالت اور نتیجہ کے مطابق رد و قبول کے احکام ہیں

جوش و افراط اور اقتصاد

پس صحابہ کے اعمال و امیال پر نظر ڈالو۔ اتباع سنت کے التزام کے ساتھ اس عالم کے واردات یعنی جوش تشبہ و تخلق بالرسول کے معاملات بھی بہ کثرت نظر آئیں گے۔ البتہ چونکہ ذوق و طبیعت کا اختلاف ہر معاملہ میں اختلاف حال پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی سب کا حال یکساں نہ تھا۔ کسی میں یہ رنگ زیادہ، کسی میں کم۔ کہیں جوش و افراط کی طرف میلان تھا، کہیں اقتصاد کی طرف رجحان۔ پھر چونکہ اس معاملہ کی سرحد اتباع سنت مصطلحہ شرع

کی سرحدیں کچھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ دونوں میں حد بندی کرنا کمالِ دقتِ نظر کا محتاج ہے
اس لیے بسا اوقات کسی عمل کی حقیقت اس اعتبار سے مشتبہ بھی ہو جاتی تھی۔ صحابہؓ میں اصحاب
احوال بھی تھے، اصحاب نظر بھی تھے۔ اصحاب احوال اپنے استغراقِ محبت میں اس اشتباہ
کی چنداں کاوش نہیں کرتے تھے، لیکن نظارِ صحابہ اس کا فرق واضح کر دیتے تھے۔ کتنے ہی معاملات
ہیں جن کا الجھاؤ بالکل دور ہو جاتا ہے، اگر یہ اصل تمہارے پیشِ نظر رہے۔ یہ تم حضرت عبداللہ
بن عمرؓ کو پاتے ہو کہ حج کے لیے جاتے تو اس کا اہتمام کرتے کہ جہاں کہیں آنحضرت صلعم نے
سفرِ حج میں قیام کیا ہے، خود بھی کریں۔ جہاں کہیں انہیں نماز کا اتفاق ہوا ہے خود بھی پڑھیں۔
جتنی منزلیں انہوں نے کی ہیں خود بھی کریں۔ پھر یہ بھی پاتے ہو کہ نظارِ صحابہ مثلاً حضرت عائشہؓ
وغیرہا اس سے اختلاف کرتے اور اصرار کے ساتھ کہتے کہ یہ سفر کے عام اتفاقات و حالات
ہیں، سنت میں داخل نہیں۔ تو یہ بات بھی دراصل اسی عالم کے معاملات میں سے ہے۔

اتباعِ سنت اور جوشِ تشبہ

معلوم ہے کہ حج کے سفر میں آنحضرتؐ کے افعال دو حیثیتوں پر مبنی تھے۔ ایک یہ کہ حج
کا سفر بھی ایک سفر ہے۔ آدمی ضرورت اور حالت کے مطابق منزلیں کرے گا، پڑاؤ ڈالے گا۔
کھانے لگا سوئے گا، نماز پڑھے گا۔ کچھ ضروری نہیں کہ ہر سفر میں یہ امور ایک ہی ترتیب و تعیین کے
ساتھ پیش آئیں۔ اگر دو سفروں میں ایک ہی جگہ اترنے اور ٹھہرنے کا اتفاق ہو بھی گیا تو یہ سفر کے
عام اتفاقات میں سے ہے۔ قصد و عمد کو اس میں دخل نہیں۔ پس آنحضرت کو بھی سفر میں یہ
تمام اتفاقات پیش آتے تھے۔ دوسری حیثیت یہ تھی کہ حج ایک عبادت ہے اور اس کے
خاص خاص اعمال ہیں، جن میں بعض مقامات کا قیام و حضور بھی داخل ہے۔ پس آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم بہ حیثیت ایک عبادت و طاعت کے کسی خاص موضع کا قیام مستحسن تصور
فرماتے کبھی قیام نہ کرتے۔ اب چاہیے کہ آپ کے افعال میں سے دوسری چیزیں پہلی سے الگ کر لی
جائیں۔ سنت دوسری ہوگی نہ کہ پہلی۔ چنانچہ نظارِ صحابہ کی اس نکتے پر نظر تھی، لیکن حضرت

عبداللہ بن عمرؓ کا قائم دوسرا امتیاز ان کی طبع مبارک جوش تشبہ تخلق بالرسول میں اس بات کی کاوش میں پر ملتفت نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو تحصیب[1] کا اختلاف روایتوں میں پڑھتے ہو۔ یعنی حضرت عبداللہ بن عمر مکہ سے لوٹتے ہوئے مقام محصب میں ضرور ٹھہرتے تھے لیکن حضرت عائشہ اور عبداللہ بن عباس کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ کہتے "لیس التحصیب بشئ، انما ہو منزل نزل بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اور "انما نزلہ لانہ کان اسمح لخروجہ"۔ (حج میں تحصیب کوئی چیز نہیں وہ تو محض سفر کی ایک منزل ہے جہاں آنحضرت صلعم نے قیام کیا تھا، کیوں کہ وہاں سے آگے کو سفر کرنے میں آسانی تھی) تو دراصل یہ بھی اسی معاملہ کے شواہد و نظائر میں سے ہے۔

پیر کے دن کی موت

اور یہ جو امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے "موت یوم الاثنین" پیر کے دن کی موت اور اس میں حضرت عائشہؓ کی روایت درج کی ہے کہ مرض الموت میں حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا آنحضرت صلعم نے کس دن وفات پائی تھی؟ کہا گیا، پیر کے دن۔ پھر پوچھا آج کون سا دن ہے؟ کہا گیا پیر ہی کا دن ہے۔ اس پر آپ نے آرزو کی کہ میں بھی اسی دن دنیا سے جاؤں: "ارجو فیما بینی و بین اللیل"۔ اگر غور کرو گے تو یہ معاملہ بھی ایک دوسرے رنگ میں اسی ذوق تشبہ کی ایک مثال ہے گرچہ ظاہر بین اسے دوسری ہی وادی میں لے گئے۔

بہرحال حاصل سخن یہ ہے کہ جس طرح صحابہ کرامؓ میں اتباع سنت کا جوش صادق تھا، اسی طرح تشبہ و تخلق کا بھی ذوق کامل تھا۔ ان کے اس ذوق و شوق نے عامۃ المسلمین میں بھی اس کا عام ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ پس بہت ممکن ہے اس روایت

---

[1] مقام محصب میں جو مکہ معظمہ اور منیٰ کے درمیان ہے، رات کو ٹھہرنا یا سونا۔ یہ زرلیا ہے مانتے کہ مجھے (منکی) امید ہے۔

میں بعض اشخاص کا ان مساجد میں جا کر نماز پڑھنا۔ جہاں آنحضرت صلعم نے نماز پڑھی تھی، محض اس جوش تشبہ و تعلق کا نتیجہ ہیں نہ کہ اس خیال کا جو پہلی تعلیل میں بیان کیا گیا ہے۔ اس عہد کی عام ذہنیت اور فکری و قلبی نوعیت حال کا جن لوگوں نے تتبع و استقصا کیا ہے وہ اس دوسری تعلیل کو زیادہ اقرب تسلیم کریں گے۔

---

(۵)

حقیقت بدعت و قصد و اہتمام دینی

۳۔ لیکن حضرت عمرؓ نے کیوں روکا اور کن لفظوں میں روکا؟ تو فی الحقیقت اس باب میں حضرت ممدوح کے الفاظ منجملہ مہات معارف شرع اور منجملہ اصول و قواعد راہ کے ہیں۔ جو کچھ ان لوگوں نے کیا تھا یا کرنا چاہتے تھے وہ دو حالتوں سے خالی نہ تھا۔ یا تو اس خیال سے کیا تھا کہ آنحضرت صلعم نے یہاں نماز پڑھی ہے اس لئے یہاں نماز پڑھنے میں اجر و ثواب زیادہ ہوگا یا جوش تشبہ کے جذبات میں آنحضرت صلعم کی ہر ایسی بات کی بھی پیروی کرنی چاہتے تھے۔ جو اتفاقاً کسی جگہ جانے آنے اور نماز پڑھنے میں ہوگئی تھی، لیکن دونوں صورتوں میں لغزش کا خوف تھا اور گو بالفعل نہیں لیکن آگے چل کر ایک فتنۂ عظیمہ کے مبادی کی راہ کھل سکتی تھی۔ اس لئے آپ سنتے ہی چونک اٹھے اور سختی سے روک دیا۔

تحریف شریعت کی بنیاد

اوّلاً اس لئے کہ اس بات سے اس مقام کی ایک ایسی خصوصیت کا اعتقاد پیدا ہوتا تھا، جو شرعاً ثابت نہیں یعنی یہ اعتقاد پیدا ہوتا تھا کہ وہاں نماز پڑھنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ اہتمام کرنا چاہیئے، حالانکہ ایسا اہتمام کسی مقام کے لئے اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ شارعؑ نے اس مقام کو شرعی حیثیت سے مستحق اہتمام ٹھہرایا ہو۔ یہ بات کہ دینی حیثیت سے کون سی جگہ زیادہ محترم ہے؛ یا کس جگہ عبادت کرنے میں خاص اہتمام کرنا چاہیے؟ یا کہاں عبادت کرنے میں اجر و ثواب زیادہ ہے؟ ایک ایسی بات ہے جسے صرف شریعت ہی بتلا سکتی ہے۔ ہم اپنی رائے اور خواہش

سے نہیں ٹھہرا سکتے۔ شریعت نے تمام ایسے مقامات بتلا دیے ہیں اور حکم دے دیا ہے کہ وہاں بہ نیت ثواب و عبادت جانے میں اہتمام کیا کرو۔ اب اگر خدا نخواستہ کوئی نئی جگہ ٹھہرائی جائے گی اور اس کی خصوصیت کا اعتقاد پیدا ہو جائے گا تو یہ شریعت کے بتلائے ہوئے احکام پر اضافہ ہوگا اور یہی چیز تحریف شریعت کی بنیاد ہے۔

پرستش گاہوں کی ابتدا

تاتاری لوگوں کے ایسا کرنے سے اس مسجد کی جو خصوصیت نکلتی تھی، وہی آگے چل کر اس کے زیارت گاہ بن جانے کا ذریعہ بن سکتی تھی یہ دنیا کی تمام پچھلی قوموں نے اللہ اور اس کی شریعت کے ٹھہرائے ہوئے مقامات اجتماع و مراسم کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں پرستش گاہیں بنا چھوڑی ہیں تو پہلے پہل ان کی طرف لوگوں کو توجہ کیوں کر ہوئی؟ اسی خصوصیت کی وجہ سے ہوئی۔ پہلے یہ ہوا کہ کسی مقام کو کسی کی بنا پر لوگوں نے خصوصیت دیدی اور وہاں کا قصد کرنے لگے۔ یہ قصد پرستش اور بدع و رسوم کے لئے نہیں تھا، عبادت الٰہی ہی کے لئے تھا، لیکن بعد کو یہی خصوصیت اس کی ایک زیارت گاہ عام بن جانے کا ذریعہ بن گئی، پھر کچھ عرصہ کے ایک بعد ایک پورا معبد بن کر نمودار ہو گیا پس شریعت کو اس باب میں جس چیز سے انکار ہے وہ یہی خصوصیت کی وجہ سے قصد و اہتمام کرنا ہے۔ اگر کسی مقام کے لئے ایسی خصوصیت کا دینی اعتقاد پیدا نہ ہوا ہو تو اگرچہ وہ کسی مقدس انتساب کے ساتھ مشہور بھی ہو جائے لیکن شریعت کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وہ ایک تاریخی یادگار ہے اور ایسی یادگاریں محفوظ رکھنا بہت سے دینی اور اجتماعی فوائد کا ذریعہ ہوتا ہے۔

بدعت مصطلحہ شریعت

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس معاملہ کی خصوصیت کی حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کو عجیب عجیب ٹھوکریں لگتی ہیں۔ صریح غلط مثالیں دینے لگتے ہیں اس معاملہ کو قومی اور تاریخی یادگاروں اور عام غیر دینی اجتماعات یا معاشرتی رسوم و عوائد کے ساتھ خلط مبحث کر دیتے ہیں مثلاً جب کبھی کوئی ایسی بدعت قرار دی جائے تو کہتے ہیں اگر اس طرح کی باتیں بدعت ہوں گی تو پھر لوگوں کا کسی مقام پر اجتماع ہی ناجائز ہو جائے گا۔ کوئی قومی اور تاریخی یادگار باقی نہ رکھی جا سکے گی نیک اور مفید کاموں کے لئے نئی نئی صورتیں نکالنا اور لوگوں کا جمع ہونا بند ہو جائے گا۔ حالانکہ ان امور کو اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں۔ دونوں میں اختلاف عظیم ہے جن باتوں کو مثال میں لایا جاتا ہے، حاشا کہ شریعت ان کی اور اس طرح کے امور کی مخالف ہو اس طرح کے امور بہ اعتبار لغوی معنی کے بدعت ہوں، لیکن بدعت مصطلحہ شرع نہیں ہیں اور ممنوع وہی بدعت ہے نہ کہ بدعت لغوی۔ شریعت کا قدم تو صرف اس وقت درمیان آتا ہے جب کسی مقام یا عمل کو اس کی عام دنیوی حیثیت سے ہٹا کر کسی دینی اعتقاد کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے اور کسی ایسی خصوصیت کا خیال پیدا ہو جائے جس کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ ہمارے ہاتھ میں نہیں بلکہ شریعت کے ہاتھ میں ہے۔ جب ایسی دینی خصوصیت اس سے لاحق ہو گئی اور کسی دنیوی نقطہ خیال سے نہیں بلکہ دینی تسلیم و تبرک یا ثواب و عقاب اور نفع وغیرہ کے اعتقاد سے لوگ اس کا قصد و اہتمام کرنے لگے تو پھر وہ اپنے عام دائرے سے نکل کر ایک دوسرے ہی دائرے میں آجاتی ہے اور اگر شریعت اسے نہ روکے تو چند دنوں کے بعد ایک غیر شرعی بات شرعی بن کر اصلی شریعت میں نئے نئے اضافے کر دیتی ہے۔ جب یہ اضافات کچھ مدت تک جاری رہتے ہیں تو دین الٰہی

کی اصلی مقدار پر چند در اضافات کی اتنی بڑی مقدار بڑھ جاتی ہے کہ اصلیت کا پتہ چلانا دشوار ہو جاتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب شریعت محرف ہو کر کچھ کچھ بن جاتی ہے۔

جامع مسجد، تاج محل اور قطب صاحب

اگر ایک مثال دے دی جائے تو بات واضح ہو جائے گی۔ مثلاً دہلی میں بے شمار آثار قدیمہ کی طرح قطب صاحب کی لاٹ بھی ہے۔ ہمیشہ ہزاروں لاکھوں انسان اسے دیکھنے کے لئے جاتے ہیں اور صرف اسی کے لئے شد رحال کرتے ہیں، یعنی بالقصد و اہتمام سفر کرتے ہیں۔ یہاں تک شریعت کو کوئی اعتراض نہیں۔ یا مثلاً آگرہ میں تاج محل ہے۔ یہ شاہجہاں اور اس کی بیوی کا مقبرہ ہے۔ مقبرہ پر دنیا کا خوبصورت ترین گنبد ہے اور پوری عمارت منجملہ محاسن تعمیرات عالم کے ہے۔ ہمیشہ بے شمار خلقت جمع ہوتی ہے اور اس کی زیارت، زیارت کے لغوی معنی میں کرتی ہے اس اجتماع و سفر میں بھی شریعت کے لئے مداخلت کی کوئی وجہ نہیں، لیکن اب فرض کر دا ایسا ہو کہ کوئی پیر صاحب لوگوں میں یہ خیال پیدا کرا دیں کہ قطب صاحب کی لاٹ ایک متبرک منارہ ہے اور اس کی زیارت کرنا موجب ثواب و برکت ہے یا تاج محل آگرہ کی زیارت مشکلوں اور مصیبتوں کے دور کرنے کے لئے تریاق مجرب ہے، یا ایسا ہو کہ کوئی خاص مہینہ اور دن اس غرض سے ٹھہرا لیں مثلاً کہیں شعبان کی دسویں تاریخ کو جو شخص دہلی جاکر قطب صاحب کے منارے کی زیارت کرے گا یا اس کے نیچے کھڑا ہو کر نماز پڑھے گا، اسے ایک خاص اجر و ثواب حاصل ہوگا۔ بس جونہی یہ خیال پیدا ہوا، وہ چیز پیدا ہو گئی جسے دینی خصوصیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہیں سے اس روایت میں نکتہ شناس فقہا بعض شریعت حضرت عمرؓ نے اوقصد ہا

کا ایک لفظ جامع فرما کر روک دینا چاہا تھا۔

تاریخی یادگار اور پرستش گاہ

اب یہ معاملہ اس کی عام دنیوی نوعیت سے نکل کر شرعی حدود میں آگیا اور چونکہ شرعاً قطب صاحب یا تاج محل کے لئے کوئی ایسی خصوصیت موجود نہیں اس لئے شریعت فوراً مداخلت کرے گی اور کہے گی ' یہ بدعت ہے اور بہ قاعدۂ کلّ بدعۃ ضلالۃ اسے گمراہی قرار دے گی، لیکن اگر علماء و حکام نے اس کے انسداد میں تساہل کیا تو پھر کچھ عرصہ کے بعد یہی وہ مقام جو ایک تاریخی یادگار کی صورت میں صدیوں سے موجود تھے، سچ مچ کو پرستش گاہ بن جائیں گے اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کا دماغ وقف خرافات واوہام ہو جائے گا۔

ایک اور مثال لو۔ دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد کی تاریخی نوعیت اور ذاتی خوبصورتی کی کشش سے کون ہے جو اپنا دل بچا سکتا ہے؟ کس کے دل میں یہ ولولہ نہیں اٹھتا کہ کم از کم ایک مرتبہ جائے، اسے دیکھے اور اس کی صفوں میں کھڑے ہو کر نماز پڑھے؟ یہاں تک بالکل ٹھیک ہے، حالت اپنی نوعیت میں ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ شریعت خواہ مخواہ اس میں مداخلت کرے۔

شرعی سفر کے مقامات

لیکن اگر کل کو کوئی شخص یہ اعتقاد لے کر دہلی کا سفر کرے کہ جامع مسجد میں جا کر نماز پڑھنا ایک ایسے اجر و ثواب کا موجب ہے، جو دوسری مساجد میں نصیب نہیں ہو سکتا، تو اب یہ نئی خصوصیت ہو جائے گی اور "لا تتخذوا" کی نہی میں آجائے گی۔ اس حالت میں ان لوگوں کا دہلی جانا اور جامع مسجد کا قصد کرنا بدعت و ضلالت ہوگا

اور حالات اسکا عرض پر گاکر سکیں۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلم کی مشہور روایت میں فرمایا "لاتشد والرحال الا الی ثلاثۃ الی آخر الحدیث" یعنی قصد و اہتمام اور خصوصیت دینی کے اعتقاد کے ساتھ شرعی سفر نہیں ہے مگر تین مقامات کے لئے، مسجد حرام، مسجد نبویؐ اور مسجد بیت المقدس، حالانکہ ویسے تو ان کے لئے بزاروں سفر ہیں۔ تجارت کے لئے ہے، سیاحت کے لئے ہے، طلب علم کے لئے ہے آثار قدیمہ و تاریخیہ کی زیارت و تحقیق کے لئے ہے، دوستوں کی ملاقات کے لئے ہے، لیکن وہ قصد و اہتمام دوسری چیز ہے اور دینی خصوصیت کے ساتھ قصد و اہتمام کرنا دوسری بات ہے۔ شرعاً ممنوع پہلا اہتمام نہیں ہے دوسرا ہے۔ غور کرو بات کتنی صاف ہے لیکن آج تک بدعت و احداث کی حقیقت لوگ نہ سمجھ سکے۔

قبور و آثار اور مساجد و معابد

۴۔ پچھلی قومیں خصوصاً عیسائی اور یہود باوجود شریعت الٰہی اور دین توحید کے قیام کے گمراہ ہوگئے؛ ایسی ہی باتوں سے گمراہ ہوئے اور ایسی ہی باتوں سے ان میں یہ معاملہ شروع ہوا۔ محبت تعظیم آثار و تبرکات، توسل تشفع، قصد و اہتمام کے ساتھ اعتقاد توحید کے ساتھ ایسی باتوں میں اہتمام اور ان کی صحت و جواز کے لئے گمراہ کن توجیہیں کہ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفا۔ پس حضرت عمرؓ نے فرمایا "انما ہلک من کان قبلکم بمثل ہذا"، پچھلی قومیں ایسی ہی باتوں سے ہلاک ہوئیں، یعنی ہدایت کی زندگی کے بعد گمراہی کی موت ان کے حصہ میں آئی

تتبع آثار کی گمراہی !

۵ - اور فرمایا "یتبعون آثار انبیائہم" وہ اپنے نبیوں کی یادگاروں اور ان کی طرف منسوب چیزوں کا کھوج لگاتی تھیں یعنی محبت و تعظیم کی وجہ سے ان کے آثار ڈھونڈتی تھیں اور ان کی زیارت کو موجب برکت و ثواب یقین کرتی تھیں۔ اسی سے ان کے زیارت گاہ بن جانے کی راہ نکلی اور پھر رفتہ رفتہ وہ پوری طرح پرستش گاہ بن گئیں۔

جو لوگ اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گئے تھے وہ اس لیے گئے تھے کہ یہاں آنحضرتؐ نے نماز پڑھی ہے، اس لیے چاہیے ہم بھی نماز پڑھیں۔ اس سے یہ پہلو نکل سکتا ہے کہ یہ وجہ انتساب لوگ اس مسجد کا قصد کرنے لگیں اور آنحضرت کے آثار کے سراغ لگانے اور انھیں زیارت گاہ بنا لینے کا امت پر دروازہ کھل جائے۔ پس سبحان اللہ حضرت عمرؓ کی نگاہ حقائق بین اور فکر غواص آشنا مجرد یہ سننے کے کہ مسجد صلّٰی فیہا النبی، آپ نے دیکھ لیا کہ تتبع آثار کی گمراہی اس معاملے کے اندر سے جھانک رہی ہے اور اگر اس وقت دروازہ بند نہ کیا گیا تو اسی راہ سے اس کے قدم بڑھ آئیں گے۔ پس فوراً روک دیا اور فرمایا: انما ہلک من کان قبلکم بمثل ہذا کانوا یتبعون آثار انبیائہم۔ "ایسی ہی باتوں سے پہلی قومیں گمراہ ہوئیں۔"

آثار انبیاء پر عبادت گاہیں

۶ - "و یتخذونہا کنائس و بیعا" یعنی وہ اپنے نبیوں کے آثار ڈھونڈتے ہیں اور پھر انھیں معبد بنا لیتے ہیں۔ بیع اور کنیسہ یعنی اہل کتاب کی مسجدیں اور عبادت گاہیں۔ بعضوں نے کہا: بیع سے مقصود یہودیوں کی مسجد ہے۔ بعض نے کہا عیسائیوں کی۔ امام ابن جریر نے سورہ حج کی تفسیر میں تمام اقوال جمع کر دیے ہیں۔ یہ بہر حال مقصود اہل

کتاب کی عبادت گاہ ہے۔ اب یہاں اہم اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ حضرت عمرؓ نے کہا
یتخذونہا کنائس ہو بیعا، نیز تمام احادیث باب میں بھی اس معاملہ کا اتخاذ مسجد سے تعبیر
کیا گیا مثلاً صحیحین کی مشہور روایت عائشہؓ میں ہے لعن اللہ الیہود والنصاریٰ
اتخذوا قبور انبیائہم مساجد اور سنن کی روایت ابن عباس میں ہے لعن رسول اللہ صلعم
زائرات القبور والمتخذین علیہا المساجد والسراج تو اتخاذ مسجد یعنی قبروں اور متبرک آثار کو مسجد
ومعبد بنا لینے سے مقصود کیا ہے؟ دراصل مقصود بالکل واضح تھا۔ اُمت کو اس کے
سمجھنے میں کبھی اشتباہ نہیں ہوا، لیکن اب بدقسمتی سے ارباب بدعات کی دور دراز
کار توجیہیں اور معنوی تحریفیں اور حقیقت حال لوگوں پر مشتبہ کر رکھی ہے اور طرح
طرح کے نئے معنی پہنا کر ایک صاف صاف بات کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔

یہود و نصاریٰ

یہ ظاہر ہے کہ اس باب میں آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام نے جس بات
سے روکا ہے اور اس پر لعنت بھیجی ہے، وہ وہی ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں نے
کی تھی۔ صحیحین کی ایک دوسری روایت میں صاف موجود ہے کہ حضرت ام سلمہؓ اور ام حبیبہؓ
نے آنحضرت سے عیسائیوں کے ایک کنیسہ کا حال بیان کیا جو انھوں نے حبش میں
دیکھا تھا۔

"اس پر آپ نے فرمایا اولٰئک اذا مات فیہم الرجل الصالح بنوا علی قبرہ مسجدا (الی آخر الحدیث)
یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کا دستور ہے، جب کوئی بزرگ اور نیک آدمی مر جاتا ہے تو اس
کی قبر پر مسجد بنا کھڑی کرتے ہیں۔ یہ اللہ کے نزدیک نہایت ہی بُرے لوگ ہیں۔ ان پر
خدا کی لعنت ہو۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ جس گرجے کا آپ نے ذکر کیا تھا وہ ماسیہ
کے نام سے مشہور تھا یعنی حضرت مریمؑ کا گرجا۔

پس سب سے پہلے یہ بات معلوم کرنی چاہیئے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا طریق
عمل اس باب میں کیا تھا اور کیا ہے؟ جو کچھ معلوم ہوگا، وہی مطلب یہاں بھی اتخاذ
مسجد کا لینا پڑے گا، کیوں کہ عمل انہیں کی طرف منسوب ہے اور انھیں کی سی بات کرنے
سے روکا گیا ہے۔

حقیقت کیا تھی

اچھا غور کرو اہل کتاب کا حال کیا تھا؟ کیا ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی بزرگ
انسان مرجاتا تو وہ اس کا ایک بت بنا کر وہاں نصب کر دیتے تھے؟ یا اس کی کسی یادگار کو
بت پرستوں کی پوجا کی طرح رکھ دیتے تھے اور اس کی اس طرح پوجا کرتے تھے جس طرح
ہندو شیو کی یا کالی کی پوجا کرتے ہیں؟ یا پھر ایسا تھا کہ وہ ان بزرگوں کو فاطر السموات والارض
یقین کر کے ان کے آگے سجدے کرتے تھے، جو دنیا کے کسی سخت سے سخت بت پرست
نے بھی آج تک نہیں کیا؟ معلوم ہے کہ یہود و النصاریٰ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ کوئی انسان
جسے اہل کتاب کی تاریخ اعمال و رسوم سے واقف ہونے کا کچھ بھی موقع ملا ہو، ایک
لمحہ کے لئے بھی خیال نہیں کر سکتا۔ ہر واقف حال تسلیم کرے گا کہ ان معنوں میں نہ تو کبھی
یہودیوں نے آثار و قبور کو مسجد بنایا نہ عیسائیوں نے۔ آج بھی دنیا کے ہر حصہ میں ان کے
گرجے اور مقدس عمارات موجود ہیں۔ خود ہندوستان میں سیکڑوں گرجے موجود ہوں گے،
جس کا جی چاہے جا کر دیکھ لے۔ ان باتوں کا نام و نشان نہ پائے گا۔ عیسائیوں میں تو رومن
کیتھولک چرچ کے پیرو حضرت مریم علیہا السلام کے مجسمے استعمال کرتے ہیں، لیکن یہودیوں
کے یہاں تو کسی شکل اور کسی گوشے میں بھی بت پرستی بمعنی مندرجہ صدر وجود نہیں رکھتی، معاذ
بت گر اور ہر ایسی چیز کو جس کی پوجا کی جاتی ہو، نجاست سمجھتے ہیں اور اس کی چھوت
سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے کسی نبی یا ولی کی قبر یا کسی یادگار

کو شیو اور کالی کے مندر کی طرح معبد بنایا ہو اور ان معنوں میں ان کی پوجا کرتے ہوں، جن معنوں میں ان دیوتا دیویوں کی پوجا کی جاتی ہے۔

محبت و تعظیم میں غلو

دراصل جو کچھ ان دونوں قوموں نے کیا تھا اور کر رہی ہیں، وہ یہی تھا کہ سب سے پہلے نبیوں اور بزرگوں کی محبت اور تعظیم نے ان پر غلو اور افراط کا دروازہ کھولا اور لگے خصوصیت و اہتمام کے ساتھ ان کی قبروں اور آثار کی زیارت کرنے۔ اس چیز نے بڑھتے بڑھتے یہ شکل اختیار کی کہ وہ مقامات باقاعدہ زیارت گاہیں بن گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ تعظیم و اجلال کے لئے ان پر بڑی بڑی عمارتیں بنائی گئیں۔ عمارتوں پر اسی طرح گنبد اور منارے بلند کیے گئے جس طرح گرجوں پر امتیاز و تقدیس، روحانی جاہ و جلال اور قدوسی ہیبت و جبروت کے وہ تمام ساز و سامان آراستہ ہو گئے، جو انسانوں کے دلوں میں مافوق الفطرت عظمت و شان کے پُراسرار جذبات پیدا کر سکتے ہیں۔ مثلاً قبر پر یادگار کے مقام کو مقدس قربان گاہ (آلٹر) کی طرح آراستہ کرنا، بڑی بڑی شمعیں شب و روز روشن رکھنا، چاندی سونے کے کٹہرے سے گھیر دینا، منقش اور مطلا چادریں ڈال دینی، ہمیشہ انگیٹھیاں روشن کرنا اور ان میں بخور جلاتے رہنا، عبودیت و نیاز کی عاجزی و تضرع کے ساتھ لوگوں کا وہاں جانا۔ تعظیم و احترام کے ساتھ بوسہ دینا اور سر جھکانا۔ ہر طرف سے لوگوں کا ان کی زیارت کے لئے ہجوم کرنا۔ خاص خاص مہینوں اور تاریخوں کو ان کی پیدائش یا موت کا دن ٹھہرا کر منانا۔ اپنی حاجتیں اور مرادیں لے کر وہاں جانا اور اس طرح منتیں ماننا جس طرح وہ خدا کے حضور مقدس ہیکل میں مانا کرتے تھے۔ علاوہ بریں وہاں جانا اور اس طرح منتیں ماننا جس طرح وہ خدا کے حضور مقدس ہیکل میں مانا کرتے تھے۔ علاوہ بریں وہاں لوگوں کا جمع ہو کر قربانیاں کرنا، نذر نیاز چڑھانا،

تبرکات تقسیم کرنا۔ غرض اسے انسانوں کے روحانی رجوع، اجتماع اور توجہ و عقیدت کا ایک
محل و مرکز بنا لیا۔ یہی طریقہ یہود و نصاریٰ نے اول دن سے دن سے اختیار کیا
اور اسی طریقہ پر آج تک عامل ہیں۔ اس سے زیادہ انھوں نے قبور و آثار کے ساتھ
کچھ کیا اور نہ اس سے زیادہ ان کی بنائی ہوئی زیارت گاہوں میں کوئی چیز دکھائی دے سکتی ہے
یہ حقیقت اس درجہ معلوم و مسلّم ہے کہ کسی اثبات و استشہاد کی ضرورت نہیں۔ مع ہذا اگر تاریخی
حیثیت سے ان کے ظہور و شیوع کی تفصیلات دیکھنی ہو تو صرف دین مسیحی کی قدیم و جدید
تاریخیں ہی دیکھ لی جائیں۔ سولیم میور کی ہسٹری آف دی چرچ ہندوستان میں ہر جگہ مل سکتی
ہے۔ ضمناً ان رسوم و عوائد کی بعض تفصیلات ڈریپر کی مشہور کتاب کانفلکٹ بٹ دین
ریلیجن اینڈ سائنس (معرکہ مذہب و سائنس) میں بھی ملیں گی۔

صلیب کے تقدس کی ابتدا

مثلاً ابتدا میں ایسا ہوا کہ دین مسیحی کے مخلص داعیوں نے لوگوں کو حضرت مسیح علیہ السلام
کی عظیم الشان قربانی کی یاد دلانے اور واقعۂ صلیب کے تذکار کے لئے صلیب کو
بطور ایک علامت کے استعمال کرنا شروع کیا۔ پھر کچھ لوگ آئے جو ہر دینی موقع پر
صلیب اپنے ہاتھ میں رکھتے اور عامتہ الناس کو حضرت مسیح کی قربانی اور اس مؤثر طریقہ
پر یاد دلاتے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ اب صلیبوں کے لئے حضرت مسیح کے انتساب کی
وجہ سے عوام کے دلوں میں تعظیم و احترام کے جذبات پیدا ہوتے، چنانچہ پیدا ہوئے اور وہ
اس لکڑی کو نہیں جس سے صلیب بنی تھیں، بلکہ اس نسبت کو جو حضرت مسیح سے انھیں
حاصل تھی، جوش محبت میں بوسہ دینے لگے۔ اس اثنا میں دین مسیحی رومی ممالک میں پھیلنے
لگا۔ رومی بت پرستوں نے یہ نئی سامی دعوت توحید قبول تو کر لی تھی، لیکن اپنے دلوں
سے مشرکانہ پرستش کا میلان نہ نکال سکے تھے۔ ادھر روم کے شاہی خاندان کو بعض

سیاسی مقاصد کی بنا پر دین مسیحی قبول کرنا پڑا اور مسیحیت کا ایک جدید رومی دور شروع ہو گیا۔

مسیحیت کا رومی دَور

یہ دَور پوری طرح قدیم رومی علم الاصنام کے اثرات سے ممزوج تھا۔ اب تبرک، توسل، انتساب اور محبت و تعظیم کے ابتدائی مظاہرات نے بڑی عجلت و سرعت کے ساتھ بعید کی منزلیں طے کرنا شروع کر دیں اور مسیحی زیارت گاہوں نے عبادت خانوں کا سارنگ روپ اختیار کر لیا۔ چنانچہ اس عہد میں ایسا ہوا کہ ہر شہر اور گوشہ میں بے شمار مقدس عمارتیں بن کر تیار ہو گئیں۔ نہ صرف حضرت مسیح اور حضرت مریم علیہا السلام اور ان کے حواریین کے بلکہ بے شمار مسیحی اولیاء و شہداء کے تبرکات و آثار پیدا ہو گئے۔ جس شخص نے چاہا کہ اپنی چاہا کہ اپنی مجاوری کے لئے ایک معبد پیدا کر لے، فوراً مشہور کر دیا کہ فلاں ولی اور فلاں شہید کی یادگار نکل آئی یا انھوں نے خواب میں آکر مجھے اس کا پتا بتا دیا ہے۔ فوراً اس پر ایک مقدس عمارت بن گئی اور لوگوں نے زیارت گاہ بنا کر نذر و نیاز شروع کر دی۔ روما میں اس وقت تک سینٹ پال کا مشہور گرجا موجود ہے۔ اس کی بنیاد بھی ابتدا میں اسی طرح پڑی تھی کہ سینٹ (یعنی ولی پولس) کے بعض تبرکات و آثار ڈھونڈ نکالے گئے اور انھیں ایک مقام پر رکھ کر زیارت گاہ تعمیر کر دی۔ یہ آج تک رومن کیتھولک عیسائیوں کا قبلہ حاجات و کعبۂ رحلات ہے۔ روم کے ویٹیکان یعنی پوپ کے مقدس محل کے احاطہ میں پچاس سے زیادہ ایسی مقدس عمارتیں اور زیارت گاہیں ہیں اور گو تاریخی حیثیت سے ان کا انتساب کبھی ثابت نہ کیا جا سکا، لیکن صدیاں سے مسیحی دنیا کے مذہبی و روحانی عواطف ان سے وابستہ چلے آتے ہیں۔

ایام و شہور متبرکہ کا آغاز

اس سلسلے میں غیر شرعی ایام و شہور متبرکہ کی بھی بنیاد پڑی۔ یعنی کوئی خاص
دن اور مہینا بزرگوں کی ولادت یا وفات کا ٹھہرا کر اسے ان کے عرس کا مخصوص
دن قرار دینا اور اس دن خاص طور پر ان کی زیارت کے لیے جمع ہونا، دور دراز
مقامات سے سفر کرنا، شمعیں اور چادریں چڑھانی اور اپنی مصیبتوں اور مرادوں
کے لیے منتیں مان کر کسی خاص نذر و نیاز کا اہتمام کرنا۔ چنانچہ مسیحی تاریخ و ایام
کا کوئی بزرگ انسان ایسا نہیں، جس کا عرس نہ قرار دیا گیا ہو اور جس کے عرس کے
لئے خاص خاص چیزیں اور خاص خاص طریقے نذر و نیاز کے رائج نہ ہو گئے ہوں۔
اس وقت تک یہ ایام اعراس مسیحی تقویموں کی یادداشت کے خانوں میں اسی طرح
لکھے جاتے ہیں جس طرح منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کی بڑی جنتری میں مسلمان اولیاء
کے عرسوں کی تاریخیں نوٹ کی جاتی ہیں۔ سینٹ پال ڈے یعنی پولس ولی کے عرس
کا دن، آل سینٹس ڈے، یعنی تمام ولیوں کی نیاز کا دن، آل سولس ڈے یعنی تمام اموات
کی نیاز کا دن، اسی طرح کے بیسیوں عرس ہیں، جن کا حال ہر اس شخص کو معلوم ہوگا، جسے
مسیحی مسائل کے حالات سے کچھ بھی واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔
یا ہندوستان کے کسی مسیحی اخبار کے "پرسنل" اس نے پڑھے ہیں۔ انگلش مین، کے
پرچوں میں دس پانچ اعلانات ان ختموں اور دعاؤں کے ہمیشہ چھپتے ہیں، جو زیادہ تر رومن
کیتھولک فرقوں کی طرف سے ہوتے ہیں اور جن میں ان ختموں اور دعاؤں کی
تصریح ہوتی ہے، جو کسی خاص ولی کے عرس کے دن کے لئے مخصوص ہیں اور اسی دن
پڑھی جاتی ہیں۔

خاندانوں کے اولیاء

اسی سلسلے میں یہ بات سن کر عجیب نہیں ناواقف مسلمانوں کو تعجب ہو کہ جس طرح
آج کل مسلمانوں میں عام دستور ہو گیا ہے کہ ہر شخص اور خاندان ضروری سمجھتا ہے،
کسی نہ کسی خاص بزرگ کو اپنا مقصود و مطلوب ولی بنا لے اور اپنی مشکلوں مرادوں میں
اسی کا آسرا پکڑے، ٹھیک یہی طریقہ عیسائیوں کا بھی تھا اور آج تک رومن
کیتھولک چرچ کے عیسائیوں میں رائج ہے۔ ہر شخص اور ہر خاندان کے لئے کوئی نہ کوئی
روایتی ولی (ٹریڈیشنل سینٹ[1]) ضروری ہوتا ہے جس کا وہ خاص طور پر ہر سال عرس
کرتا ہے۔ نذر و نیاز دیتا ہے اور اپنی مشکلات و حوائج میں اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔
فرانس کے قدیم شاہی خاندان بوربون کو سینٹ جان سے خاص ارادت تھی، ان کی تمام
مذہبی تقریبات میں سینٹ جان کا عرس سب سے زیادہ شاندار ہوتا تھا۔ کوئی
شاہزادہ ہم کی نسبت مشہور ہے کہ جب اسے گلوٹین کی طرف لے جانے لگے تو عالم
بے ہوشی میں سینٹ جان کے نام کا ورد کر رہا تھا۔ چارلس اڈمنڈ، بوربون کی تاریخ میں
لکھتا ہے وہ جب صبح اٹھتے تھے تو سب سے پہلے سینٹ جان کے نام کا ورد کرتے
تھے۔ روس کے آرتھوڈکس چرچ کے معتقدین کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی خوش اعتقاد عیسائی
ایسا نہیں ملے گا جو کسی خاص ولی کا معتقد اور اس کا عرس کرنے والا نہ ہو۔ زار کے خاندان
کے دو پیر تھے۔ عورتوں کا الگ اور مردوں کا الگ۔ دونوں کے عرس ہر سال باری باری
سے سینٹ پیٹرز برگ اور ماسکو میں منائے جاتے تھے۔

---

[1] TRADITIONAL SAINT تلفظ —

یہودیوں کی کیفیت

یہ تو عیسائیوں کا حال ہے۔ یہودیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔
اس قوم نے وادی سینا کی گوسالہ پرستی کے بعد (جو اثرات مصر کا بقایا تھا) پھر کبھی بت پرستی اس معنی میں نہیں کی کہ پتھر کا بت بنا کر اس کی پوجا کی ہو۔ نہ کبھی قطعاً ایسا ہوا کہ اپنے نبیوں اور بزرگوں کے قبور و آثار کو انھوں نے اس معنی میں معبد بنایا ہو۔ جو کچھ کیا وہ یہی تھا کہ تبرک و توسل اور محبت و تعظیم کے جذبات سے خصوصیت کے ساتھ ان کا قصد کرنے لگے۔ پھر انھیں زیارت گاہ بنادیا اور زیارت گاہوں پر بڑی بڑی ہیکل نما عمارتیں بنا کر کھڑی کیں۔ چنانچہ آج بھی ہر شخص فلسطین اور بیت المقدس میں جا کر بیت خلیل، بیت عمانوئیل، بیت لحم، بیت عزرا، ہیکل دانیال وغیرہم کا معائنہ کر سکتا ہے۔ وہاں نہ کوئی بت ہے، نہ محراب عبادت، نہ ہی کسی قبر کے اوپر بہ معنی فوقیت کوئی عبادت گاہ تعمیر کی گئی ہے۔ جو کچھ ہے یہ ہے کہ قبروں یا قبر کے قدیم مواضع اور تہ خانوں پر گلکاری دار چادریں پڑی ہیں۔ رنگ برنگ کی قیمتی قندیلیں لٹک رہی ہیں۔ بڑی بڑی معطر شمعیں روشن ہیں۔ چاندی سونے کی انگیٹھیوں میں مقدس بخور سلگ رہا ہے اور مردوں عورتوں کے ہجوم ہیں، جو وہاں اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگ رہے ہیں۔

مسلمان اور اتباع سنن اہل کتاب

یہ ہے یہود و نصاریٰ کا قبور و آثار کو مسجد بنا لینا۔ قطع و جزم کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لئے نہ تو ان کا کوئی فعل ثابت و مشہور ہے، نہ مسموع و مکتوب۔
پس اس روایت میں نیز آنحضرت صلعم کے مشہور ارشادات میں جہاں کہیں مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی طرح اتخاذ قبور و آثار مساجداً وعیداً سے روکا گیا ہے تو اس سے مقصود

ایسی ہی صورت حال ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے اصحاب بدع و رسوم سمجھتے ہیں کہ مسجد بنا لینے کا مطلب ان اعمال و عقائد کے سوا کچھ اور ہوگا۔ خدارا کوئی ذی العقل تبلائے کہ وہ کچھ اور کیا بلا ہے؟ آخر اللہ کے رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کے اقوال ان کے نزدیک بامعنی ہیں یا بے معنی؟ اگر بامعنی ہیں تو ان الفاظ کا کوئی مطلب و محمل بھی ہے یا نہیں؟ پھر وہ کیا ہے؟ کیا مسجد بنا لینے کا مطلب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی قبر یا یادگار کے آگے محراب یا مسیحی قربان گاہ بنا دی جائے اور لوگ وہاں اس نیت سے کہ ہماری نماز اس قبر اور یادگار کے لئے ہے، نہ کہ خدا کے لئے نماز پڑھا کریں؟ یا یہ سمجھتے ہیں کہ اس قبر کے عین سینے پر مہادیو کے بت کی طرح ایک بہت بڑا بت نصب کر دیا جائے اور لوگ صبح و شام وہاں جمع ہو کر گھنٹے بجایا کریں؟ اگر فی الحقیقت وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو افسوس ان کے تبل ہزار جہل پر اور صد افسوس ان کی اس جرأت شرم ناآشنا پر، کیوں کہ خدا کا اس مرض میں مبتلا ہو کر ہم بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح ہو گئے کہ کسی قبر یا اثر کو مسجد نہیں بنایا اور ہمیں علم و بصیرت کے گوش دیئے۔ سے اس جہل اندیشی و کج بازی سے آشنا ہوئے ہ ازکم ، - اس لئے کہا گیا کہ جہاں تک اعتقاد و تصورات دینیہ کا سوال ہے اہل کتاب بجائے خود رہے، دنیا کے کسی سخت سے سخت بت پرست نے بھی آج تک غیر اللہ کی عبادت یہ سمجھ کر نہیں کی کہ وہی معبود حقیقی کا مستحق ہے۔ مشرکین عرب تک کا یہ حال تھا کہ: ولئن سالتہم من خلق السموات والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ[۱]۔ جس عبادت کو اسلام نے توحید حقیقت کا ضد ٹھہرایا ہے وہ تو مشرکین عرب کا قول نقل کرتے ہوئے بالفاظ قرآنیہ یہ ہے کہ ما نعبدہم الا لیقربونا الی اللہ زلفی[۲] اور یا ہؤلاء شفعاؤنا[۳] وغیر ذالک من الآیات۔

---

[۱] اور اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے بنایا آسمان اور زمین کو اور کام میں لگایا سورج اور چاند کو تو کہیں گے اللہ نے (عنکبوت)۔ [۲] ہم تو ان کو پوجتے ہیں اس واسطے کہ ہم کو پہنچا دیں اللہ کی طرف قریب کے درجہ میں (زمر)۔ [۳] یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں (یونس)

حضرت عمرؓ کا ارشاد

غرض حاصل سخن یہ ہے کہ جو حضرت عمرؓ نے فرمایا وتتخذونہا کنائس وبیعا اور یہ جو احادیث باب میں وارد ہے اور خصوصاً آنحضرت صلعم کی وصیت عظیمہ میں کہ اتخذوا قبور انبیائہم مساجد، تو مقصود اس سے یہی ہے کہ بزرگوں کی قبروں اور یادگاروں پر عمارات تعمیر کرنا اور انھیں ایک ایسی زیارت گاہ یعنی مشہد بنالینا، جس کا یہ اعتقاد نفع و ضرر قصد کیا جائے اور وہاں کے اعمال و رسوم میں ایسی ایسی باتیں داخل ہو جائیں جو عندالشرع اعمال و طاعات دینیہ کی خصوصیات میں سے ہیں۔ نیز عبادت گاہ حقیقی کی طرح وہ بھی انسانوں کے توجہ و عکوف کا مرکز بن جائیں۔ جب کبھی کسی قبر اور یادگار پر اس غرض سے عمارت تعمیر کی گئی اور اس نے ایسی ہیئت و نوعیت اختیار کر لی تو شارع علیہ السلام کے نزدیک یہ اسے مسجد بنالینا ہے، معبد ٹھہرا لینا ہے اور بیع اور کنیسہ کا اتخاذ ہے۔ ایسی ہی باتوں سے پچھلی امتیں خصوصاً اہل کتاب[1] گمراہ ہوئے۔ ایسی ہی باتوں سے عرب کی سرزمین کو اسلام کی معجزانہ قوت اصلاح نے پاک کیا۔ ایسی ہی باتوں کے دوبارہ لوٹ آنے کا بلاشبہ آنحضرت صلعم کو اندیشہ رہتا تھا۔ ایسی ہی باتیں کرنے پر انھوں نے اپنے بستر وصال پر بار بار لعنت بھیجی تھی اور فرمایا تھا "اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیائہم مساجد[2]"۔ اور ایسی ہی باتوں سے صحابہ کرام اور اہل بیت نبوت ہمیشہ اندیشہ ناک رہتے تھے۔ چنانچہ بروایت معروف ابن سعید میں ہے، جب حضرت عمرؓ نے لوگوں کو ایک مسجد کا قصد کرتے ہوئے دیکھا تو فوراً روکا۔ ساتھ ہی علت نہی بھی واضح کر دی کہ ایسی ہی باتوں سے پچھلی قومیں حاملان ہدایت کتاب تباہ سے ضلالت ہو گئیں۔

---

[1] یعنی یہود و نصاریٰ۔ [2] خدا کا غضب اس قوم پر بھڑکا جس نے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

دعوت الی اللہ والی الرسول

اب وہ تمام لوگ جن کے دلوں کو ظلمت بدع و رسوم نے اس درجہ ٹھیک ٹھیک اندھا کردیا ہو کہ اتباع شریعت کی روشنی بکلی محجوب ہوگئی ہو، خدارا انصاف کریں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے جن معنوں میں قبروں اور یادگاروں کو مسجد و کنیسہ بنالیا تھا ٹھیک ٹھیک اسی طرح ہم مسلمانوں نے بھی بنالیا ہے یا نہیں؟ اور ارشاد نبوی کہ لتتبعن سنن من کان قبلکم حذو القذة بالقذة حتی لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ۔ قالوا یا رسول اللہ الیہود والنصاری؟ قال فمن ؐ (اخرجاہ عن ابی سعید و اللفظ لمسلم) ٹھیک ٹھیک پورا ہوچکا ہے یا نہیں؟ کیا "اسلام" "اسلام" "مدینہ" "مدینہ" "مکہ" "مکہ" چیخنے والوں میں کوئی ایک صادق و مومن روح بھی ایسی نہیں، جو حقیقتاً اسلام اور صاحب مدینہ و مکہ علیہ التحیۃ والسلام کی محبت و عشق پر رسموں اور رواجوں کی الفت اور بدعتوں اور گمراہیوں کا ذوق و شوق قربان کردے سکے اور بحکم اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون دعوت الی اللہ والی الرسول پر لبیک کہے؟

ؐ تم ضرور ان راستوں پر چلو گے جو تم سے پہلے تھے اور موافقت ایسی ہوگی جیسے بالشت پر بالشت اور ہاتھ پر ہاتھ یہاں تک کہ اگر کوئی گروہ گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی گھسو گے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ یہود و نصاریٰ؟ فرمایا اور کون؟
ؐ مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اس سے روگردانی نہ کرو اور تم (رسالت کا) حق سنتے ہو؛ ... [illegible]

دیش بندھو چترنجن داس

حب وطن، قربانی اور اتحاد کا پیکر

یہ مقالہ مولانا نے دیش بندھو داس کی وفات پر لکھا تھا اور اگست ۱۹۲۵ء کے "زمیندار" کی اشاعتوں میں چھپا تھا۔ اصل مقالہ کسی توضیح کا محتاج نہیں۔ اتنا عرض کر دوں کہ ہندو قوم نے اس دور میں جتنے لیڈر پیدا کئے۔ ان میں حق کی نصرت دیانتداری جوانمردی اور بے تعصبی میں بندھو داس جیسا کوئی شخص نہ نکلا۔ سب چھوٹی یا بڑی مصلحتوں میں الجھ گئے لیکن داس کا دامن کبھی کسی مصلحت کے بازار میں نہ الجھا اور اس نے ہمیشہ وہی کہا اور وہی کیا، جو حق تھا۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں جتنی ہردلعزیزی داس کو حاصل ہوئی، وہ غالباً کسی دوسرے ہندو لیڈر کو حاصل نہ ہو سکی۔ افسوس کہ داس لمبی عمر نہ پا سکے۔ اگر وہ دس سال اور زندہ رہتے تو یقیناً حالات کے دھارے کا رخ پلٹ کر رکھ دیتے۔

مولانا نے اپنی کتاب "ہندوستان نے آزادی جیت لی" میں بھی ان کا ذکر فرمایا ہے۔

تاریخ کا انتظار

فرانس کے مشہور مصنف وکٹر ہیوگو نے والٹیر کی صد سالہ یادگار مناتے ہوئے کہا تھا،

" زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم ہو لیکن تاریخ اپنے فیصلہ کے لئے ہمیشہ موت کی منتظر رہتی ہے ۔

اگر یہ سچ ہے تو ہندوستان کے مورخ کا انتظار ختم ہو چکا۔ دیش بندھو چترنجن داس کی زندگی کی عظمت اب تاریخ کے اوراق کے لئے ایک فیصلہ شدہ واقعہ ہے۔ وہ اپنی زندگی میں اپنے لئے جو بات نہیں بتا سکے تھے، اپنی موت سے دنیا پر آشکارا کر گئے۔

ہندوستان نے اپنی جدید تاریخ میں شاید ہی کسی قومی رہنما کی موت پر ایسا عالمگیر ماتم کیا ہو۔ جیسا دیش بندھو کی ناگہانی وفات پر کیا۔ ۱۹ر جون کو جب ان کی نعش کلکتہ کی طولانی سڑکوں پر سے گزری تو اس عظیم الشان شہر نے اپنی پوری آبادی استقبال کے لئے صف بستہ کر دی تھی۔ ماتمی انسانوں کا ایک صحرا تھا جو ایک کنارے سے دوسرے تک پھیلا ہوا تھا۔ غمگین دلوں اور اشکبار آنکھوں کی وہاں گنت تھا اس کے علاوہ ہے جو اس کناری سے کشمیر تک ہر جگہ ہندوستان میں دیکھی جا سکتی تھی۔

پہلی جولائی کی مغموم اور خاموش سپہر کے اضافہ نے اس ماتم کی عظمت اور نمایاں مکمل کر دی۔ اس دن براعظم ہند کے گوشے گوشے میں ماتمی مجلسیں منعقد ہوئیں جن کی روداد سے اس وقت تک اخباروں کے صفحے رنگے ہوئے تھے۔

ہندوستان جو بد قسمتی سے زندگی کے ہر گوشے میں طرح طرح کے تفرقوں سے

بکھرا ہوا ہے، موت کے اس ماتم میں کس طرح متحد ہو گیا تھا۔ مذہب، نسل، پارٹی، کوئی اختلاف بھی تو اس اتحاد میں نقص نہ پیدا کر سکا۔ سب نے بیک وقت محسوس کیا کہ ہم میں سے ایک بڑی ہستی جدا ہو گئی ہے اور اس کی محبت و عزت سے ہمارے دل یکساں طور پر معمور تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے۔ جن کے قدم ہمیشہ ان کے خلاف اٹھا کرتے تھے۔ تاہم جب وہ مر گئے تو ان میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو ان کے احترام سے نہ روک سکا۔ زندگی کے لئے موت کا یہی فیصلہ ہے، جس کا تاریخ انتظار کیا کرتی ہے!

موت کا ماتم اور زندگی کے آثار

ہندوستان کے کروڑوں دلوں کا یہ متحدہ احساس ہندوستان کی موجودہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ایسے ہی واقعات سے احساس قومیت و قوت اور اس کی نشوونما کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں صرف ایک ہر دلعزیز انسان کی موت کا غم ہی نہیں ہے۔ اس میں کروڑوں دلوں کی زندگی کی جھلک بھی دکھائی دے رہی ہے۔ نیز یہ کہ مایوسی میں زندگی کی امید ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی عام . . . — . . — — — — — — —

. . — — — . — — — — — — — — — — —

زندگی میں غفلت اور افسردگی کی کتنی ہی نمایاں ہو، لیکن اس کی تہہ میں ایک گہری حقیقی بیداری جگہ پکڑ چکی ہے اور جیسا کہ تاریخ کا تجربہ شہادت دیتا ہے، بیداری کی یہ اندرونی قوت جب ایک مرتبہ جگہ پکڑ لے تو پھر اسے پامال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنی نشوونما اور تکمیل میں ہمیشہ سے اٹل رہی ہے۔

دیش بندھو کی کامیابی کا راز

لیکن میں اس وقت اتنا دور نہیں جانا چاہتا کہ اس شخصیت سے بہ حیثیت ایک سیاسی

رہنما کے جو کامیابی حاصل کی ہے؟ یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان کی ملکی رہنمائی کی عمر نسبتاً بڑی نہیں تھی۔ ان کی غیر معمولی قابلیتیں پر اگرچہ عرصہ سے نظر پڑ رہی تھیں اور ۱۹۱۹ء میں وہ اچھی طرح پبلک پلیٹ فارم پر نمایاں ہوئے تھے تاہم ان کی رہنمائی کا اصلی زمانہ ترکِ موالات کی تحریک سے شروع ہوتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ پانچ سال کا زمانہ ہے۔ اتنے دنوں کے اندر ہی انہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نمایاں جگہ بنالی اور تمام ملک کے قلوب فتح کر لیے۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ اس غیر معمولی کامیابی میں زیادہ دخل ان کے کن غیر معمولی اوصاف کو تھا؟

جس طرح ایک مکمل تصویر بنانے کے لئے کوئی ایک رنگ ہی کافی نہیں ہوتا، اسی طرح ایک بڑے آدمی کے لئے بھی کوئی ایک قابلیت کافی نہیں ہو سکتی۔ کتنے ہی مختلف رنگ چاہئیں، جن سے کمال اور بڑائی کی یہ شاندار تصویر زیب و زینت پا سکتی ہے۔ لیڈر میں یہ مختلف اوصاف کافی مقدار میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ دماغی اور اخلاقی، دونوں طرح کے وصفوں سے مالدار تھے۔ ان کی ذہانت غیر معمولی تھی۔ ان کی رائے تعجب انگیز حد تک صائب اور بحث و استدلال کی قوت لازوال تھی۔ ان کا دماغ ایک ایسا سانچا تھا جو کوئی ٹیڑھی اور ناہموار چیز قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ کوئی معاملہ کتنا ہی الجھا ہوا ہو، وہ فوراً صاف اور صحیح پہلو پا لیتے تھے۔ پھر کیسی ہی بحث مخالف کتنا ہی الجھائے، ان کا دماغ متاثر نہیں ہوتا تھا۔ ان کی قوتِ تقریر ایک مانی ہوئی بات ہے۔ ان کی تقریر میں نہ تو صرف نظر فریب فصاحت ہوتی تھی، نہ صرف خشک استدلال۔ خطابت (آرٹیری) کے یہ دونوں ضروری عنصر باہم مناسبت کے ساتھ مرکب ہوتے تھے۔

دماغ سے زیادہ دل مالا مال

یونانی مقرروں کا مقولہ ہے۔ ایک مقرر کیلئے سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ

ان دونوں عنصروں کی ترکیب میں بے اعتدالی سے محفوظ رہے۔ ان کے دماغ سے کہیں زیادہ
ان کا دل مالا مال تھا۔ حبِّ وطن کے شعلوں سے ان کے دل کا تنور ہمیشہ گرم رہتا۔ وہ اپنی
زندگی میں بھی ایک جلتی ہوئی چِتا تھے۔ ان کی فیاضی اور ابنائے جنس کی بے پایاں ہمدردی
کا سب نے بطورِ ایک مسلّم واقعہ کے ذکر کیا ہے۔ ان کی فیاضی علمائے اخلاق کے
نزدیک اسراف سمجھی جائے گی۔ سب جانتے ہیں کہ انھوں نے لاکھوں روپے کمائے
لیکن جب پریکٹس چھوڑی تو رہنے کا مکان گرو تھا اور بمشکل چند ہزار روپے خرچ
کے لئے پاس تھے۔ ان کے ایثار اور قربانیوں کا ذکر محتاجِ بیان نہیں۔ انھوں نے
وطن کی خدمت کیلئے واقعی زندگی کی ساری آسائشیں قربان کر دیں۔ وہ کلکتہ کی اعلیٰ آسائش
پسند سوسائٹی کی شاندار زندگی ترک کر کے کھدر کی ایک چادر پر قانع ہو گئے۔

ان کے یہ تمام اوصاف آج موافق و مخالف سب کی زبانوں پہ ہیں، لیکن میں صرف
اتنے پر قانع نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے بھی زیادہ کوئی بات معلوم کرنی چاہتا ہوں۔
یہ اوصاف بلاشبہ غیر معمولی ہیں، لیکن ایسے نہیں جن میں دوسروں کا حصّہ نہ ہو۔
ہندوستان اس وقت رہنماؤں اور رہنمائی کی قابلیت رکھنے والوں کے لحاظ سے مفلس نہیں
ہے۔ اس کے رہنماؤں کی صف کافی طویل ہے۔ ان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بجا
طور پر ان اوصاف کا کم و بیش دعوےٰ کر سکتے ہیں۔ پس ہمیں اسی حد تک رک نہیں جانا
چاہیے۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ دیش بندھو کے رہنمایانہ خصائص کے وہ خاص
اوصاف کیا تھے، جن کی وجہ سے انھیں اپنے معاصرین میں ایسی ممتاز جگہ حاصل ہوئی؟

خاص وصف

میرے خیال میں ان کے دو خاص وصف ایسے تھے جن میں ان کی رہنمایانہ زندگی
کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ میں ان دو وصفوں کو ان کی ساری قابلیتوں میں ابھرا

ہوا دیکھتا ہوں۔ اول یہ کہ ان کے اندر ایک نڈر اور بے باک قوت عمل موجود تھی۔
ثانیاً یہ کہ ان کی حب وطن اور قومیت کا دامن فرقہ وارانہ جذبات سے بالکل پاک صاف تھا
یہ دو باتیں کہنے میں بہت معمولی ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ انہی دو
وصفوں کے اندر ہندوستانی رہنما کے لئے آج سب سے بڑی آزمائش مضمر ہے
میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے وصف کے بغیر تو ہندوستان جیسے ملک میں کچی حب وطن
اور قومیت کی نشوونما ہو ہی نہیں سکتی۔

نڈر اور بے باک قوت عمل سے میرا مقصود یہ ہے کہ ہم میں ایک بے باک
اور خطروں میں کود پڑنے والے سپاہی کی طرح کام کرنے کی روح پیدا ہو جائے۔ جو بات
ہمارے اعتقاد میں سچی اور ضروری ہو، اسے بغیر تامل اور تذبذب کے کہنے اور کر بیٹھنے
کے لئے طیار ہو جائیں۔ بہت زیادہ سوچنا، دیر تک متذبذب اور متردد رہنا، قدم اٹھانا
اور پیچھے ہٹ جانا، طرح طرح کے نقشے بنانا اور چاک کرنا، ممکن ہے یہ سب ایک
مفکر و متخیل کے لئے بہترین اوصاف ہوں لیکن ایک لیڈر کے لئے نہ صرف
غیر ضروری ہیں، بلکہ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ بسا اوقات عیوب میں داخل
ہیں۔ ایک "لیڈر" کی راہ ایک فلاسفر سے مختلف ہوتی ہے۔ لیڈر میں تخیل سے زیادہ
عملیت ہونی چاہیے۔ اسے ہم حکیم سے نہیں بلکہ جرنیل سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔
ایک جرنیل اگر نقشۂ جنگ کی ترتیب میں ایک مفکر کی طرح غرق غور و فکر ہو جائے تو میدان
جنگ کے لئے یقیناً کوئی دوسرا جنگ آزما ڈھونا پڑے گا۔ نپولین نے میرنگو کی لڑائی
کا نقشہ ضرور ترتیب دے لیا تھا لیکن کوہ الپس کی ناقابل عبور چوٹی واسینٹ برنارڈس پر
سے جب فرانسیسی فوج گزر گئی تو یہ اس کے دماغ کا نہیں بلکہ بے باک شجاعت ہمت
کا کام تھا۔

چند مثالیں

چترنجن داس کے اس وصف کا مجھ پر خاص طور پر اثر ہے۔ ایک مرتبہ ایک انیگلو انڈین اخبار میں یہ ریمارک پڑھ کر میں بے اختیار ہنس پڑا کہ وہ آئیڈیلسٹ تھے۔ جن لوگوں نے یہ ریمارک کیا تھا ان کے نزدیک ہندوستانی قومیت کا مقصد ایک "آئیڈیا" سے زیادہ نہیں ہے۔ یعنی وہ کوئی قابل عمل خیال نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہر اس شخص کو "آئیڈیلسٹ" کہہ دیتے ہیں جو ہند کے استقلال کے لئے کوشش کرتا ہو۔ میں ان لوگوں کو یہاں مخاطب نہیں کروں گا، لیکن میں کہوں گا کہ چترنجن داس تو سرتا سر عمل تھے اور یہی ان کی رہنمائی کا سب سے بڑا کامیاب وصف تھا۔ ممکن ہے وہ سوچنے میں سست ہوں لیکن کر گزرنے میں بے دھڑک اور بے باک تھے۔ کوئی معاملہ کیسا ہی بحث طلب اور پیچ در پیچ ہو، وہ فوراً ایک رائے قائم کر لیتے، پھر بے دھڑک چل کھڑے ہوتے۔ تذبذب اور تذبذب کو ان کے کیریکٹر میں جگہ نہیں ملی تھی۔ وہ عملی سیاست میں اس بات کے قائل ہی نہ تھے کہ انتظار کرو اور سوچو۔ جو پتھر راستے میں آ جائے اسے فوراً ہٹا دینا چاہیے اور اس کی وجہ سے سفر نہیں رکنا چاہیے۔ یہی ان کے سفر کا "موٹو" تھا۔ شیکسپیر نے ہیملٹ میں انسانی دماغ کی وہ حالت جو بتلائی ہے جب وہ حیران ہو کر سوچتا ہے کہ کروں یا نہ کروں، یہ کروں یا نہ کروں۔ دیش بندھو اس میں نہ تھا۔

دیش بندھو کا دوسرا وصف بھی ایک طرح اسی وصف کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی قومیت کی راہ میں سب سے زیادہ مشکل روک مسئلہ ہندو مسلم

کی پیچیدگیاں ہیں۔ حالات ایسے گھرے اور شدید ہیں کہ بسا اوقات بڑے سے بڑا
ہندوستانی محب الوطن بھی فرقہ دار جذبات سے اپنے دماغ کی نگہبانی نہیں کرسکتا۔
بڑی ہی ہمت عشق وطن اور جنون آزادی کا ہمراہی طاقت اور جذبہ چاہیے جو ہمیں ایسی
بلندی پر پہنچا دے، جہاں تک ان نیچے درجے کے جذبات کی رسائی نہ ہو۔ میں وثوق
کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ چترنجن داس نے ایسی بلندی حاصل کرلی تھی اور کسی حال
میں اس سے اترنے کے لئے طیار نہ تھے۔ اس بارے میں ان کا دل کامل فراخ اور
فیاض تھا۔ وہ ملک کی آزادی اور نجات کی خاطر تمام چیزیں قربان کردینے کے
لئے طیار تھے۔ جو اس اعلیٰ مقصد سے کمتر ہوں۔ صرف یہی روح ہندوستان کا مسئلہ حل
کرسکتی ہے۔ افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ مقام اس وقت تک بہت
کم ہندوستانیوں کو حاصل ہوسکا ہے

میثاق بنگال

مسئلہ ہندو مسلم کے سلسلہ میں "بنگال پیکٹ" ان کی زندگی کا ایک مشہور
واقعہ ہے۔ اس پر موافق و مخالف دونوں طرح کی رایوں کا نہایت پرجوش مظاہرہ
ہوچکا ہے، لیکن اس وقت تک بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ میثاق
وجود میں کیوں کر آیا؟

جن لوگوں کو مسئلہ ہندو مسلم کی عملی مشکلات کا علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ
معاملہ کس قدر پیچیدہ اور مشکل تھا۔ معاملے کی کوئی جانب اختیار کی جائے، ضروری
ہے کہ مشکلوں اور مزاحمتوں کا ایک طوفان عظیم سامنے آ جائے۔ یہی وجہ ہے
کہ اس وقت بنگال سے باہر فیصلہ نہ ہوسکا۔ پنجاب جہاں اس مسئلہ نے سب سے
زیادہ مصیبت انگیز صورت اختیار کرلی ہے، اس وقت اپنی آب و ہوا میں کوئی خفیف

سی آمادگی بھی ظاہر نہیں کرتا۔ گزشتہ فروری میں دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس نے کامل ایک ہفتہ تک نشست جاری رکھی لیکن بالآخر بلاکسی فیصلہ کے منتشر ہوگئی۔ ایسا مشکل اور ہمت آزما معاملہ جب دیش بندھو کے سامنے اچانک آگیا تو انھوں نے کیا کیا؟ میں پہلی مرتبہ لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ صرف پانچ منٹ کے اندر فیصلہ کر دیا۔

یہاں پانچ منٹ کا وقت میں نے تھوڑے وقت کے معنی میں مجازاً استعمال نہیں کیا بلکہ اس سے سچ مچ گھڑی کے پانچ منٹ مراد ہیں۔ جب مجلس وضع قوانین بنگال کے پچھلے انتخاب سے فارغ ہوئے تو مخالفین نے سوراجیہ کو ناکام کرنے کے لئے ہر طرح کے ہتھیار آزمانے شروع کر دیے۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک مگر آزمودہ ہتھیار فرقہ وارانہ حقوق کا مسئلہ چھیڑنا تھا۔ اس وقت مجلس کے اندر اور باہر دونوں جگہ سوراجیہ جماعت کی کامیابی بہت کچھ اس پر موقوف تھی کہ مسلمان کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ معلوم ہے مسلمان دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک جماعت سوراجیوں کے ساتھ تھی اور دوسری ان سے علیحدہ تھی۔ ہماری کوشش تھی کہ سب مسلمان سوراجیوں کا ساتھ دیں۔ مخالفین کوشش کر رہے تھے کہ مسئلہ ہندو مسلم چھیڑ کر مسلمانوں کو سوراجیوں کی حمایت سے باز رکھا جائے۔ اس اثنا میں وہ ایک عجیب چال چلے۔ انھوں نے مجلس وضع قوانین کے مسلم ارکان سے کہا کہ اگر سوراجیہ جماعت میں شامل ہی ہونا چاہتے ہیں تو کم از کم سوراج ملنے پر مسلمانوں کی نمایندگی اور حقوق کا فیصلہ کر لیں۔ یہ انھوں نے اس لئے کہا کہ ان کا خیال تھا مسلمانوں کی جانب سے جو مطالبات ہوں گے انھیں سوراجیہ جماعت منظور نہ کر سکے گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ مجلس وضع قوانین کے مسلم ارکان مایوس ہو کر الگ ہو جائیں گے اور مسلمانوں کی علیحدگی کے بعد سوراجی نہ تو کونسل کے اندر کچھ کر سکیں گے نہ باہر مضبوط ہو سکیں گے۔

چنانچہ مسلمانوں کے مطالبات کی ایک فہرست ایک بڑے سرکاری افسر کے یہاں طیار

کی گئی۔ اچانک ایک دن صبح مجھے معلوم ہوا کہ آج مطالبات ہمارے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ میں نے اسی وقت مسٹر داس سے بذریعہ ٹیلیفون گفتگو کی اور دریافت کیا کہ اگر یہ مطالبات پیش ہوئے تو ان کا طرز عمل کیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ مخالفین کی اس چال نے ہمارے لئے نہایت نازک صورت حال پیدا کر دی ہے، لیکن انھوں نے بلا کسی تامل کے جواب دیا میں منظور کر لوں گا کوئی وجہ نہیں کہ منظور نہ کیا جائے، کیوں کہ مطالبات بہرحال صحیح ہیں۔ یقیناً انھوں نے یہ فیصلہ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں کیا تھا۔

اس طرح ایک سخت خطرے سے فوراً نجات مل گئی البتہ ایک دوسرا خطرہ پیدا ہو گیا تھا یعنی مخالفت کا وہ طوفان جو اس "پیکٹ" کے خلاف شروع ہوا، لیکن اس کے فرو کرنے کے لئے دیش بندھو کافی طاقتور تھے۔

صدارت بلدیہ کلکتہ

کلکتہ سے باہر شاید بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ جب کلکتہ کارپوریشن کے لئے میئر کے انتخاب کا معاملہ پیش آیا تو مسٹر داس بالکل طیار نہ تھے کہ خود میئر منتخب ہوں۔ پہلی مرتبہ جب اس مسئلہ کے متعلق مجھ میں اور ان میں مشورہ ہوا تو انھوں نے زور دے کر کہا کہ میں چاہتا ہوں پہلا میئر ایک مسلمان ہو۔ یہ اس سپرٹ کا عملی ثبوت ہوگا، جو سوراجیہ جماعت نے مسلمانوں کی نسبت ظاہر کی ہے اور چونکہ بجز تمھارے اور کوئی مسلمان ایسا موجود نہیں ہے، جسے ہم سب بالاتفاق منتخب کر لیں، اس لئے تم اس کے لئے طیار ہو جاؤ۔ اس وقت تک الڈرمین کا انتخاب نہیں ہوا تھا اور انھوں نے پانچ الڈرمین میں ایک نام میرا اسی غرض سے رکھا تھا تاکہ مجھے میئر منتخب کیا جا سکے۔

لیکن میں نے نہایت اصرار کے ساتھ اس سے اختلاف کیا۔ میں نے کہا جہاں تک میری ذات خاص کا تعلق ہے میں نہ قابل، نہ کبھی آئندہ اپنے آپ کو ان مناصب کے لیئے منتخب کراسکتا ہوں۔ میری زندگی کی رفتار ابتدا سے دوسری ہے۔ نہ کسی طرح ان مناصب کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ باقی رہا کسی مسلمان کا میئر ہونا تو بلاشبہ مسلمانوں کو بھی کشادہ دلی کے ساتھ موقع دینا چاہیے، لیکن قابلیت اور استحکام کی بناء پر نہ کہ محض فرقہ وار تقسیم کے خیال سے۔ اس وقت ہر اعتبار سے ضروری ہے کہ آپ میئر منتخب کیئے جائیں۔ خود مسلمان بھی اس سے بہتر انتخاب نہیں کرسکتے۔

میرا اور ان کا باہمی تعلق

میں چند الفاظ اپنے اور ان کے تعلقات کی نسبت کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی برادرانہ محبت کی یاد میرے دل کا ایک ناقابل اندمال زخم ہے۔ ہمارا ایک دوسرے سے تعارف سوسائٹی میں نہیں ہوا۔ نہ ہم میں اور کسی طرح کا اتفاقی تعلق تھا۔ محض قومی خدمت کے سلسلے میں ایک دوسرے سے ملے، لیکن طبیعتوں کی مناسبت نے بہت جلد دلی علاقے کی صورت اختیار کرلی، حتیٰ کہ ہم محسوس کرنے لگے کہ دو حقیقی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور باہمی محبت و اعتماد نے ایک لازوال رشتے میں دونوں کو منسلک کردیا ہے۔

۱۹۱۰ء سے پہلے ان کی شہرت زیادہ تر بحیثیت ایک بیرسٹر اور کامیاب بیرسٹر کے تھی۔ اسی سنہ میں وہ پبلک پلیٹ فارم پر نمایاں ہوئے۔ میں اس وقت نظر بند ہوچکا تھا اور رانچی میں مقیم تھا۔ اخبارات میں ان کی سرگرمیوں کا حال پڑھتا رہا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں جب رہا ہوکر کلکتہ آیا تو سب سے پہلی مرتبہ ان سے شناسائی ایک پارٹی میں جو مجھے دی گئی تھی۔ لیکن یہ شناسائی محض سرسری تھی۔ اس کے بعد ہی

ترک موالات کی تحریک کا ابتدائی زمانہ شروع ہو گیا اور اگست میں کانگریس کا اجلاس خاص کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر وہ ترک موالات کے پروگرام سے متفق نہ ہو سکے اور سال کے آخر تک مخالف رہے۔ اس لیے یہ زمانہ ہم نے باہمی مخالفت میں بسر کیا۔ وہ ناگپور کانگریس کے لئے مخالفانہ طیاریاں کر رہے تھے، میری کوششیں موافقانہ تھیں۔

ناگپور کانگریس میں وہ ترک موالات کے پروگرام سے متفق ہو گئے پھر ہم دونوں از سر نو ملے تاکہ بنگال کے کاموں کی نسبت مشورہ کریں۔ فی الحقیقت اسی زمانہ سے میرے ان کے تعلقات کا اصلی دور شروع ہوتا ہے۔ اس تاریخ سے لے کر ان کے انتقال تک میرا ان کا شب و روز کا ساتھ رہا۔ روز بروز ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ انھیں مجھ پر اعتماد تھا اور میرے دل پر ان کی صداقت نقش تھی۔

دورِ اسیری

باہمی علائق کا یہ زمانہ کچھ عجیب اور گوناگوں حالات میں بسر ہوا۔ اس میں دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء وہ کبھی نہ فراموش ہونے والا وقت بھی شامل ہے، جب سب سے پہلے بنگال میں خلاف ورزی قانون کا قدم اٹھایا گیا اور دو ہفتہ کے اندر حکومت کو مجبور کر دیا گیا کہ سختی و مقابلہ کی جگہ صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائے۔ اس زمانہ میں ہم رات کے دو دو بجے تک اکٹھے بیٹھتے اور دوسرے دن کا پروگرام تجویز کرتے۔ ۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو ہمیں معلوم ہو گیا کہ اب ہماری گرفتاری میں تاخیر نہیں کی جائے گی۔ اسی دن رات کے گیارہ بجے مسٹر کرن شنکر رائے کے مکان پر ہمارا آخری اجتماع ہوا اور دوسرے دن سہ پہر کو بیک وقت گرفتار ہو گئے۔ جیل میں بھی ہماری یکجائی قائم رہی۔ البتہ انھیں چھ ماہ کی سزا دی گئی تھی اور مجھے ایک سال کی۔ اس لئے وہ چھ ماہ پہلے رہا ہو گئے

سوراج پارٹی

۱؍ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کو جب میں رہا ہوا تو کانگرس دو جماعتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ جدید جماعت یعنی سوراجیہ جماعت کے لیڈر دیش بندھو تھے۔ دوسری جماعت مخالفین تغیر (نو چینجرز) کی تھی۔ دونوں جماعتیں مجھے اپنی اپنی طرف کھینچ رہی تھیں، لیکن میں کسی میں بھی شریک نہ ہوا اور اپنا وقت تمام تر اس کوشش میں صرف کیا کہ کسی طرح یہ اختلاف دور ہو جائے یا کم از کم ایسی شکل اختیار کرے کہ کانگرس کی مجموعی طاقت باہمی جنگ میں ضائع نہ ہو۔ چونکہ دونوں طرف جماعتی تعصب کے شدید جذبات کام کر رہے تھے اور متحدہ نقطۂ عمل اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا۔ اس لئے قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں۔ بالآخر کامل ایک ماہ کی جدوجہد کے بعد مجھے اپنی کوشش میں کامیابی ہوئی اور دہلی کے خاص اجلاس میں ایک متفقہ فیصلہ ہو گیا۔

اس کوشش کے دوران میں مسٹر داس کا جو طرز عمل ظاہر و باطن میں رہا، اس نے میرے دل پر ان کی غیر معمولی صفات اور زیادہ گہرائی کے ساتھ نقش کر دیں۔ میں اس کام میں بہ حیثیت ایک مصلح (پیس میکر) کے مجبور تھا کہ حسب ضرورت دونوں طرف رد و کد کروں اور کبھی ایک جماعت کو دباتا چاہوں، کبھی دوسری کو۔ بارہا ہم میں نہایت تیز اور سخت بحثیں بھی ہو گئیں۔ مجھے جس طرح مخالفین تغیر کے جمود و تقلید سے اختلاف تھا۔ اسی طرح حامیان تغیر کی بے قیدی سے بھی میں متفق نہ تھا۔ بایں ہمہ ان تمام حالات کے اندر بھی جو حقیقت برابر مجھ پر کھلتی گئی وہ بہ حیثیت ایک لیڈر اور مدبر کے مسٹر داس کی شخصیت تھی مجھے یقین ہو گیا کہ کام کرنے والی شخصیت یہی ہے، اس لئے کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے لئے کام کا میدان صاف ہو جائے۔ اپنی ناچیز کوششوں کے ذریعے سے جو کچھ کر سکتا

تھا وہ میں نے کیا اور گو اس وقت میری یہ کوشش میرے بعض مخالف تعبیر دوستوں پر گراں گزری، لیکن مجھے امید ہے کہ اب وہ مجھے اس کے لئے ملامت نہ کرتے ہوں گے۔

مسئلہ ہندو مسلم

جہاں تک مسئلہ ہندو مسلم کا تعلق ہے میرا ان کا معاملہ کچھ عجیب طرح کا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ شمالی ہند کی موجودہ آب و ہوا میں بہت کم لوگ اسے ٹھیک طور پر سمجھ سکیں گے۔ ہم جب اس طرح کے معاملات پر گفتگو کرتے تھے تو بلا مبالغہ ہمیں ایک ادنیٰ سا احساس بھی اس تفریق کا نہیں ہوتا تھا۔ بارہا وہ کسی معاملہ میں ہندو نقطۂ خیال کے خلاف رائے دیتے تھے اور میں مسلم نقطۂ خیال کے خلاف رائے دیتا۔ میرے دل میں کبھی یہ گمان نہیں گزرتا تھا کہ انھیں میرے ہم مذہبوں کے خلاف کوئی فرقہ وارانہ احساس ہے۔ اسی طرح وہ کبھی اس کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ میرا جذبہ حب وطن اور قومیت فرقہ وارانہ خود غرضی سے آلودہ ہو سکتی ہے۔ وہ تمام معاملات جو شمالی ہند میں فرقہ وارانہ جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں، ہمارے سامنے آتے تھے اور ہم اس آسانی کے ساتھ فوراً فیصلہ کر لیتے تھے کہ ہم دونوں کے علاوہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ بارہا ہم نے ایک دوسرے سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا ہمارا باہمی تعلق اس بدقسمت مسئلہ کے لئے ملک میں ایک نمونہ نہیں بن سکتا؟ اے کاش ایسا ہو سکے۔

ایک نمونہ

ایک عربی شاعر کہتا ہے "موت ایک بڑے پرکھنے والے جوہری کی طرح ہے۔ وہ ہمیشہ قیمتی جواہر چن لیا کرتی ہے۔" بلاشبہ یہ سچ ہے ہندوستان کے دامن میں اس وقت جو جواہر چمک رہے ہیں، اچانک موت نے ان میں سے

ایک قیمتی نگینہ چھین لیا۔ اب دیش بندھو کا جسم ہم میں نہیں، لیکن اگر ہم ان کے نقش قدم کو دلیل راہ بنائیں تو ان کی روح ہم میں موجود رہ سکتی ہے ان کی زندگی اور موت دونوں میں ایک بہترین نمونہ مضمر ہے ایک کو موجودہ دور حیات میں صرف ایسا ہی نمونہ منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ دیش بندھو کی حب وطن اور قربانی کی زندگی ہندو، مسلم، عیسائی سب کے لئے یکساں تھی اور اس لئے ان کی موت پر بھی سب نے یکساں طور پر آنسو بہائے۔ آؤ اس کی موت کی یاد میں اپنی زندگی کی تعمیر شروع کر دیں حب وطن، قربانی اور کامل اتحاد انہی تین لفظوں میں اس زندگی کا پیام تھا اور یہی تین لفظ اس کی موت کا پیام ہیں۔

کیا آخری منزل آگئی؟

یہ اس دور کا مقالہ ہے، جب ترک موالات یا لاتعاون کی تحریک شباب پر تھی۔ تحریک کے بعض رہنما خصوصاً مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم گرفتار ہو چکے تھے۔ باقی اکابر کی گرفتاری ہونے والی تھی۔ کلکتہ سے ایک ہفتہ وار پرچہ "پیغام" کے نام سے مولاناؒ کے زیر نگرانی جاری ہوا تھا۔ اس میں مولانا کے خاص مضمون شائع ہوتے رہتے تھے۔ یہ مقالہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے "پیغام" میں چھپا تھا اس کا دوسرا حصہ بھی تھا جو بعد میں شائع ہوا، مگر میں نے اسے روک لیا اور صاف بات یہ ہے کہ "پیغام" کے مقالات اور بعض دوسرے نادر مضامین ایک جداگانہ کتاب میں شائع ہونے چاہئیں۔ اس مقالہ کو موجودہ مجموعے میں شامل کرنے کی غرض یہی تھی کہ اندازہ ہو جائے، دعوت عام کے سلسلے میں مولانا کا اسلوب تحریر کیا تھا۔ اس اسلوب تحریر پر مفصل بحث یا تو مولاناؒ کے سوانح حیات میں ہو سکتی ہے یا ان مقالات کے مجموعے میں جن کا تعلق مقام دعوت سے ہے خواہ وہ "البلاغ" میں شائع ہوئے یا "پیغام" میں یا کسی دوسرے رسالے یا جریدے میں۔

یہاں صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ البلاغ کے بہت سے داعیانہ مضامین کے مقابلے میں اس مضمون کا اسلوب بہت سادہ ہے۔ گویا یہ عوامی دعوت کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

ہم نے آخری منزل کا بار بار ذکر کیا ہے۔ وہ ہمارے سفر کا مقصود ہے،

طلب وسعی کا مطلوب ہے، جستجو کا سراغ ہے، آرزوؤں اور تمناؤں کی امیدگاہ کہ
پھر کیا وہ آگئی؟

اگر واقعی آگئی ہے اور واقعی ملک اس کے استقبال کے لئے طیار رہے تو ہماری
کامیابی بھی آگئی اور فتح و مراد نے بھی اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا:

یاراں! صلائے عام است گرمی کنید کارے

ہم نے اول دن سے اعلان کیا ہے کہ موجودہ جدوجہد کے لئے آخری منزل قید خانہ ہے۔ اس جنگ کی فتح و شکست کا فیصلہ میدانوں میں نہ ہوگا، قید خانوں کی کوٹھڑیوں میں ہوگا۔ ہم نے اسی لئے "سول ڈس اوبیڈنیس" یعنی سول قوانین کی نافرمانی کو بھی پروگرام میں داخل کیا، کیونکہ قید خانے کی سب سے زیادہ سہل اور سیدھی راہ وہی ہے۔ پھر کیا واقعی قید و بند کا پیام آگیا ہے؟

دو سفر

سفر دو ہیں ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا۔ اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کردیں۔ جب انھوں نے اپنے آپ کو قربان کردیا تو ان کا سفر منزل مقصود تک پہنچ گیا اور وہ کامیاب ہوگئے اب ان کے لئے سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں۔ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے اور اس کے جس مسافر نے اس مقصود کو پالیا اس نے اپنا کام پورا کردیا۔ یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں، ایک ہی ہیں

رہرواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے، جو بیج بوتا ہے۔ خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروان مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا سفر پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا ومن آیاتہ یریکم البرق خوفا وطمعا وینزل من السماء ماء فیحیی بہ الارض بعد موتہا ان فی ذالک لآیات لقوم یعقلون۔ (اور دیکھو اس کی قدرت وحکمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ بجلی کی چمک اور کڑک نمودار کرتا ہے اور اس سے تم پر خوف اور امید دونوں کی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور پانی کی تاثیر سے زمین مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ بلاشبہ اس صورت حال میں ان انسانوں کے لئے جو دانش و بینش رکھتے ہیں، حکمت الٰہی کی بڑی ہی نشانیاں ہیں (روم)

ہندوستان کا سفر اور آخری منزل

ہندوستان نے بھی سفر شروع کیا۔ ایک سفر اس کے مقاصد کا ہے، ایک سفر جاںدادگان مقاصد کے فرائض کا ہے۔ پہلے کی کامیابی دوسرے کی کامیابی پر موقوف ہے۔ طریق عمل یہ قرار پایا کہ جو سفر اس وقت تک چند مسافروں میں محدود تھا۔ اسے تمام ملک اپنا شیوہ بنالے اور سیکڑوں ہزاروں جانباز ایسے پیدا ہو جائیں جو کامل خود فروشی و قربانی کے ساتھ کوچ کر دیں۔ ایمان کی لازوال روح ان کے دلوں میں ہو، صبر کی ان تھک اور اٹل طاقت ان کے قدموں میں عشق ان کی رہبری کرے، شوق ان کا رفیق و دمساز ہو۔ عزم قدم قدم پر ہمت بڑھائے اور ہمت آگے بڑھ کر راہ صاف کرے۔ یسعیٰ نورہم بین ایدیم وبایمانہم (الحدید)

عشق تو راہ می برد، شوق تو زاد می دہد

پھر جب آخری منزل آ جائے، قید و بند کی پکار ہو اور طوق و زنجیر استقبال کریں،

جرس فریاد می نا رد کہ بر بندید محملہا

تو ایسا ہو کہ ہزاروں قدم اس کے لئے مضطربانہ دوڑیں۔ ہزاروں ہاتھ اس کی طرف والہانہ بڑھیں۔ ہزاروں دل اس کی طلب و شوق سے معمور ہو جائیں۔ وہ عیش و نشاط کی پکار ہو۔ کامرانی و مراد کی بخشش ہو۔ فتح و اقبال کا نشان ہو۔ ہر انسان اس کے لئے آرزوئیں کرے۔ ہر دل اس کے لئے رشک کھائے اور ہر روح میں اس کے لیے بے قراری سما جائے۔ قید کرنے والے قید کرتے کرتے تھک جائیں، لیکن قید ہونے والے قید ہونے سے نہ اکتائیں۔ ہتکڑی پہنانے کے لئے ہاتھ نہ ملیں، لیکن ہتکڑی پہننے والے ہاتھوں کی کمی نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے جیل خانوں میں ایک نئی بستی زندانیانِ حق کی آباد ہو جائے اور اس کی کوٹھریوں اور محنت خانوں میں چوروں اور ڈاکوؤں کے رکھنے کے لئے جگہ باقی نہ رہے۔

آخری منزل کے بعد

جب ملک قربانی اور خود فروشی کا یہ مرحلہ طے کرے گا تو پھر اس کی طاقت ناقابلِ تسخیر ہو جائے گی۔ کوئی ہتھیار اس پر اثر نہ کرے گا۔ کوئی فوج اس کی فتح نہ کر سکے گی۔ آسمان کی تمام بجلیاں بھی اگر اتر آئیں، اور سمندر کی تمام موجیں بھی اکٹھی ہو جائیں، جب بھی قربانی کی قہرمان طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کو قید کے نام سے دھمکایا جاتا ہے اور موت کے خوف سے وہ مسخر ہو جاتا ہے۔ لیکن جو انسان خود قید کا آرزومند اور موت سے بے خوف ہو اس کا مقابلہ کس ہتھیار سے کیا جائے؟

بالآخر یا تو گورنمنٹ کو اپنے گھمنڈ کے تخت سے اترنا پڑے گا اور حق و انصاف

کے سامنے جھکنا پڑے گا یا ہمیشہ کے لئے اس تخت ہی کو چھوڑ دینا پڑے گا۔

تین شرطیں | لیکن اس منزل کا نقشہ لفظوں میں جس قدر جلد کھنچ گیا، عمل میں اس قدر آسان نہیں ہے۔ ایک ایسی حرکت کے لئے جو کروڑوں غفلت پسند انسانوں میں پھیلی ہوئی ہو، بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے اور جب تک خود ہمارے دلوں کا کام پورا نہ ہو جائے میدان کا کام شروع نہیں ہو سکتا۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ملک میں کامل قربانی، استقامت اور نظم پیدا ہو جائے۔
قربانی سے مقصود یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں ایسے خودفروش طیار ہو جائیں جو کامل ایمان و یقین کے ساتھ سچائی کے ہاتھ بک چکے ہوں۔

استقامت سے مقصود یہ ہے کہ ان کا جذبہ عارضی و ہنگامی نہ ہو، بلکہ اس میں پوری طرح قرار اور جماؤ پیدا ہو جائے۔ ان کی آگ ہوا سے بھڑکائی جائے لیکن پھر دم بدم ہوا کی محتاج نہ رہے، خود جلنے میں بھی مشتعل رہنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ وہ سمندر کی طرح لبریز ہو جائیں، پہاڑ کی طرح خود اپنے سہارے کھڑے ہو جائیں۔
قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ کامیابی اور بے خوفی کے فرشتے صرف ان ہی پر اترتے ہیں جو خدا پرستی کے ساتھ استقامت کا جماؤ بھی اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔ الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا۔ (تحقیق جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جمے رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ تم نہ تو ڈرو اور نہ غم کھاؤ) الخ

نظم کی اہمیت

نظم سب سے بڑی شرط ہے۔ وہ آخری بھی ہے اور پہلی بھی ہے، کائنات کا پورا کارخانہ اسی طاقت پر چل رہا ہے مقصود اس سے یہ ہے کہ عمل کا تمام حلقہ ایک

رشتے میں منسلک ہو جائے۔ کوئی کڑی اس سے باہر جانے نہ پائے۔ جو راہ قرار دی جائے سب اسی پر گامزن رہیں اور سارا حلقہ اس انتظام اور یکسانیت کے ساتھ کام کرے کرے۔ گویا سب کے دل اور جذبات ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔

مطلوب و مقصود

سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ نظم لوگوں میں پورا پورا ضبط اور اپنے اوپر قابو رکھنے کا ملکہ پیدا کر دے۔ اشتعال کو ہوا نہ سکے اور غیظ و غضب ان پر قابو نہ پا سکے۔ وہ وقت پر بھڑک نہ اٹھیں۔ بے جا جوش میں آکر اپنا کام فراموش نہ کر دیں۔ قید و بند کے یہی معنی ہیں کہ ہم قید ہوں، قربانی و خود فروشی کے یہی معنی ہیں کہ ہم ہر طرح کی تکلیف و نقصان برداشت کریں۔ پس اگر ایسا ہونے لگا تو اچنبھا کیوں؟ غصہ کیوں آئے؟ انتقام کا ارادہ کیوں کریں؟ کیوں بچنا چاہیں؟ اور کیوں دوسروں کو بچائیں؟ پیاسا پانی پینے سے نہیں بھاگتا اور مفلس نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ دولت ملنے پر لڑنے لگا ہو۔ اگر ہم واقعی راہ حق میں قید ہو جانے کے لیے تیار ہیں اور سچ مچ ہمارے دل کا یقین یہی ہے کہ اس منزل سے ہو کر کامیابی تک پہنچیں گے تو پھر ہمارے مطلوب و مقصود کے ملنے کی راہ کھل گئی اور ہمیں خوش ہونا چاہیے، ایک دوسرے کو مبارکباد دینا چاہیے، ایسا کیوں ہو کہ ہم بھاگیں اور بے قابو ہو کر لڑنے پر اتر آئیں؟

کامیابی کی کلید

یہ شرط سب سے بڑی اور نازک شرط ہے اور اس عمل کی ساری کامیابی اسی پر موقوف ہے۔ اگر یہ طاقت ملک میں پیدا نہ ہوئی تو پھر اس کی قربانی اور استقامت کچھ بھی سودمند نہ ہوگی۔ فوج کتنی ہی بہادر اور جانباز ہو لیکن اگر اس میں علم اور اطاعت نہیں ہے تو اس کی شجاعت و جانبازی یک قلم رائیگاں جائے گی۔ کم از کم ملک میں بہ کثرت ایسے کارکن مہیا ہو جانے چاہئیں جو وقت پر لوگوں کے جذبات کو مسخر کر سکیں۔ اشتعال اور بے راہ روی پر پوری طرح قابو پالیں۔

ہم اپنی کمزوریوں کا اقرار کرتے رہے ہیں۔ ہم معترف ہیں کہ ملک نے ابھی یہ شرطیں پوری نہیں کیں۔ بلاشبہ قربانی کا ولولہ زندہ ہو گیا ہے لیکن استقامت کا امتحان باقی ہے۔ اور نظم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ ہم مطمئن نہ تھے اس لئے آخری منزل کا اعلان نہ کر سکے اور بار بار ملک سے یہی درخواست کی کہ پہلے درمیانی منزلوں کو کامیابی کے ساتھ طے کر لے۔

گورنمنٹ کی جلدی اور دعوت

لیکن گورنمنٹ نے ایک پیام بھیجا ہے اور ہم نے قبول کر لیا ہے، کیوں کہ جب حریف کا پیام آجائے تو حریف قبول ہی کیا جا سکتا ہے۔

ہم متامل تھے اور چاہتے تھے کہ مزید انتظار کریں لیکن گورنمنٹ انتظار نہ کر سکی۔ اس نے بے صبری کے ساتھ ارادہ کیا کہ تحریک خلافت کے سربرآوردہ کارکنوں کو گرفتار کر کے سزائیں دینا شروع کر دے۔ اس طرح یا تو اچانک برہمی و بدامنی پیدا ہو جائے گی یا لوگوں پر خوف اور ناامیدی چھا جائے گی۔ پہلی صورت میں گورنمنٹ کو موقع مل جائے گا کہ ایک مرتبہ اپنی

طاقت کی پوری خونریزی اور ہولناکی دکھلا کر تحریک کا ایک ایک رگ و ریشہ فنا کر دے۔ دوسری صورت میں تحریک خود بخود شکست کھا جائے گی اور اس طرح چالیس کروڑ مسلمانانِ عالم اور تیئیس کروڑ ہندوستانیوں کی زندگی کا مسئلہ ایک بڑی مدت تک کے لئے ہندوستان میں مدفون ہو جائے گا

انسان کا گھمنڈ دور کی فتح مندیاں دیکھ لیتا ہے، لیکن قریب کی بدبختی اسے نظر نہیں آتی۔ گورنمنٹ نے یہ دونوں پہلو دیکھ لیے، مگر تیسری راہ اُسے دکھائی نہ دی۔ وہ ملک کو پامال کر سکتی تھی۔ یا شکست دے سکتی تھی لیکن یہ بھول گئی کہ خود بھی شکست کھا سکتی ہے اور خود بھی پامال ہو سکتی ہے۔